تعلق مع اللہ

مرتب

الفقیر اِلی اللہ تعالیٰ

بلقیس اظہر

جماعت عائشہؓ

ایڈیشن - I

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعلق مع اللہ

مرتب:
الفقیر اِلی اللہ تعالیٰ
بلقیس اظہر
جماعت عائشہؓ

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر

1	ہدایت اور یقین کا تعلق	4
2	قدردان	8
3	محبت اور مذہب	13
4	اسلام اور کفر	18
5	دعا	20
6	تعلق مع اللہ	24
7	اطاعت الٰہی	29
8	رضائے الٰہی	34
9	معرفت الٰہی	42
10	محبت الٰہی	47
11	تقرب الٰہی	48
12	ذکر الٰہی (حصہ اوّل)	51
13	فضائل ذکر الٰہی (حصہ دوم)	57
14	قرب الٰہی	64
15	توفیق الٰہی	68
16	یادِ الٰہی	72
17	دیدار الٰہی	77
18	مظہر ذات الٰہی (کائنات)	82
19	فضلِ الٰہی	86
20	خشیت الٰہی	89
21	عطائے الٰہی	99
22	ارشادات الٰہی	101
23	اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے	108

24 تم آج خیر پر ہو 111
25 تواضع 114
26 اخلاص 119
27 قبلہ 127

ہدایت اور یقین کا باہمی تعلق

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک سورہ بقرہ، آیت نمبر 1 تا 5 میں فرمایا:

الٓمّٓ. ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ج فِیْهِ ج هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ.

ترجمہ: "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ (یہ) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے"۔

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ

ترجمہ: "(وہ) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) دیتے ہیں"۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ.

ترجمہ: "اور وہ لوگ جو آپ (خاتم النبیین ﷺ) پر نازل کیا گیا اور جو آپ (خاتم النبیین ﷺ) سے پہلے نازل کیا گیا تھا (سب) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں"۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ ق وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

ترجمہ: "وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی حقیقی کامیابی پانے والے ہیں"۔

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت یافتہ افراد کے تین طبقے بیان فرمائے ہیں:

(1) هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے)

(2) عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں)

(3) الْمُفْلِحُوْنَ (فلاح پانے والے ہیں)

یہ تینوں طبقات وہ ہے جنہیں غیب پر یقین رکھنے اور بن دیکھے حقیقتوں پر ایمان لانے کی بدولت اپنے رب کی طرف سے ہدایت عطا ہوتی ہے۔ ایمان تب نصیب ہوتا ہے جب بندہ یقین کامل کے ساتھ زبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہم لوگ یقین کے معنی و مفہوم، یقین کی ضرورت و اہمیت اور اس کی برکات سے بالکل محروم ہو گئے ہیں۔ درحقیقت زبان سے اقرار کرنا دل کی تصدیق کے اظہار کے لیے ہوتا ہے اور دل تصدیق تب کرتا ہے جب بندہ یقین کی اعلیٰ بلندیوں پر فائز ہو۔ گویا زندگی کی ابتداء ایمان بالغیب سے ہوتی ہے اور یقین ہی ایمان بالغیب کو پختہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں ہدایت کے راستے کھلتے ہیں۔ وہ لوگ جو تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے ہدایت حاصل کرتے ہیں قرآن نے انہیں "هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" کی صورت میں بیان کیا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنہیں تقویٰ اختیار کرنے، غیب پر ایمان لانے، نماز ادا کرنے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور آخرت پر ایمان لانے کی بدولت اللہ تعالیٰ ایسی ہدایت عطا فرماتا ہے کہ وہ خود تو ہدایت پر قائم رہتے ہی ہیں مگر اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی بنتے ہیں۔ وہ دوسروں میں ہدایت تقسیم کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہادی کس طرح بنتے ہیں؟ اس کا انحصار ایمان بالغیب کے اقرار، شک کے خاتمہ اور یقین پر ہے۔

ایمان بالغیب کے ذریعے:

انسان کی زندگی میں نور کا ایک بیج داخل ہو جاتا ہے۔ ایمان کا یہ بیج خود بخود اُگ کر درخت نہیں بن جاتا بلکہ بیج بونے کے بعد اُس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ اُس کو زندہ رکھنے کے لیے پانی دینا پڑتا ہے، پھر پروان چڑھانے اور طاقت مہیا کرنے کے لئے کھاد ڈالنی پڑتی ہے۔

لیکن افسوس! ہماری زندگی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم نے کلمہ پڑھ لیا یا کسی کے ساتھ وابستگی کا اقرار کر لیا تو سمجھ بیٹھے کہ یہی کافی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے مالی نے بیج بویا، مٹی ڈالی اور چلا گیا اور یہ سمجھتا رہا کہ اب یہ خود اُگ کر درخت بن جائے گا حالانکہ محض ایسا کرنا کافی نہیں ہے۔

جب بیج بو دیا جائے تو پہلے مرحلہ پر اس کی قوتِ تخلیق کے لیے پانی اور کھاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب اُگ کر پودا بن جائے تو پھر اُس کی مزید نشوونما کے لئے دھوپ اور ہوا

کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان ساری چیزوں کا اہتمام نہ کیا جائے تو وہ پودا جل جاتا ہے۔ جس طرح بیج سے اُگنے والے پودے کو پانچ چیزیں پانی، کھاد، گوڈی، روشنی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسان کے دل میں بوئے ہوئے ایمان کے بیج سے پیدا ہونے والے اسلام کے پودے کو بھی پانچ چیزیں درکار ہیں جنہیں ارکان اسلام کہتے ہیں۔ ان ہی کی مدد سے انسان ایمان اعتقاد، ایقان اور یقین کے درجہ تک پہنچتا ہے۔

کسی پودے کے نمو کے لیے درکار ان پانچ ارکان کے ہوتے ہوئے بھی اگر مالی نہ ہو تو کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے ایک دیکھ بھال کرنے والا بھی چاہئے جو بیج کو یہ پانچ چیزیں بروقت فراہم کرے تب یہ بویا ہوا بیج پودا بنتا ہے اور پھر درخت بن کر پھل کی صورت میں نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت نے ایمان کے بیج کی آبیاری کے لیے یہ سارے سامان فراہم کئے ہیں۔ فرمایا" اگر چاہتے ہو کہ تمہاری زندگی کو قرآن سے ہدایت ملے تو سب سے پہلے اپنے دل میں اُگے ہوئے شک کے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکو۔ جب شک سے دل پاک صاف ہو جائے گا، تب یقین کا پودا اُگے گا اور ہدایت نصیب ہوگی"۔ گویا ہدایت کی ابتداء یقین ہے اور اس کی انتہاء مرتبہ ایقان ہے۔ فرمایا:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ.

یعنی اگر تم نے اس لاریب کتاب سے ہدایت لینی ہے تو دل کی کتاب کو بھی لاریب کرنا پڑے گا۔

جس طرح فصل میں اگنے والی زہریلی جڑی بوٹیاں زمین کی طاقت جذب کر کے فصل کو کمزور کرتی ہیں، اسی طرح دل میں جنم لینے والا شک، یقین کو کمزور کر دیتا ہے۔ ایمان کی بحث میں اس کو ''ریب'' کہتے ہیں۔ (یعنی شک) یہ شک طرح طرح کے ہوتے ہیں۔

اللہ کے وجود میں شک ہے، یقین نہیں ہے۔۔۔ تقدیر میں شک ہے، مانتے ہیں اقرار کرتے ہیں مگر یقین نہیں ہے۔۔۔ اللہ دے گا مگر اس کے دینے میں شک ہے یعنی ''یقیناً دے گا'' یہ کیفیت نہیں ہے۔۔۔ قلب کو یقین میسر نہیں۔۔۔ موت ہوگی، قبر میں حساب و کتاب ہوگا، آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے زیادہ اہم ہے، ہر کوئی ان عقائد کا اظہار کرتا ہے مگر یقین نہیں ہے۔۔۔ اقرار زبان کی حد تک ہے۔ دل کی حد تک نہیں پہنچا۔ علم زبان تک کر کے تو بات نہیں بنتی علم دل پر وار ہو تو کام چلتا ہے- اگر ان تمام کا کامل یقین ہوتا تو ہر کوئی بدل گیا ہوتا اور دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتا۔ سودے یہیں بدل جاتے اور دنیا کی لالچ میں مبتلا کرنے والے سودے بیچ کر نئے سودے کر لئے ہوتے مگر ہماری اکثریت کی زندگی دھوکہ بازی پر چل رہی ہے اس لیے کہ ہمارے یہ سودے اللہ سے پکے اور سچے نہیں ہو رہے۔ ہم نے زندگی میں دل کی زمین میں موجود شک کی بوٹیوں کو جڑوں سے نکال کر پھینکا ہی نہیں ہے۔

اللہ رب العزت فرما رہا ہے" قرآن بھی تمہاری طرف نازل کر دیا ہے، ہدایت بھی اس میں رکھ دی ہے مگر ہدایت کے نصیب ہونے کی شرطِ اولین یہ ہے کہ ریب و شک کی بوٹیاں دل کی زمین سے اکھاڑ پھینکو اور دل کی زمین کو پاک اور صاف کر دو"۔ اس لیے کہ تمہارے دل کی طاقت تو تمہارے شک کو پالنے میں لگی رہتی ہے اور اس میں سو قسم کے شک پلتے رہتے ہیں۔ اب حالت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ شک کے پودے پل پل کر اتنے بڑے ہو چکے ہیں کہ اب تو وہ قابو میں بھی نہیں ہیں۔

ہم انہیں قابو میں کرنے کے لئے اوپر سے کاٹ دیتے ہیں جبکہ دل میں شک کی جڑیں دور دور تک پھیل چکی ہوتی ہیں۔ اوپر سے کاٹنے کے بعد جب کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ دل میں موجود تمام شکوک کی جڑی بوٹیاں کاٹ دی ہیں، مگر یہ خبر ہی نہیں کہ دور دور تک اس کی جڑیں پھیل چکی ہیں اور چند دنوں کے بعد وہ پھر سر نکال لیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں ضرورت تزکیہ کی ہے، تزکیہ کا مطلب شک کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اگر ہدایت لینی ہے تو دل کے اندر شک کی کوئی جڑ ہی نہ رہے، تمام شک نکال پھینکو گے تب ہدایت ملے گی اور ایمان نصیب ہوگا"۔

ایمان ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کی ہدایت کا اللہ ارادہ فرما لیتا ہے اور ہدایت ان کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے آپ کو شک کی دلدل سے نکالتے ہیں۔ دل کی زمین میں یقین کی اونچی اونچی بوٹیاں موجود ہیں جبکہ یقین، ایمان اور عقائد صحیحہ چھوٹے چھوٹے نوخیز پودوں کی طرح موجود ہیں، شک کے بڑے بڑے پودے ان پر سایہ کئے کھڑے ہیں، جن کی وجہ سے ان ننھے ننھے پودوں کا نمو پانے کا راستہ ہی صاف نہیں ہو رہا۔

جب دل کو پاک صاف کر دیا جائے تو تب ہدایت نصیب ہوتی ہے اور یہ ہدایت ایمان تک پہنچاتی ہے۔ دل کی زمین سے شک کو اکھاڑ پھینکنے کے بعد اب اس ایمان کے بیج کو پانی، کھاد، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمان کے پودے کو یہ تمام چیزیں کیونکر مہیا ہوں گی؟ فرمایا:

وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ.

ایمان کے پودے کے لیے پانی بصورتِ نماز۔۔۔عبادات بصورتِ کھاد۔۔۔اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا بصورتِ ''ہوا'' ہے۔گویا عملِ صلوٰۃ پانی بن گیا،عبادت کھاد بن گئی اور دل کی زمین شک سے پاک ہوگئی تو ان تمام عوامل کے ذریعے ایمان کے پودے کو زندگی اور توانائی مل گئی۔پھر فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ.

ان تمام تعلیمات الٰہیہ کے ذریعے ایمان کے پودے کو روشنی میسر آ گئی اور اس طرح اس کے نمو کا سارا سامان مہیا ہو گیا۔اِن تمام مراحل کے بعد جا کر آخرت کا یقین پیدا ہوا۔شک کے رفع کرنے سے سفر شروع ہوا تھا۔شک نکالا تو یقین کی ابتداء ہوئی، پھر سارے تقاضے پورے کئے تو مرتبہ ایقان تک جا پہنچے اور ایقان کو جب کمال نصیب ہوا تو اس شخص کے لئے اللہ نے خوشخبری سنائی:

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ق وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

ایک ہدایت وہ ہے جس کا ذکر اللہ نے شروع میں ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے ذریعے کر دیا تھا اور دوسری ہدایت کا ذکر عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ کے الفاظ کے ذریعے کیا۔ان دو ہدایتوں میں فرق ہے۔

ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک اعلان فرما دیا تھا کہ:

"جو شخص جتنا پرہیزگار ہوگا، اتنی ہدایت اس کا نصیب ہے، اب اس کی محنت و ریاضت اور تگ و دو پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کتنی ہدایت سمیٹتا ہے"۔بعد ازاں انسان جب نماز، انفاق اور تعلیمات پر عمل کے ذریعے ایمان کے کمال تک جا پہنچا اور اُسے یقین حاصل ہو گیا تو فرمایا:

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ.

یعنی کمالِ یقین پا لینے والے اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر فائز ہو گئے۔پہلے صرف ایک اعلان تھا کہ ہدایت کا خزانہ انہیں ملے گا جو متقی و پرہیزگار ہیں مگر مل جانے کی ضمانت نہ تھی۔بعد ازاں:

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ

کے ذریعے سارا راستہ بیان کر دیا، شرطیں بیان کر دیں، تقاضے بیان کر دیئے کہ جب ساری وادی عبور کر لو گے اور یقین کو مرتبہ ایقان تک پہنچا دو گے تو اب ان کو اللہ نے خوشخبری سنائی کہ اب چونکہ ان لوگوں کا آخرت پر یقین جم گیا ہے اور انہوں نے دنیا کے بدلے آخرت خرید لی ہے لہذا:

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ق

یقین کے کمال کو پا لینے والے اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر فائز ہو گئے۔

"وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْن" کا معنی یہ ہے "جس نے آخرت کے لئے دنیا بیچی"۔

افسوس ہمارا آخرت پر یقین نہیں ہے۔ہم نے دنیا کو آخرت کے بدلے بیچنے کی بجائے آخرت پر دنیا کو ترجیح دے رکھی ہے۔جب کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو سب سے پہلے ہمارے پیشِ نظر دنیا اور دنیا کا مفاد ہوتا ہے، برادری، رشتہ داری اور نام و نمود ہوتی ہے، دنیا کے حرص ہیں، دنیا کے لالچ ہیں، یہ سب دنیا کے پیمانے ہیں، ہمارا تو سارا جینا مرنا دنیا ہے۔

اگر ہم میں تبدیلی نہیں آئی تو ہم اللہ کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ کر رہے ہیں۔آخرت پر اگر یقین ہو گیا ہوتا تو دنیا بیچ چکے ہوتے۔اگر دنیا، آخرت پر وار دی ہوتی تو ہماری زندگی کے طور طریقے ہی بدل گئے ہوتے۔ہماری دنیا کی زندگی بدل گئی ہوتی۔ہماری ترجیحات بدل گئی ہوتیں۔پسند اور ناپسند کے سارے پیمانے بدل گئے ہوتے۔

لیکن جب کوئی معاملہ آتا ہے تو سب سے پہلے ہم دنیا کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔جو دنیا کے پیمانوں پر سوچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے "وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" کی وادی میں قدم نہیں رکھا۔

ہم دنیا کو سامنے رکھتے ہیں، نفس کو سامنے رکھتے ہیں، ہمارے تو اپنے گورکھ دھندے ہی ختم نہیں ہوتے۔دنیا کا گورکھ دھندہ اور جنجال ہی سب سے بڑا دجال ہے۔

ایک دجال تو وہ ہے جو قربِ قیامت آئے گا اور گمراہ کرے گا، لیکن ہم نے تو کئی دجال اپنے اندر پال رکھے ہیں۔یہ نفس، حرصِ دنیا، حسد و بغض، عناد و غرور، ہر ایک کے ساتھ دنگا فساد، غیبتیں اور چغلیاں یہ سارا کچھ ایک دجال ہی کی خصوصیات ہیں- دجال کا کام بھی گمراہ کرنا ہوگا۔اور ان تمام چیزوں کا کام بھی گمراہ کر کے اللہ کی راہ سے ہٹانا ہے

۔قرب قیامت پر جو دجال آئے گا اس سے بچنے کے لئے تو دعائیں کی جاتی ہیں۔اس سے ڈرا جاتا ہے کہ وہ ہمیں گمراہ نہ کر دے۔سوچنے کا مقام یہ ہے کہ آج ہم کون سی راہ پر ہیں؟ کہ دجال ہمیں گمراہ کر دے گا۔

یاد رکھیں !جب تک دنیا کے جنجال کو لات نہیں مارتے اور اس گورکھ دھندے سے نہیں نکلتے، اس وقت تک ہم " وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ" کی وادی میں داخل نہیں ہو سکتے۔اور مرتبہ ایقان کو نہیں پا سکتے۔

ایقان کیا ہے:-

جب آخرت اور آخرت میں جو کچھ ہونا ہے، اس کے ہونے کا یقین اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کمال کو ایقان کہتے ہیں۔جب یہ حالتِ ایقان نصیب ہو جائے تو اس کی ادنیٰ علامت یہ ہے کہ بندہ آخرت کے بدلے دنیا کا سودا کر لیتا ہے-آخرت کا سودا کر لینے کا مطلب ہے زندگی بدل گئی، زندگی کا رنگ بدل گیا، ڈھنگ بدل گیا، سوچ بدل گئی، ترجیح بدل گئی، سارا کچھ بدل گیا۔

اللہ رب العزت نے فرمایا" جب آخرت کے یقین کو کمال تک پہنچا لو گے تب تم ہدایت پر فائز کر دیئے جاؤ گے "۔

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوزخ سے بچ گیا، راہ راست پر گامزن ہو گیا اور اس کو ہدایت مل گئی۔جس کو ہدایت مل گئی اس کا اپنا کام ہو گیا جن کے لیے اس ہدایت کا ذکر کیا وہ صرف اپنے لیے ہیں۔

پس "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" جن کو ہدایت مل گئی ان کا اپنا آپ سنور گیا، وہ گناہ اور خطا کی وادی سے نکل آئے، اوسط درجے میں آ گئے، کنارے لگ گئے، بخشش والے ہو گئے، وہ جیت گئے، ان پر عنایتیں ہو گئیں مگر یہ جتوانے کے قابل نہیں بنے۔

جبکہ بعض لوگ وہ ہیں جن کے لئے فرمایا:

"اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ" کہ وہ لوگ جنہوں نے ساری منزلیں طے کر لیں اور "وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ" تک جا پہنچے، دنیا کو لات ماردی، اب وہ دنیا کے بندے نہ رہے بلکہ آخرت کے بندے ہو گئے۔جب انہوں نے ایمان کی شرائط اور تقاضے پورے کیے اور دنیا کے بدلے آخرت خرید لی تو اب وہ نہ صرف خود ہدایت یافتہ ہو گئے بلکہ اوروں کے ہادی بن گئے۔اب جو ان کی کشتی میں بیٹھ جائے گا، اس کو بھی کنارے لگا دیں گے۔

پہلے "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" تھے اب "عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ" کے مصداق ہو گئے، یعنی ہدایت پر فائز اور متمکن کر دیئے گئے۔جب کوئی کسی شے کے اوپر متمکن ہوتا ہے تو اس کے تصرف میں خصوصی رحمت دے دی جاتی ہے۔پہلے آدمی ہدایت لیتا تھا، اب جس کو چاہتا ہے ہدایت بانٹتا ہے۔پہلے آدمی ہدایت کا خریدار تھا، ہدایت اپنے لیے خریدتا تھا مگر اب ہدایت دیتا پھرتا ہے۔

مختصر یہ کہ پہلا درجہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" متقین کے لئے ہدایت ہے جتنی ہدایت چاہیں لے لیں، اپنے جوگے ہو گئے۔دوسرا درجہ "عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ" کے مصداق دنیا کو ہدایت دینے والے ہو گئے۔یعنی لینے کے بعد آگے دینے والے بن گئے۔جو ان کے دامن سے لپٹ جائے گا اس کو بھی ہدایت کی خیرات مل جائے گی۔

ایک تیسرا درجہ بھی اللہ رب العزت نے بیان فرمایا کہو "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" یہ نہیں فرمایا "اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ." بلکہ "وَاُولٰٓئِكَ " دہرا کر کہا "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر متمکن ہونے کے بعد فلاح پا گئے اور جو فلاح پا گئے وہ اہل اللہ ہو گئے۔

جو ہدایت کے اوپر متمکن تھے وہ اہلِ اَقرب تھے اور جو اصلاً اولیاء اللہ ہو گئے وہ "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" ہو گئے۔ان کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے فلاح کے چشمے دے دیئے۔(نعمتوں سے نواز دیا) فلاح کے چشمے جن کے ہاتھ میں دیئے وہ لقاء والے ہو گئے، وہ اللہ سے ملاقات کرنے والے ہو گئے، وہ آخرت کے بھی طلبگار نہ رہے بلکہ صرف اور صرف مولیٰ کے دیدار کے متمنی بن گئے۔یہ اللہ کو پا گئے۔دوسرے درجے والوں کو نعمت ملی تھی تیسرے درجے والوں کو اللہ مل گیا۔وہ نعمت والے تھے اور یہ نعیم والے ہو گئے۔جن کو اللہ مل جاتا ہے تو سارا کچھ ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔فلاح کے چشمے ان کے ہاتھ میں آ گئے۔

بس یہی راستہ ہے اور یہی سودا ہے۔اس سودے کے سوداگر بنیں، اس راستے پر چلیں، ان منزلوں کو عبور کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ سب کا حال بہتر کر دے گا۔

اے اللہ تعالیٰ! ہم سب کو خیر کی راہ پر گامزن کر دے اور ہمارے لیے اپنی نعمتیں عام فرما دے۔اور ہمیں نیکی کی توفیق عطا فرما۔(آمین)

****

قدردان (اللہ جل شانہ)

حدیث قدسی:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے پروردگار سے یوں روایت کی "اللہ تعالی نے (قلم سے دست قدرت کا حکم) تمام نیکیاں اور برائیاں لکھوادی ہیں"۔ پھران کی وضاحت یوں فرمائی:

"جس نے کسی نیکی کا دل سے ارادہ کیا مگر اس پر عمل نہ کرسکا تو اس کے (نامہ اعمال میں) کامل نیکی کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ اگر دل میں نیکی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل پیرا بھی ہوا تو اس کے (نامہ اعمال میں) دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہے بلکہ سات سو سے بھی کہیں زیادہ نیکیوں کا ثواب لکھ دیتا ہے۔ اور اگر کسی نے ایک برائی کا ارادہ دل میں کرلیا مگر اس پر عمل نہیں کیا (نہ کرسکا) اللہ تعالی اس کے لئے بھی ایک نیکی کا ثواب عطا کرتا ہے (لیکن) اگر برائی کا ارادہ کرکے اس پر عمل بھی کر گزرے جو اس کے نامہ اعمال میں محض ایک برائی کا (بدلہ) لکھا جاتا ہے"۔ (بخاری شریف، مسلم شریف)

زندگی میں جتنے بھی کام کرتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں اچھے یا برے یعنی نیکی یا برائی۔

نیکی ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اس پر ہم اللہ تعالی سے اجر کی امید رکھتے ہیں۔ **برائی** سے ہم اس لئے بچنا چاہتے ہیں کہ اس پر ہمیں اللہ تعالی کے عذاب کا اندیشہ ہوتا ہے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا۔ ''الدین یسر'' ترجمہ: "دین آسان ہے"۔ (صحیح بخاری)

اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے نیکی اور بدی کے بدلے کا قانون بھی بڑا آسان بلکہ سراسر رحمت کا قانون رکھا ہے۔ اور اس قانون کی وضاحت مندرجہ بالا حدیث قدسی میں کردی گئی ہے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے قول، فعل اور عمل کو سنت کہتے ہیں۔ یعنی آپ خاتم النبیین ﷺ نے جو کچھ کہا، جو کچھ کیا اور جو کچھ کرکے دکھایا، وہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی سنت ہے اور اسی کو حدیث کہتے ہیں۔ احادیث عام طور پر قرآن مجید کی تشریح ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر کرتی ہیں۔ قرآن مجید کی باتوں کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ اور قرآن پاک کے احکامات کی وضاحت کرتی ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں حکم ہوتا ہے کہ نماز قائم کرو۔ حدیث بتاتی ہے کہ کس طرح کرو۔ اپنے مال کی زکوۃ ادا کرو۔ کتنی زکوۃ ادا کریں؟ کتنے مال پر، زکوۃ کا مطلب کیا ہے؟ اس مال کو نکالنے یا راہ خدا میں دینے کی کتنی فضیلت ہے؟ یہ تمام تر تفصیل ہمیں حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے کا حکم موجود ہے۔ لیکن باقی تمام تر نفلی روزے، ہر ماہ کے تین (یعنی چاند کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کا روزہ)۔ کہ یہ روزے رکھنے والا ہمیشہ روزے سے رہنے والوں میں شمار ہوگا۔ اسی طرح رمضان کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے والا ہمیشہ روزے رکھنے والوں میں شمار کیا جائے گا۔ ایسا کیوں؟ یہ تمام باتیں ہمیں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے معلوم ہوئیں۔

یہ اس لئے کہ مندرجہ بالا حدیث کے مطابق ایک نیکی کا بدلہ یا اجر 10 نیکیوں کے برابر۔ ہر ایک کے لئے تو رمضان کے 30 روزے 10 ماہ کے روزوں کے برابر، اس میں شوال کے 6 روزے ملالیں تو 2 ماہ کے روزے ہوگئے۔ یہ تو عام لوگوں کے لیئے ہے۔ لیکن اس حدیث میں ایک اور بھی بات بہت ہی اہم بتائی گئی ہے کہ ''اللہ اضافہ کردیتا ہے جس کے لئے وہ چاہے"۔

یعنی ایک کے بدلے 10 ہر ایک لئے، باقی کسی کے لئے ایک کے بدلے 100 کی، کسی کے لئے 500، کسی کے لئے 700، کسی کے لئے 7000۔ وہ مالک کل ہے مختیار ہے اس کی مرضی ہے جس کو جتنا کچھ دینا چاہے۔

سورہ بقرہ میں انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں یہ بات کہی گئی ہے: (سورہ بقرہ، آیت نمبر 261)

ترجمہ: "جو لوگ اپنا مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالی جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے اور اللہ تعالی کشادگی والا اور علم والا ہے"۔

ایک کے بدلے 10 کے اجر والی حدیث کا ذکر بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورہ انعام میں اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: (سورہ الانعام، آیت نمبر 160)

ترجمہ: "نیکی کا اجر 10 گناہ دیا جائے گا"۔

تو جو بات حدیث میں کی گئی ہے وہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ قرآن مجید کی تشریح ہے۔

یہ بات قرآن پاک میں بہت واضح ہے کہ کسی کا کوئی نیک عمل کبھی ضائع نہیں ہوسکتا۔

کسی محنت کرنے والے کی محنت، کسی مزدوری کرنے والے کی مزدوری، کسی نیک عمل کرنے والے کا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہوسکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ خود اس کو ضائع کردے۔ خود ہی کنواں کھودے اور اس میں گر جائے۔ یعنی خود ہی ایسے برے اعمال کرے۔ جو کی ہوئی نیکیوں پر غالب آجائیں۔ وہ اس کا اپنا کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی ضائع نہیں ہوتی۔ برائی کو چاہے وہ لکھے اور چاہے تو معاف کردے۔ اس مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون جو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے حدیث قدسی کے طور پر بیان کیا ہے۔ بڑا ہی اہم قانون ہے اس کا ہر ہر جز و اپنی جگہ قابل غور ہے۔ پہلی بات جو اس حدیث میں واضح طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اصل چیز کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہے۔

انسان کو جو طاقت دی گئی ہے اختیار دیا گیا ہے۔ وہی اس کا امتحان ہے اور وہ اپنی شخصیت، اپنی ہستی، اپنے دماغ، اپنے قلب جو لفظ بھی ہم استعمال کریں۔ قرآن مجید نے انسان کے اندر جو شخصیت کام کرنے کے فیصلے کرتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے لئے قلب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے ذریعے وہ اس اختیار کو استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید ہی کہتا ہے کہ اصل زندگی قلب کی زندگی ہے۔ اصل موت قلب کی موت ہے۔ اصل بینائی قلب کی بینائی ہے۔ اور اصل اندھاپن قلب کا اندھاپن ہے۔

قرآن مجید میں سورہ الحج، آیت نمبر 46 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: "آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ قلب جو سینے میں ہے وہ اندھا ہوجاتا ہے"۔

اور جب قلب اندھا ہوجائے تو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایک امیر شخص نے کسی بزرگ سے کہا "حضرت اس کی کیا وجہ ہے کہ جب میں کوئی نیک کام کرتا ہوں تو خوشی نہیں ہوتی اور جب کوئی برا کام کرتا ہوں تو افسوس نہیں ہوتا"؟ بزرگ نے اس امیر آدمی کی طرف دیکھا اور فرمایا "اب آپ کا دل پورے طور پر مر گیا ہے"۔

تو قیامت کے دن وہی آدمی نجات پانے والا ہوگا جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر حاضر ہوگا۔

قلب سلیم وہ خالص دل ہے جو کفر (انکار) نفاق (منافقت) اور ہر قسم کی گندگی سے پاک ہوتا ہے۔ (سورہ شعراء آیت نمبر 89)

ترجمہ: "مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر"۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قوت ارادے کی ہے ہم لوگ ارادے کے لئے ایک دوسرا لفظ نیت استعمال کرتے ہیں۔ شریعت میں نیت کی بڑی اہمیت ہے۔ عمل کی ظاہری شکل وصورت نہیں ہے۔ اس عمل کے لئے جو نیت کی ہے وہ اصل بات ہے۔ آدمی نے اللہ تعالیٰ کے آگے جواب وہ ہونا ہے۔ جب بھی بندہ نیکی کا پختہ ارادہ کرتا ہے پھر وہ نیک کام کرے یا نہ کرے۔ ایک نیکی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائے گی۔ کیونکہ نیکی کا ارادہ ہی اصل بات ہے۔ کیونکہ جب نیکی کا ارادہ کرے گا تو نیک عمل بھی کرے گا اور نیک عمل کرے گا تو آگے بھی بڑھے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ارادہ کرنا خود ایک نیکی ہے۔ اس لئے نیکی کی نیت اور ارادہ آدمی کو کرتے رہنا چاہیے۔ سوچتے رہنا چاہئے۔ کہ میں یہ نیک کام کرلوں۔

میں کسی بندے کا کوئی کام کردوں، میں فلاں کا قصور معاف کردوں، فلاں سے معافی مانگ لوں یا آئندہ میں نرمی سے بات کیا کروں گا، کسی پر غصہ نہیں کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ زندگی کے جو بھی دائرے ہیں معاش کمانے کے ہیں، اولاد کے ہیں، رشتہ داروں، پڑوسیوں، ماں باپ کے، اپنے نفس کے، اللہ کی عبادت کے، اللہ کی اطاعت کے، نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ ان سب کے اندر ایک ہی اصول ہے کہ آدمی نیکی کرنے کا ارادہ کرتا رہے۔

انسان کے پاس، اللہ کا دیا ہوا یہ اختیار بھی ہے جس سے وہ نیکی کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور پھر نیکی کرتا ہے۔ لیکن اس اختیار اور ارادہ پر مواخذہ بھی ہوگا۔ جو چیزیں اختیار سے باہر ہیں۔ ہمارے ارادے کے اندر نہیں آسکتیں۔ وہ دین کے لحاظ سے کتنی ہی اچھی ہوں آدمی ان کے لئے جواب دہ نہیں ہوتا مثلاً نماز کا معاملہ لیتے ہیں۔

وضو کرنا، نیت کرنا، نماز کے لئے قیام کرنا، نماز کے ارکان ادا کرنا یہ سب ہمارے اختیار میں ہیں۔ اگر ہم یہ سب کچھ نہیں کرتے تو ہم اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ لیکن نماز میں دل کی توجہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ دل کے اندر تو وسوسے آئیں گے۔ دل کے اندر طرح طرح کے خیالات بھی آئیں گے۔ اس دنیا کی پریشانیاں، معاش کا فکر، بچوں کی پڑھائی کی فکر، بچوں کی فیس دینے کا مسئلہ، غرض بے شمار قسم کی پریشانیوں میں انسان گھرا رہتا ہے۔ جو امیر لوگ ہیں۔ وہ دولت کمانے اور دولت کمانے کے ذرائع ڈھونڈنے میں پریشان رہتے ہیں۔ بحر حال گھریلو پریشانیاں ہر ایک کو لاحق رہتی ہیں۔ اس لئے دل کے اندر وسوسے اور طرح طرح کے خیالات

تو آئیں گے ہی۔ان کے لئے کوئی جواب دہی نہیں ہے۔

دل کو ان خیالات سے پاک رکھنے کی کوشش نہ کی تو جوابدہی ہوسکتی ہے؟ کہ تم نے کتنی کوشش کی کہ دل میں خیالات اور وسوسے نہ آئیں؟

اس کوشش کے لئے علماء کرام نے کہا ہے کہ

(1) نماز کو ترجمہ سے یاد کیا جائے اور دھیان مطلب پر رکھا جائے۔

(2) دوسرے یہ کہ نماز کو الگ تھلگ جا کر ادا کیا جائے۔لیکن یہ تو عورتوں کے لئے ہے۔آدمیوں کے لئے یہ ہے کہ مسجد میں اعتکاف کی نیت کرتے ہوئے داخل ہوں، دھیان نماز کے مطلب پر رکھیں۔اور اپنے آپ کو حالت اعتکاف میں سمجھتے ہوئے پوری کوشش کریں کہ دھیان اللہ کی طرف رہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے "اگر انسان (مومن بندہ) نماز میں چار جگہ حاضر ہوتا ہے۔تو نماز 100 فیصد قبول ہوجاتی ہے:

1) تکبیر اولیٰ کے وقت 2) اھدنا صراط المستقیم پر 3) رکوع میں جب کہہ سبحان ربی العظیم 4) سجدہ میں جب کہے سبحان ربی اعلیٰ"

اگر صرف تکبیر اولیٰ کے وقت بھی حاضر ہوا تو نماز قبول ہوجائے گی۔لیکن اگر ان چاروں جگہ پر سے کسی جگہ بھی حاضر نہ ہوا۔تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اللہ کے حضور حاضر ہونے کی کوشش ہی نہیں کی اس پر مواخذہ ہوگا۔باقی نماز میں اپنے آپ وسوسے آنے پر مواخذہ نہیں ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز میں خشوع کی کمی ہے تو اضافہ مطلوب ہے لیکن لازمی نہیں۔یاد رکھیں! کہ حاضری ضروری ہے حضوری اللہ تعالیٰ خود ہی عطا فرمادیں گے۔لیکن جیسا خشوع ہے، جتنا خلوص ہے اس کے لحاظ سے اجر دے دیا جائے گا۔اجر نیت پر ہے اب دیکھیے اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ ایک کے بدلے میں 10 تو ہر ایک کو دے گا ہی لیکن یہ خلوص پر ہے کہ کسی کو ایک کے بدلے میں 100، کسی کو پانچ سو، کسی کو سات سو گناہ اور اس سے کئی گناہ زیادہ بڑھ سکتا ہے۔

صحابہ کرامؓ نے ایک مرتبہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے فرمایا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں پاتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی انہیں زبان پر لانا بھی بہت گراں سمجھتا ہے"۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''کیا تم اس چیز کو (اپنے دلوں میں) پاتے ہو؟'' انہوں نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''یہی ایمان صریح ہے"۔(صحیح مسلم)

اس لئے کہ چور تو اسی جگہ جاتا ہے جہاں مال ہوتا ہے۔جہاں پر جتنا زیادہ مال ہوتا ہے وہاں پر ڈاکو اتنا زیادہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔وسوسہ ہی تو شیطان کا ایک اختیار ہے اس کے علاوہ کوئی اختیار اس کو نہیں دیا گیا وہ ہم سے ہاتھ پکڑ کر کام نہیں کروا سکتا نہ ہمارے پاؤں پکڑ کر غلط راستے پر ڈال سکتا ہے۔ایک ہی اختیار اس کے پاس ہے کہ دل میں یہ خیال ڈال دے یا وسوسہ ڈال دے۔

کسی شخص نے ایک بزرگ سے سوال کیا" ہمارے دل میں بے شمار خیالات آتے ہیں۔کیا علاج کریں"؟ فرمایا" دل تو ایک سڑک ہے اس پر اچھی گاڑیاں بھی چلتی ہیں بری گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔اس سڑک پر گھوڑے بھی چلیں گے۔گدھے بھی چلیں گے۔یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اچھے خیالات دل میں لائیں۔نیکی کی بات سوچیں۔نیکی کے عزائم دل میں لائیں۔اللہ کا ذکر کرنے لگیں۔بری باتوں کو ذہن سے نکالنے کی طرف توجہ بھی نہ دیں"۔

اللہ تعالیٰ نے امت محمدی خاتم النبیین ﷺ کی عمریں کم ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ مہینے، کچھ دن اور کچھ راتیں ایسی عطا فرمائی ہیں۔جن میں عبادت کرنے کا ثواب عام مہینوں، عام دنوں اور عام راتوں میں ہزار گناہ زیادہ ہے۔

مہینوں میں محرم، رجب، ذیقعدہ، اور ذالحجہ

دنوں میں یوم عاشورہ، یوم عرفہ اور یوم جمعہ

راتوں میں شب معراج، شب برات اور شب قدر

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمرؓ کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا'' گزشتہ امتوں کے مقابلے میں تمہاری عمر اتنی ہے جتنا عرصہ نماز عصر سے لے کر مغرب تک کا ہوتا ہے"۔

1۔اہل توریت کو توریت دی گئی انہوں نے اس پر عمل کیا یہاں تک کے عین دوپہر کے وقت وہ عاجز آ گئے۔ان کو ایک قیراط (دینار کا 6/4 کی چیز کا چوبیسواں حصہ) دیا گیا۔

2) پھر اہل انجیل کو انجیل دی گئی انہوں نے نماز ظہر سے نماز عصر تک اس پر عمل کیا پھر وہ بھی عاجز آ گئے۔ انہیں بھی ایک قیراط عطا کیا گیا۔

3) پھر ہمیں قرآن پاک عطا ہوا۔ اور غروب آفتاب تک اس پر عمل کیا گیا اور ہمیں دو قیراط ملے۔

روز محشر جب یہ اجر ہمیں دیا جائے گا تو اہل کتاب کہیں گے "اے ہمارے رب ہمیں تو نے ایک ایک قراط دیا اور ان کو (مسلمانوں) کو تو نے دو، دو قیراط دیئے۔ حالانکہ ہم نے ان سے بڑھ کر کام کیا ہے"۔ راوی کا قول ہے "اللہ تعالیٰ فرمائے گا" کیا میں نے تمہاری اجرت میں تم پر کوئی کمی کی ہے؟ (یعنی جتنی اجرت مقرر کی گئی تھی کیا تم کو میں نے پوری نہیں دی؟) وہ کہیں گے "نہیں اجرت تو آپ نے ہمیں پوری دی ہے"۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا "پھر یہ تو میرا فضل ہے جسے چاہیے عنایت کرتا ہوں"۔

مندرجہ بالا حدیث میں یہودیوں کی مدت عمل طلوع آفتاب کے بعد سے ظہر تک ہے۔ نصاری کی مدت عمل وہ وقفہ ہے جو نماز ظہر سے عصر تک پھیلا ہوا ہے۔ اور مسلمانوں کی مدت عمل وہ وقفہ ہے جو نماز عصر سے مغرب تک ہے۔

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی امت کو فضیلت بخشی ہے۔ لیکن سابقہ امتوں کی اجرت میں نہ تو کمی کی گئی ہے اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا ظلم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے پاک ہے۔

حدیث میں قیراط کا ذکر کیا گیا ہے اس قیراط سے مراد جنت میں ان کا حصہ اور ملکیت ہے۔ جنت میں سب سے کم درجہ والے اور کم ملکیت والے شخص کو بھی اس کی خواہش سے 10 گناہ زیادہ اجر دیا جائے گا۔ اس صورت میں قیراط سے مراد مکمل اور کامل بہت بڑی اجرت ہے۔ اہل کتاب کو غصہ اس لئے نہیں آیا کہ ان کی حق تلفی ہوئی یا انکو اجرت کم ملی۔ بلکہ ان کے غصہ کا سبب وہ حسد ہے جو ان کے دل میں امت محمد خاتم النبیین ﷺ کی فضیلت کی وجہ سے موجود ہے۔

امت محمد خاتم النبیین ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا ہے وہ جسے چاہے جو چاہے عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے اس کرم و فضل کے لئے کسی کو جواب دہ نہیں ہے وہ مالک کل ہے اس کی مرضی قرآن پاک سورہ آل عمران، آیت نمبر 26 میں فرمان الہیٰ ہے:

ترجمہ: ''اے اللہ بادشاہت کے مالک تو جسے چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے۔ بادشاہت چھین لیتا ہے۔ اور تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

تو بھلائی اور قدرت صرف اور صرف اللہ کی ذات کے پاس ہے۔ حضرت داؤدؑ سے ایک مرتبہ فرمان الہیٰ ہوا۔

ترجمہ: (مفہوم) '' اے داؤد تو بھی چاہتا ہے اور میں بھی چاہتا ہوں۔ اگر تو میرے چاہنے میں راضی ہو جائے گا تو میں تجھے تیرے چاہنے میں نواز دوں گا۔ اور اگر تو میرے چاہنے میں راضی نہیں ہوگا تو میں تجھے تیری چاہت میں پھنسا دوں گا۔ پھر بھی وہی ہوگا وہ جو میں چاہتا ہوں''۔

بنی اسرائیل اللہ کی لاڈلی قوم تھی لیکن نافرمانی نے ختم کر دیا۔

قرآن پاک سورہ زمر، آیت نمبر 9 میں فرمان الہیٰ ہے:

ترجمہ: '' کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں"۔

قرآن پاک سورہ ہود، آیت نمبر 24 میں فرمان الہیٰ ہے

ترجمہ: '' کیا ایک اندھا اور بہرا، دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا برابر ہو سکتے ہیں"؟

کیا وہ لوگ جنہوں نے ایک گونگے بچھڑے کے متعلق کہا کہ (سورہ طہ، آیت نمبر 88)

ترجمہ: '' وہ تمہارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی"۔

ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا: (سورہ آل عمران آیت نمبر 2)

ترجمہ: "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔

کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا: (سورہ توبہ آیت نمبر 30)

ترجمہ: ''یہودی بولے عزیز اللہ کے بیٹے ہیں اور نصرانی بولے عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں''۔

ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا: (سورہ اخلاص، آیت نمبر 1 اور 2)

ترجمہ:''اللہ ایک ہے اور وہ بے نیاز ہے''-

کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا: (سورہ آل عمران، آیت نمبر 181)

ترجمہ:''اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں-''

ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا: (سورہ محمد، آیت نمبر 38)

ترجمہ:''اللہ غنی ہے اور تم محتاج ہو''-

کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا: (سورہ المائدہ، آیت نمبر 112)

'' کیا تمہارا رب ہمارے لیئے دسترخوان نازل کر سکتا ہے''-

ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا: (سورہ آل عمران ، آیت نمبر 26)

'' (اے رب) تیرے ہاتھ میں ہی ہر بھلائی ہے'' -

کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا: (سورہ بقرہ آیت نمبر 93)

"ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی'' -

ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا: (سور بقرہ آیت نمبر 285)

''ہم نے سنا اور اطاعت کی'' -

کیا جنہوں نے کہا: (سورہ المائدہ آیت نمبر 24)

''جاؤ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"-

ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا:

''اے نبی آپ ہمیں جس جگہ جا کر لڑنے کا حکم دیں گے ہم اس جگہ جا کر لڑیں گے''

کیا مندرجہ بالا لوگ کسی طرح بھی آپس میں برابر ہو سکتے ہیں؟ جب عمل میں برابر نہیں، نافرمانی، سرکشی، بے ادبی اور ہٹ دھرمی میں پیش پیش تو اجر میں کیسے برابری کی توقع کر سکتے ہیں؟؟؟

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ نے اپنی سند میں بہز ابن حکیم سے روایت کیا ہے جس کو بہز اپنے والد حکیم سے اور ان کے والد ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''تم لوگ ستر امتوں کے خاتمے کے بعد وجود میں آئے ہو۔تم لوگ اللہ کے نزدیک ان امتوں میں سے سب سے زیادہ بہتر اور باعزت ہو''-(مندرجہ بالا حدیث کو امام ترمذی نے (3001) میں اور ابن ماجہ نے (4288) میں بیان کیا ہے اس کی سند حسن ہے-)

تو ہم اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ امت ہیں۔دیکھئے کتنی محبت سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی قدردانی کی یقین دہانی کروا رہا ہے-(سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 19)

وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا

ترجمہ:''اور جو آخرت چاہے اور اس کی سی کوشش کرے اور ہو ایمان والا تو انہیں کی کوشش ٹھکانے لگی''-

جس نے آخرت کا ارادہ اور ہمت کر لی کہ مجھے آخرت کمانا ہے اور یہ عزم کر لیا اور پختہ ارادہ ہو گیا۔اور پھر اس کے لئے کوشش کی (جیسی کوشش کر سکتا ہے) جتنی اس کی استطاعت ہے۔جیسا کہ اس کا حق ہے اور ایمان کے ساتھ کی۔اور اللہ کے بھروسہ پر کی۔اس کی خاطر کی تو اس کی ان ساری کوششوں کی پوری قدر کی جائے گی-یعنی ان کو قبول کیا جائے گا اور ان کی بدلہ دیا جائے گا۔

تو ایک کے بدلے 10 تو ہر ایک کے لئے ہے اس کے بعد وہ جس کو دینا چاہے اور جتنا دینا چاہے وہ بہترین قدردان ہے-

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی سمجھ عطا فرمائے۔قرآنی احکامات کو سمجھ کر عمل کرنے والا بنائے اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی اتباع اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے-(آمین ثم آمین)

محبت اور مذہب

مذہب کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی محبت کے سانچے میں ڈھل جانا۔اور اس کی پہچان مذہب ہے۔

محبت کیا ہے؟

کسی کو چاہنا اس سے پیار کرنا محبت ہے۔

محبت فطری و بنیادی چیز ہے اور نفرت انقطاع محبت کا نام ہے۔جو کسی حادثہ یا تصادم کا نتیجہ ہوتی ہے۔محبت تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور تمام جذبات عالیہ کی خالق ہے اس محبت سے آواز میں لوچ، بات میں شرینی، چہرے پہ حسن، رفتار میں انکساری اور کردار میں وسعت آتی ہے۔

دوسری طرف غصہ نفرت انتقام اور حسد دنیائے دل کو ویران اور چہرے کو بے نور اور خوفناک بنا دیتے ہیں- حاسد اور سازشی کی رفتار تک ناہموار ہو جاتی ہے اور وہ ہر طرف نفرت پھیلاتا ہے۔اہل محبت نفرت کا جواب محبت سے دیتے ہیں۔وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ اگر ہم اہل دنیا سے محبت کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرے گا۔اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ''دنیا سے بہترین سلوک کرو جواباً تم سے بہترین سلوک کیا جائے گا۔'' جن لوگوں کے دل میں اللہ بس جاتا ہے۔ان کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ ہر شخص سے محبت کرتے ہیں خطا کاروں کی خطائیں بخشتے ہیں اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دیتے ہیں۔تمام انبیاء اولیاء کا وطیرہ یہی تھا۔

قرآن پاک کی تعلیم بھی یہی ہے کہ دشمن سے اتنا عمدہ سلوک کرو کہ وہ تمھارا مخلص دوست بن جائے۔لیکن یہ مقام بلند انہی لوگوں کو مل سکتا ہے۔جو زمانے کی تلخیاں برداشت کر سکتے ہوں (صبر) اور کردار عظیم کے مالک ہوتے ہیں۔

ایک مغربی مفکر کا ارشاد ہے:

ترجمہ:۔''نفرت نفرت سے ختم نہیں ہوسکتی۔اس پر محبت سے غلبہ حاصل کرو۔دنیا کو محبت کرنا سکھاؤ تو جنت اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ یہیں نمودار ہو جائے گی۔''

ترک محبت موت ہے۔جو شخص سب سے محبت کرتا ہے۔اس کی زندگی بھرپور اور کامل ہوتی ہے۔اور اس کی زیبائی اور توانائی میں سدا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔محبت کا سب سے بڑا وصف انکساری ہے۔دوسروں سے نفرت کرنے والے کرخت مغرور تند مزاج اور بدمزاج ہوتے ہیں۔اہل محبت بول میں میٹھے، چال میں دھیمے اور مزاج کے نرم ہوتے ہیں قرآن اور تورات دونوں میں ان اوصاف کو آسمانی دانش کہا گیا ہے۔اور اس بات میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ غرور حماقت ہے اور تواضع بہت بڑی دانش مندی کسی دانا نے کیا خوب کہا ہے:

ترجمہ:۔''اگر دانش (عقل) حاصل کرنا چاہتے ہو تو انکساری پیدا کرو اور اگر انکسار حاصل کر چکے ہو تو زیادہ خاکسار بنو۔''

محبت رحم، مروت، خوش خلقی۔گداز اور نیاز سے جسم میں وہ طاقت پیدا ہوتی ہے۔جو بیماری کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔جو ذات شکم مادر میں بچے کی صورت گری کرتی ہے۔وہی خیال اور احساس کی صورت گری بھی ہے۔پیدا فرمانے والے نے چہروں کو تاثیر دینے والا بنایا اور قلوب کو تاثیر قبول کرنے والا، آنکھوں کو بینائی دینے والا، نظاروں کو رعنائی عطا فرماتا ہے وہ خود ہی دل پیدا کرتا ہے۔اور خود ہی دلبر پیدا فرماتا ہے۔اور خود ہی دلبری کا خالق ہے۔

زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہے۔آپ خاتم النبیین ﷺ کی محبت ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔کوئی ہستی آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق کا نمونہ پیش نہ کر سکی۔اگر سکھانے والے سے محبت نہ ہو تو سیکھنے والا کبھی کچھ نہ سیکھ پائے گا۔اگر پیغمبر سے محبت نہ ہو تو پھر اللہ یا اسلام سے محبت نہیں ہوسکتی۔عشق نور حقیقت ہے یہ نور جہاں سے بھی عیاں ہوگا عاشق کے لئے محبوب ہوگا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ **مجاز کیا ہے؟ اور حقیقت کیا ہے؟ دراصل مجاز بذات خود ایک حقیقت ہے۔اور یہ حقیقت اُس وقت تک مجاز کہلاتی ہے جب تک رقیب ناگوار ہو۔جس محبت میں رقیب قریب اور ہم سفر ہو وہ عشق حقیقی ہے۔اپنا عشق اپنا محبوب اپنے تک ہی محدود رکھا جائے تو مجاز اور اگر اپنی محبت میں کائنات کو شریک کر لینے کی خواہش ہو تو حقیقت رانجھے کا عشق مجاز ہوسکتا ہے لیکن وارث شاہ کا عشق حقیقی ہے۔عشق نبی خاتم النبیین ﷺ عشق حقیقی ہے عشق آل نبی خاتم**

النبیین ﷺ حقیقی۔عشق اصحابہ نبی خاتم النبیین ﷺ عشق حقیقی۔اقبال کا عشق بھی عشق حقیقی ہی کہلائے گا۔پیر کامل کا عشق عشق نبی خاتم النبیین ﷺ ہی کہلائے گا۔

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کو نور خدا کہا جاتا ہے اور ولی چونکہ مظہر عشق نبی ہوتا ہے تو اسے بھی مظہر عشق نبی یا مظہر نور خدا کہا جا سکتا ہے۔اس لئے پیر کامل کو عشق میں صورت ظل الہ کہنا جائز ہے۔دراصل محبت ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنی اصل شکل، باطنی شکل، حقیقی شکل دیکھتا ہے۔محبت ہی قدرت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔لیکن ''جس تن لاگے سو تن جانے''

محبت ہی کے ذریعے انسان پر زندگی کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔کائنات کا حسن اس آئینے میں نظر آتا ہے۔محبت تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں اس لئے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے محبت کے جو نمونے چھوڑے وہ رہتی دنیا تک نمونہ ہیں۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں بتایا کہ نیکی یہ ہے کہ برائی کا جواب نیکی سے دیا جائے۔اچھائی کا جواب اچھائی سے دیا جائے تو یہ تو بدلہ ہوا نیکی کیا ہوئی؟

دین اسلام کا سب سے بڑا رکن کلمہ پڑھنے کے بعد نماز ہے۔نماز اسلام کا سب سے زیادہ مطلوب اور بنیادی فریضہ ہے۔اسی لئے اس کی طرف بہت توجہ دلائی جاتی ہے۔چنانچہ ہر وہ شخص جو دین کی طرف راغب ہوتا ہے وہ نماز کی پابندی سے اپنی دین داری کا آغاز کرتا ہے۔اس طرح معاشرے میں نمازیوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔

مسجدیں آباد ہو رہی ہیں۔اذان و اقامت کی آوازوں سے فضا معمور ہے لیکن آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ جو جذبات اور جو محبت نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھیوں میں دین سے محبت کے بارے میں تھی وہ اب نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ہم نماز کی روح کو نہیں سمجھ رہے۔ہمارے ہاں آج کے دور میں نماز کی جتنی اہمیت اور پابندی ہے وہ اس کے ظاہر کے لحاظ سے ہے۔ہمارے ہاں نمازی وہ ہے جس کے روزمرہ کے معمولات میں نماز ادا کرنے اور مسجد جانے کی مصروفیت بھی شامل ہے۔بلاشبہ یہ عین مطلوب ہے۔لیکن دراصل یہ نماز کا نقطہ آغاز ہے اس فریضے کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے۔جب نماز قرآن پاک کے الفاظ میں ''ذکر'' (خدا کی یاد) کا ذریعہ بن جائے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نماز قائم کرو کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔قرآن پاک ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک بیش قیمت عطیہ ایسی علمی صورت میں موجود ہے کہ جس کا علم تا قیامت ظاہر ہوتا رہے گا۔جبکہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا وہ قیمتی اثاثہ ہیں جن کے عمل کے فوارے روز محشر تک ہر کسی کو محبت اور عمل کا پیغام دیتے رہیں گے ان دونوں قیمتی اثاثوں کے بعد مسلمانوں کو کسی اور کی رہبری اور رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

نماز ادا کرنے کا عمل بہت ہی خاموشی سے بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے ظاہر کر دیتا ہے اصل میں نماز ادا کرنے کا عمل انسان پر اس طرح اثر انداز ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس کے خیالات پر چھا جائے اور انسان اللہ تعالیٰ سے رابطے میں آ جائے۔اگر ہماری نماز مطلوبہ اثرات مرتب نہیں کر رہی تو کہیں نہ کہیں ہم سے غلطی ہو رہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں۔پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں انسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں سود کا کاروبار کرتے ہیں۔غرض وہ سب کچھ جو ایک بے نمازی کر سکتا ہے۔وہ ہمارے ہاں نمازی حضرات بھی کرتے ہیں ایسے میں ضرورت ہے کہ نماز کی ''مدح'' یا نماز کے داخلی پہلو کے یعنی ''ذکر'' خدا کی یاد کو پوری طرح سے اجاگر کر کے نماز میں جو محبت کا پیغام اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کی وضاحت کی جائے یا لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی اہمیت کا احساس اور اس ذات باری تعالیٰ کے حصول کی خواہش پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی یاد کے حوالے سے نماز میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔

۱۔اوّل اللہ تعالیٰ کی بڑائی

۲۔اللہ تعالیٰ کی پاکی کا بیان

نماز میں اللہ اکبر اور سبحان اللہ سب سے زیادہ دہرائے جانے والے الفاظ ہیں۔بلکہ یہ دو ایسی حقیقتیں ہیں جو انتہائی محبت سے انسانی نفسیات اور نتیجہ میں انسان کے عمل کو یکسر بدل دیتیں ہیں۔سب سے پہلے ''اللہ اکبر'' کو لیتے ہیں۔

یہ کلمہ انسان کو بار بار یاد دلاتا ہے۔کہ اس کا معبود ایک بہت بڑی ہستی ہے وہ سب سے بڑی ہستی ہے۔انسان جو فطری طور پر کسی بڑے کی پکڑ سے ڈرتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا یہ تعارف بار بار حاصل کرتا ہے۔تو پہلے دوران نماز ذہن کی دنیا میں اللہ کے سامنے چھوٹا ہو جاتا ہے۔اور پھر نماز سے باہر عمل کی دنیا میں بھی اس کے سامنے انتہائی محبت سے اپنا سر جھکائے رکھتا ہے۔اور جب کوئی ایسا لمحہ اس کے سامنے آتا ہے جب وہ طاقتور ہوتا ہے۔کہ ظلم کرے یا آزاد ہوتا ہے۔کہ زیادتی کرے یا بااختیار ہوتا ہے۔کہ کسی کا حق مارے تو وہی نماز والا بڑا اللہ اسے یاد آ جاتا ہے۔اور پھر وہ طاقتور آزاد اور بااختیار انسان چھوٹا ہو جاتا ہے۔وہ جان لیتا ہے۔کہ وہ اس بڑے اللہ

سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ جو اگر رحمان ہے رحیم ہے اور کریم ہے تو وہ جبار اور قہار بھی ہے پھر مجمع تو در کنار وہ تنہائی میں بھی گناہ کا تصور نہیں کرتا وہ دین اور فطرت کی حدود کو نہیں توڑتا۔ نماز کے ہر حکم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا محبت سے دیا ہوا یہ پیغام ''اللہ اکبر'' کی یاد دہانی انسان کو پابند کر دیتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی بڑائی کو مانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔

تکبیر کے ساتھ نماز کی دوسری یاد دہانی تسبیح سے ہے۔

تسبیح کیا ہے؟

تسبیح اس بات کا اعتراف ہے کہ اللہ بے عیب ہے، ہر کمی اور ہر غلطی سے پاک ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ اس کی اعلیٰ اور عظیم ہستی کو ہونا چاہیے۔ انسان نماز کا آغاز اس حقیقت کے اقرار سے کرتا ہے۔ رکوع میں اس بات کو مان کر جھک جاتا ہے۔ اور سجدے میں اس حقیقت کے اعتراف میں اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے۔ قربان اس ذات پر جس نے نہایت محبت کے ساتھ ایک ایسا لفظ ہماری زبانوں سے جاری کروا دیا جس کی گہرائی تک ہم پہنچ ہی نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے ''سبحان'' ہونے کو جاننا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس حقیقت کو جانے بغیر ایک طرف انسان اللہ سے وہ کچھ منسوب کرتا ہے۔ جو اسے شرک تک پہنچا دیتا ہے تو دوسری طرف بندے اور رب کے درمیان جو اعتماد اور محبت کا تعلق ہونا چاہیے اور جو حقیقت روح کی غذا ہے۔ وہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تسبیح کا عمل ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نہ بے بس ہے نہ بے حس ہے نہ وہ رعایا سے بے پروہ ہے۔ نہ ثبوت و گواہی کے لئے محتاجِ قانون- وہ تو پاک ہے عظیم ہے وہ اعلیٰ ہے اس دن کا مالک جو بہت جلد آنے والا ہے۔ جس دن ہر سرکش اور ظالم کا ٹھکانہ جہنم اور ہر نیکو کار کا مقام جنت کی ابدی نعمتیں ہوں گی چنانچہ تسبیح انسان کو نہایت ہی محبت کے ساتھ بے عملی سے بچا کر مشکل ترین حالات میں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکائے رکھتی ہے۔

اس طرح نماز کے یہ داخلی پہلو یعنی تکبیر و تسبیح بہت ہی پیار سے اور آسانی سے انسان کو متقی باعمل حوصلہ مند اور صاحب ایمان انسان بنا دیتی ہے۔ ایسا انسان جس کی آج کے دور میں بے حد ضرورت ہے۔

ایسے ہی ہمارے ہاں زکوٰۃ ایک بہت ہی اہم ترین عبادت ہے بہت سے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے۔ وہ زکوٰۃ بڑی پابندی سے دیتے ہیں۔ تاہم ہمارے ہاں زکوٰۃ کو غریبوں کی مدد کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک حد تک یہ بھی ہے۔ اب ہم بتائیں گے کہ زکوٰۃ اصل میں کیا ہے؟ اور کیوں ادا کی جاتی ہے؟

زکوٰۃ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نذر ہے، نذر کا مطلب ہے کہ انسان اپنے مال کا ایک حصہ بہت ہی محبت سے اپنے معبود کو راضی کرنے کے لئے بطور نذرانہ اس کے حضور پیش کر دے۔

قدیم زمانے میں جب شرک کا غلبہ تھا تو لوگ مندروں اور مقبروں میں جا کر اپنا مال مختلف شکلوں میں بتوں کی بھینٹ چڑھاتے تھے اور پھر یہ مال مقبروں کے خدام اور وہاں آنے والے زائرین کی ضروریات پر خرچ کرتے۔

اسلام نے اس صورتحال کو تبدیل کیا اس محبت کرنے والی ہستی نے اپنے حضور نذر کو زکوٰۃ کی مستقل عبادت کی شکل دے کر اس نظام اجتماعی کو غریبوں کی مدد اور ضرورت مندوں کے لئے خاص کر دیا تاہم اس کے پیچھے جو روح اور جذبہ ہے۔ وہ اسی طرح باقی ہے۔ **ہمیں اس زکوٰۃ کا حکم دینے والے محبوب کی محبت کو پیش نظر رکھ کر اپنی زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ وہ یہ زکوٰۃ کسی انسان کو نہیں دے رہا ہے۔ بلکہ اپنا سر اور دل جھکا کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر عاجزی اور پستی کے ساتھ اپنا یہ نذرانہ اپنے معبود کو پیش کر رہا ہوں۔**

اگر کوئی شخص سر اٹھا کر، احسان جتلا کر، دبنگ لہجے کے ساتھ انسانوں کو زکوٰۃ دیتا ہے۔ اس کا مال تو خرچ ہو جاتا ہے۔ مگر پروردگار عالم کی بارگاہ سے ایسے شخص کو سند قبولیت نہیں ملتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی گردن اس قابل نہیں کہ بلند ہو کر شرف قبولیت حاصل کر سکے اس کے نزدیک تو صرف اور صرف محبت، عاجزی اور پستی قبول ہوتی ہے۔ **زکوٰۃ دینے والے لوگوں کی مدد کرنے والے اور انفاق کرنے والوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ انسانوں کو دے رہے ہیں تو بلاشبہ سر اٹھا کر دیں لیکن اگر اپنے رب کو نذر کر رہے ہیں تو ہمیشہ سر جھکا ہوا رکھیں۔ یہی وہ محبت ہے جو اس نے ہمیں زکوٰۃ کے سلسلے میں سکھائی اور در قبولیت کا راستہ ہے۔** اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اپنی اور دوسروں کی جائز ضروریات کے لئے پیسے خرچ نہ کرنا۔ مال جمع کرتے اور گن گن کر رکھتے رہنا ''بخل'' اور ایک بدترین انسانی رویہ ہے یہ رویہ دنیا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیغام یاد نہیں ہوتا۔ اسلام میں تصحیح ہے۔ تضحیک نہیں اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تنقید ہمیشہ وہ موثر ہوتی ہے۔ جو

اصلاحی اور تعمیری ذہن کے ساتھ کی جائے۔ ایسی تنقید کرنے والے لوگوں کی زندگی کا اصل مقصد اپنی اصلاح کرنا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو تنقید کرنے سے پہلے اپنے ہر رویئے کو بے رحمانہ احتساب سے گزارتے ہیں وہ دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے سے قبل اپنے اور ان کے لئے دعا کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے سورۃ الفرقان، آیت نمبر 63 میں رحمٰن کے بندوں کے بارے میں بتایا ہے:

ترجمہ:۔ ''رحمٰن کے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر دھیمی چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان کے منہ آتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔''

حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف ایک جلیل القدر صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ اسلام کے لئے ان کی خدمت اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے ان کو ملنے والی بشارتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ حضرت طلحہؓ جو خود ایک جلیل القدر صحابی تھے ان میں اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف میں کسی وجہ سے کوئی رنجش ہو گئی۔ اس دوران میں حضرت طلحہؓ بیمار پڑے تو حضرت عبدالرحمنؓ ساری رنجش اور شکایت بھلا کر ان کی عیادت کرنے پہنچ گئے۔ حضرت طلحہؓ نے جب ان کو دیکھا تو کہا" آپؓ مجھ سے بہتر ہیں آپؓ بیمار ہوتے تو میں عیادت کے لئے نہ آتا"۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں وہ دو بنیادی اوصاف موجود تھے جو انسانوں کو عظیم بناتے ہیں۔ پہلا وصف اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے لئے محبت اور اخلاق اور دوسرا وصف اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے لئے محبت اور اعتراف۔

پہلی صفت کا مظاہرہ یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے لئے محبت اور اخلاق حضرت عبدالرحمنؓ نے شکایت رنجش کے باوجود حضرت طلحہؓ کی عیادت کے لئے جا کر کیا۔ اس جواب میں حضرت طلحہؓ نے جو کچھ کیا وہ اعتراف تھا یعنی انہوں نے اپنی ''انا'' اور اپنی عزت کو ایک طرف رکھ کر یہ مان لیا کہ حضرت عبدالرحمنؓ نے ان سے بہتر ہونے کا ثبوت دیا ہے یہ اعتراف کر کے وہ بھی عبدالرحمنؓ کی سطح پر آ گئے۔ کیونکہ **اعلیٰ اخلاق جتنی بڑی نیکی ہے اعتراف گناہ بھی اتنی بڑی نیکی ہے۔ اور ان دونوں نیکیوں کے پیچھے جو احساس ہے وہ ہے اللہ تعالیٰ سے خوف اور اس کی محبت۔**

تو دین اسلام ہمیں لوگوں سے محبت اپنے معبود سے محبت کرنے کے بے شمار طریقے بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اور صرف وہی محبوب ہوتا ہے جو اس کی مخلوق سے محبت کرے۔ دین اسلام ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے مسائل حل کرے اور بدترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے لئے مسائل پیدا کرے۔

نظر نظر میں اترنا کمال ہوتا ہے
نفس نفس میں بکھرنا کمال ہوتا ہے
بلندیوں پر پہنچنا کوئی کمال نہیں
بلندیوں پر ٹھہرنا کمال ہوتا ہے

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ہمارے لئے ایک بہترین محبت اور اخلاق کا عملی نمونہ چھوڑ کر گئے ہیں ہم سب کو اس بات کا نمونہ ہونا چاہیے۔ کہ ہر فرد ہمارے ارد گرد کا ہمارے بارے میں یہ کہنے لگے:

نہ جانے کونسی دولت ہے تیرے لہجے میں؟
تو بولتا ہے تو دنیا خرید لیتا ہے

آج کا انسان دین سے دوری کے باعث محبت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا انسان ہر قدم پر ایک دوراہے سے دوچار ہوتا ہے۔ آج کے انسان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ نکلنے اور ڈوبنے پر سورج کے منظر پر تفکر یا تدبر کر سکے۔ وہ چاندنی راتوں کے حسن سے نا آشنا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ دین کو سمجھنا نہیں چاہتا وہ تو بس محبت کی سائنس سمجھنا چاہتا ہے اور یہ ممکن نہیں۔

زندگی صرف حاصل ہی نہیں ایثار بھی ہے۔ زندگی صرف ''میں'' ہی نہیں زندگی ''وہ'' بھی ہے زندگی ''تو'' بھی ہے۔ زندگی میں صرف مشینیں ہی نہیں چہرے بھی ہیں۔ جیسا کہ ہمارے دین نے ہمیں بتایا کہ یہ زندگی صرف مادہ ہی نہیں روح بھی ہے اور اصل زندگی تو روح ہی ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ یہ زندگی خود ہی معراج محبت بھی ہے۔ مقصد یہ کہ یہ زندگی ہر دور سے گزرتی ہوئی ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہوئی بڑھاپے تک آتی ہے۔ قابل قدر ہے وہ بڑھاپا جو دوسروں کے لئے نافع ہو جو آگاہ راز ہو اور دوسروں کو آگاہ کرنے کی کوشش کرے۔

سب سے بڑا پیغام دوسروں کو دیا جاتا ہے وہ یہ کہ مال جمع کرنے میں انسان زندگی خرچ کر دیتا ہے اور آخر کار وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دامن مال سے تو بھر گیا ہے لیکن اس کی زندگی کی متاع بھی تو ختم ہوگئی اور یہ کہ لالچ انسان کو کمزور کر دیتی اور خود غرضی انسان کو تنہا کر دیتی ہے۔ زندگی کی اساس عمل نہیں فضل ہے۔

نیت کی اساس اصلاح عمل میں ہو تو خلوص پیدا ہو سکتا ہے۔ اور عمل کا خلوص نیتوں سے بے نیاز ہے نیکی کے سفر میں جہاں بھی آخری سانس آئے وہی منزل ہے ہمارا نظام حیات، نظام تعلیم، اور نظام فکر ہمیں صرف عمل میں مصروف رکھتا ہے۔ عاقبت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ عاقبت کی گارنٹی تو ہمیں ہمارا مذہب دیتا ہے۔ کہ اس عمل کو تلاش کیا جائے جو ہمیں بھی پسند ہو اور ہمارے مالک کو بھی ورنہ نتیجہ ہلاکت اور گمراہی ہوگا۔ احسن عمل اصلاح باطن کے ساتھ حسن حیات کا اصول ہے زندگی میں راہیں بدلنے کا وقت نہیں ہوتا پہلے ہی صحیح راستہ اختیار کیا جائے یہی منشا ہے اس کے اس حکم کا ''اے انسان تو محنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اب اپنے رب کے راستے کی طرف محنت کر''۔

اے اللہ مجھے تیری رحمت پر یقین ہے میرے عمل کی کوتاہی مجھے تیرے فضل سے محروم نہیں کر سکتی تیری عطا میری خطا سے بہت وسیع ہے۔ مجھے اپنے دربار میں قبول و منظور کر لے۔ آمین!

****

اسلام اور کفر

اسلام کے معنی عربی زبان میں اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔

مذہب اسلام کا نام ''اسلام'' اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔

اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر رواں دواں ہیں۔ گویا یہ سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار ہیں۔ چاند، سورج اور تارے سب ایک زبردست قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس کے فرماں بردار ہیں۔

جمادیات، نباتات اور حیوانات میں سے ہر ایک کے لئے جو قانون مقرر ہے اسی کے مطابق سب پیدا ہوتے ہیں بڑھتے ہیں، جیتے اور مرتے ہیں۔ اگر انسان کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جو قاعدہ اس کی زندگی کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق سانس لیتا ہے۔ پانی، غذا، حرارت اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ انسان کے دل کی حرکت، خون کی گردش، سانس کی آمد و رفت ایک ضابطے کی پابند ہے۔ انسان کا دماغ، اس کا معدہ، اس کے پھیپھڑے، اس کے اعصاب، ہاتھ، پاؤں، زبان، آنکھ، کان غرض کہ جسم کا ایک ایک حصہ وہی کام کرتا ہے جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔

اس لحاظ سے ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار ہے اور ساری کائنات کا مذہب اسلام (فرمانبرداری) ہے۔

اب ایک اور پہلو دیکھتے ہیں۔

انسان کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ دیگر مخلوقات کی طرح قانون قدرت کے زبردست قاعدوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمارے اندرونی اعضاء ہمارے کنٹرول میں نہیں یہ اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ عقل رکھتا ہے۔ سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی قوت رکھتا ہے اور اپنے ارادہ اور اختیار سے ایک بات کو مانتا اور دوسری بات کو نہیں مانتا۔ اس حیثیت میں وہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح کسی مقرر قانون کا پابند نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کو اپنے خیال، اپنے ارادے اپنی رائے اور عمل میں انتخاب کی آزادی دی گئی ہے۔

انسان کی زندگی میں یہ دو حیثیتیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔

پہلی حیثیت میں وہ دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح پیدائشی مسلم ہے اور مسلم (فرمانبردار) ہونے پر مجبور ہے۔

دوسری حیثیت میں مسلم ہونا یا نہ ہونا اس کے اختیار میں ہے اور اسی اختیار کی وجہ سے انسان دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

(1) ایک انسان وہ ہے جو اپنے خالق کو پہچانتا ہے اس کو اپنا آقا و مالک تسلیم کرتا ہے اور اپنی زندگی کے اختیاری کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ کے پسند کئے ہوئے قانون کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ یہ ہے پورا مسلم۔ اس کا اسلام مکمل ہو گیا۔ کیونکہ اب اس کی زندگی سراسر اسلام ہے۔ اب اس کی ساری زندگی میں راستی ہی راستی ہے۔ کیونکہ وہ اختیار اور بے اختیار دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے قانون کا پابند ہے اب وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) ہے۔ ساری دنیا اس کی ہے اور وہ خود اللہ کا ہے۔

(2) دوسرا انسان وہ ہے جو مسلم پیدا ہوا اور اپنی زندگی بھر بغیر جانے بوجھے مسلم رہا مگر اپنے علم اور عقل کی قوت سے کام لے کر اس نے اللہ کو نہ پہچانا۔ اور اپنے اختیار کی حد میں اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا یہ شخص کافر ہے۔

کفر کیا ہے؟

کفر کے اصل معنی چھپانے اور پردہ ڈالنے کے ہیں۔ ایسے شخص کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی فطرت پر نادانی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ تمام دنیا کی اور خود اپنی فطرت اس سے چھپ گئی ہے کفر ایک جہالت ہے۔ بلکہ اصلی جہالت کفر ہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہوگی کہ انسان اللہ سے ناواقف ہو۔ ایک شخص کائنات کے اتنے بڑے کارخانے کو رات دن چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر جاننا ہی نہیں چاہتا کہ اس کارخانے کو بنانے اور چلانے والا کون ہے؟

ایک شخص دنیا میں ہر طرف ایسی چیزیں اور ایسے کام دیکھتا ہے۔ جن میں بے نظیر انجینئرنگ، ریاضی دانی، کیمیا دانی اور ساری دانائیوں کے کمالات نظر آتے ہیں مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ علم و حکمت اور دانش مندی والی ہستی کون سی ہے؟ جس نے کائنات میں سارے کام انجام دیئے ہیں؟

غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ ایسے شخص کے لئے صحیح علم کے دروازے کیسے کھل سکتے ہیں جس کو علم کا پہلا سرا ہی نہ ملا۔ جس کو شروع میں جہالت کا اندھیرا نظر آئے گا

وہ آخیر میں بھی اندھیرے کے سوا کچھ نہ دیکھ پائے گا۔

کفر ایک ظلم ہے۔ بلکہ سب سے بڑا ظلم کفر ہی ہے۔ کفر ظلم ہی نہیں بلکہ یہ بغاوت، ناشکری اور نمک حرامی ہے۔ اگر انسان غور کرے تو انسان کے پاس خود اپنی چیز ہے کیا؟ اپنے دماغ کو اس نے بنایا یا اللہ نے، اپنا دل، اپنی آنکھیں، اپنی زبان، اپنے ہاتھ پاؤں تمام اعضاء کا وہ خود مالک ہے یا اللہ کی ذات؟ جب اصل حقیقت اللہ کی ذات ہے تو ایسے انسان سے بڑا باغی کون ہوگا؟ اگر کوئی سرکاری افسر حکومت کے دیئے ہوئے اختیارات کو خود حکومت ہی کے خلاف استعمال کرتا ہے تو اسے باغی کہتے ہیں۔ اور یہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

انسان پر سب سے بڑا حق اس کے ماں باپ کا ہے مگر ماں باپ کے دل میں اولاد کے لئے محبت کس نے پیدا کی؟ ماں کے سینے میں دودھ کس نے اتارا؟ باپ کے سینے میں یہ بات کس نے ڈالی کہ اپنے خون پسینے کی کمائی گوشت پوست کے ایک بے کار لوتھڑے پر خوشی خوشی لٹا دے اور اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں اپنا وقت، اپنی دولت، اپنی آسائش سب کچھ قربان کر دے۔ اب دیکھیں کہ جو انسان کا اصلی محسن ہے۔ حقیقی بادشاہ ہے۔ سب سے بڑا پروردگار ہے اگر اسی کے ساتھ انسان کفر کرے۔ اس کو اپنا رب نہ مانے اس کو اپنا معبود نہ مانے اس کی بندگی سے انکار کرے اور اس کی اطاعت سے منہ موڑے تو یہ کیسی سخت بغاوت ہے؟ کتنی بڑی احسان فراموشی اور نمک حرامی ہے؟

کفر اور نافرمانی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ کے لئے ناکام اور نامراد ہو جائے۔ ایسے شخص کو علم کا سیدھا راستہ کبھی نہ مل سکے گا۔ کیونکہ جو علم خود اپنے خالق کو نہ جانے وہ کس چیز کو جان سکتا ہے؟ اس کی عقل ہمیشہ ہی ٹیڑھے راستے پر چلے گی اور وہ کبھی آخرت کی کامیابیوں کی راہ نہ پا سکے گا۔

اس کے برعکس دوسرا شخص ہے جس نے علم اور عقل سے صحیح کام لے کر اللہ کی ذات کو جانا اور پہچانا۔ حالانکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے یہ راستہ منتخب کیا۔ اس نے نیک اور بد کی تمیز میں غلطی نہیں کی اور اپنے آزاد انتخاب سے نیکی کو ہی پسند کیا۔ اس نے اپنی فطرت کو جانا اپنے اللہ کو پہچانا اور نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ہی اختیار کی۔ اس نے حق کو پہچان کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ حق شناس ہے اور حق کے آگے سر جھکا کر یہ بھی دکھا دیا کہ وہ حق پرست ہے۔

ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ صفات موجود ہوں اس کو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہونا ہی چاہیے۔ ایک مسلم کے اخلاق میں حق شناسی اور راست بازی ہوتی ہے۔ ایک مسلمان دنیا میں یہ سمجھ کر رہتا ہے کہ سب چیزوں کا مالک اللہ ہے۔ اور انسانوں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہی دیا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی معزز نہ ہوگا کیونکہ اس کا سر اللہ کے سوا کسی کے سامنے جھکنے والا نہیں اور اس کا ہاتھ اللہ کے سوا کسی کے آگے پھیلنے والا نہیں۔

اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقت ور نہ ہوگا کیونکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں جانتا اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی غنی اور دولت مند نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ عیش پرست نہیں، خواہش نفس کا بندہ نہیں، حریص اور لالچی نہیں۔ قناعت پسند اور حلیم ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی محبوب اور ہر دل عزیز نہ ہوگا کیونکہ وہ ہر شخص کا حق ادا کرنے والا ہے اور کسی کا حق نہیں مارتا۔ کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی کا اختیار بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ امانت میں خیانت نہیں کرتا صداقت سے منہ نہیں موڑتا۔ وعدے کا سچا اور معاملے کا کھرا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی دل جوئی کرتا ہے اس کے کام آتا ہے ایک مسلم کی سیرت کو اچھی طرح دیکھ لیں تو یقین آ جائے گا کہ مسلم کبھی دنیا میں ذلیل، محکوم اور مغلوب بن کر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیشہ غالب اور حاکم ہی رہے گا۔ کیونکہ اسلام نے جو صفات اس میں پیدا کر دی ہیں ان پر کوئی قوت غالب نہیں آ سکتی۔

اس طرح دنیا میں عزت اور بزرگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بعد جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگا تو اس پر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کرے گا۔ کیونکہ جو امانت اس کے سپرد کی گئی تھی اس کا حق اس نے ادا کر دیا۔ اور جس امتحان میں اللہ تعالیٰ نے اسے ڈالا تھا اس میں وہ کامیاب ہو گیا۔ یہ ابدی کامیابی ہے۔ جو دنیا سے لے کر آخرت تک چلی جاتی ہے اور اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

یہ ہے اسلام۔ انسان کا فطری مذہب۔ یہ کسی قوم اور کسی ملک کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہر زمانے اور ہر قوم اور ہر ملک میں جو خدا شناس اور حق پرست لوگ گزرے ہیں ان سب کا ہی مذہب تھا۔ وہ سب مسلم تھے۔ خواہ ان کی زبان میں اس مذہب کا نام اسلام ہو یا کچھ اور ہو۔ ہماری زبان میں اس کا نام ''اسلام'' ہے۔

****

دعا

دعا تعلق مع اللہ کی سب سے پہلی سیڑھی ہے۔

دعا کے معنی:

عبادت کرنا، مدد طلب کرنا اور سوال کرنا وغیرہ کے ہیں۔

دعا کی اصطلاحی تعریف:

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا، محتاجی کا اقرار کرنا، تواضع اختیار کرنا۔

دعا کا حکم:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورۃ غافر، آیت نمبر-60)

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ

ترجمہ: ''تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا''۔

سورۃ الشرح، آیت نمبر 7 اور 8 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ

ترجمہ: ''تو جب فارغ ہوں آپ (خاتم النبیین ﷺ) پس محنت (دعا) کریں''۔ (یعنی نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لئے کھڑے ہو جاؤ)

سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 186 میں ارشاد فرمایا:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

ترجمہ: "اور جب میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو یقیناً میں قریب ہوں دعا کرنے والا جب مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں''۔

مفسرین کرام کا اس آیت کریمہ کے نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ

کلبیؒ نے بروایت ابوصالحؒ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا "مدینہ منورہ کے ایک یہودی نے رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے سوال کیا کہ " جب آپ خاتم النبیین ﷺ کہتے ہیں کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ ہے اور ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہی ہے تو پھر ہمارا رب ہماری دعا کیسے سنتا ہے"؟ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے دریافت کیا تھا "ہمارا رب کس جگہ ہے"؟ اس سوال پر یہ آیت (سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 186) اتری۔

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ جب آیت (سورۃ غافر، آیت نمبر-60)

اُدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ

ترجمہ: ''مجھ سے دعا کرو میں دعا قبول کروں گا''۔

نازل ہوئی تو ایک شخص نے عرض کیا ''یارسول اللہ ہم اپنے رب کو کس طرح اور کس جگہ سے پکاریں؟'' تو اللہ تعالیٰ نے اس سوال پر یہ آیت (سورہ البقرہ، آیت نمبر 186) نازل فرمائی:

واذا سالک عبادی عنی فانی قریب

ترجمہ: ''جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو کہو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں''۔

حضرت ضحاکؒ نے بیان کیا کہ بعض صحابہؓ نے رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کیا ہمارا رب قریب ہے ہم چپکے چپکے اس سے کلام کریں یا زور سے اس کو پکاریں''۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت (سورہ البقرہ، آیت نمبر 186) کو نازل فرمایا۔

دعا کی عدم قبولیت:

اب اگر سوال کیا جائے کہ جب آیت اُجِیبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ میں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں اور آیت اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے دعا کرو (مجھے پکارو) میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔دعا کی قبولیت کا وعدہ موجود ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی؟ اس کے جواب میں دونوں آیات کی تفسیر و توضیح مختلف معنی کے ساتھ کی گئی۔

1۔ بعض نے کہا کہ دعا سے مراد ''اطاعت'' اور اجابت سے مراد ثواب ہے گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جب بندہ میری اطاعت کرے گا تو میں اس کو ثواب دوں گا''۔

2۔ بعض علما اور مفسرین نے کہا کہ دونوں آیات کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن ان کے معنی خاص ہیں۔اور اس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے کہ علیؓ بن ابی متوکل نے بروایت حضرت ابوسعیدؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''جب مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور اس میں رشتہ داری سے قطع تعلق یا پھر کوئی گناہ کا سوال نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور تین چیزوں میں سے ایک چیز عطا فرما دیتا ہے۔

1۔ یا تو اس کا مدعا فوراً دنیا میں پورا کر دیتا ہے-

2۔ یا آخرت میں جمع کر دیتا ہے-

3۔ یا کسی آنے والی برائی سے اس کو بچا لیتا ہے"-

یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ایسی صورت میں تو ہم اور زیادہ دعا کیا کریں گے۔''حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اللہ اکبر اس کی عطا بہت زیادہ ہے'' (یعنی وہ تمہیں پھر بہت عطا کرے گا) (مسند احمد، مستدرک حاکم)

بعض علما نے کہا ہے کہ یہ آیت الفاظ کے اعتبار سے جس طرح عام ہے اس طرح معنی کے اعتبار سے بھی عام ہے۔آیت میں صرف دعا کی اجابت مذکور ہے (قبولیت) مراد کا دینا اور حاجت کو پورا کرنا مذکور نہیں ہے۔پس دعا کی اجابت (قبولیت) ضرور ہوتی ہے۔

أُجِیبُ اور اَسْتَجِیبُ خبریہ جملے ہیں اور خبر کبھی منسوخ نہیں ہوتی ورنہ خبر دینے والا کاذب ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کذب سے مبرہ اور پاک ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر کبھی خلاف واقع نہیں ہوسکتی۔اس توضیح اور تفسیر کی تائید اس حدیث شریف سے ہوئی ہے۔جس کو نافعؓ نے بروایت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''جس کے لئے دعا کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اس کے لئے اجابت (قبولیت) کے بہت سے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں''۔(جامع ترمذی)

حضرت داؤدؑ پر اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی تھی کہ ''ظالموں سے کہہ دو کہ مجھ سے دعا نہ کریں کیونکہ اجابت کو میں نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (قبولیت یا پکارنے والے کی پکار کو سننا) اور میں ظالموں کی دعاؤں کی اجابت اس طرح کرتا ہوں کہ ان پر لعنت بھیجتا ہوں۔'' اس کی یہ تاویل بھی کی گئی ہے کہ مومن کی دعا اللہ تعالیٰ اسی وقت قبول کر لیتا ہے مگر عطائے مراد میں تاخیر اس لئے فرماتا ہے کہ بندہ اس کو پکارتا رہے اور اللہ تعالیٰ اس کی آواز سنتا رہے۔

کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعیدؒ نے کہا کہ ''میں رب العزت کے دیدار سے خواب میں مشرف ہوا تو میں نے عرض کیا کہ ''الٰہی میں نے تجھ سے کتنی دعا کی لیکن تو قبول نہیں فرماتا''۔فرمایا ''یحییٰ ہم کو تیری آواز پسند ہے''۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دعا کے کچھ آداب و شرائط ہیں۔انہی پر کامیابی اور اجابت کا دارومدار ہے۔جو شخص دعا میں ان کو ملحوظ رکھتا ہے اور ان شرائط کی تکمیل کرتا ہے وہ مقبول الدعا ہوتا ہے۔اور جو ان شرائط کو ترک کرتا ہے یا ان میں کچھ نقص پیدا کر دیتا ہے وہ دعا کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ:''اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو، بے شک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے اور بہترین عبادت صبر کے ساتھ فراخی کا انتظار ہے''۔(جامع ترمذی)

منقول ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے کسی نے سوال کیا" کیا وجہ ہے ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتی"؟انہوں نے جواب دیا''اس لیے کہ ہم اللہ کی دی ہوئی

نعمتیں کھاتے ہیں مگر اس کے شکر گزار نہیں ہوتے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کو اپنا ہادی برحق کہتے ہیں لیکن ان کے طریقوں کو اختیار نہیں کرتے۔ قرآن پاک کو اپنی کتاب کہتے ہیں لیکن اس کے احکامات جاننے اور عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ جنت کو برحق کہتے ہیں لیکن اس کی طلب میں جستجو ہی نہیں کرتے۔ دوزخ کا اقرار کرتے ہیں مگر اس سے خوف نہیں کھاتے۔ شیطان کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر اس سے بچنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ موت سے آگاہ ہیں مگر اس کی تیاری نہیں کرتے۔ روزانہ اپنے ہاتھوں سے مردوں کو نہلاتے دھلاتے ہیں، کفناتے اور دفن کرتے ہیں لیکن عبرت ہی نہیں پکڑتے۔ ہم نے اپنے عیبوں کو چھوڑ دیا ہے اور دوسروں کے عیبوں کے بیان میں لگے رہتے ہیں پھر بھلا ایسے لوگوں کی دعائیں کیا قبول ہوں گی؟''

صوفیاء کرام کے نزدیک دعا سے مراد:

حیا کی زبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے آنے کا نام دعا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے سے مانگنے والے پسند ہیں

دعا محبوب حقیقی سے ایک قسم کی باہمی پیغام رسانی ہے۔ جب تک یہ سلسلہ قائم رہے تب تک معاملہ ٹھیک رہتا ہے۔ دعا قرب الٰہی کا ایک ذریعہ ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جس نے دعا کی ترغیب نہ دی ہو۔ دعا مانگنا دراصل بارہ گاہ الٰہی میں اپنی عبودیت، عجز و نیاز اور محتاجی کا اظہار کرنا ہے۔

بارگاہ الٰہی میں دعا کی قدر و قیمت:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کی بارہ گاہ میں دعا سے زیادہ کوئی چیز محبوب و مکرم نہیں ہے۔

1۔ دعا عبادت کا مغز ہے

2۔ دعا قضائے حاجت کی چابی ہے-

3۔ دعا بنیادی ضرورتوں کی کفیل ہے-

4۔ دعا شرک سے بچاؤ کا ذریعہ ہے-

5۔ دعا بخشش اور مغفرت کا ذریعہ ہے"۔

شرائط دعا:

1- دعا میں اخلاص **2-** رزق حلال **3-** گناہوں سے توبہ **4-** عاجزی کا اظہار

آداب دعا:

1- قبلہ رو ہو کر دعا کرنا

2- دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

3- خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کرنا

4- قبولیت دعا میں جلدی اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کرنا

5- دعا کے اول و آخر میں 7 مرتبہ درود شریف پڑھنا

6- دعا کا حمد و ثنا سے شروع کرنا

7- دعائیہ کلمات تین مرتبہ کہنا

8- اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنانا یا یاد کرنا

9- دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنا

مقبول ترین اوقات دعا:

1-سحری کا وقت 2-عرفہ کا دن 3-رمضان کا مہینہ 4-جمعہ کا دن 5-سجدہ کی حالت 6-اذان اور اقامت کے درمیان

7- فرض نماز کے بعد۔ (فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت ہے)-

قرآنی دعائیں:

فرض نماز کے بعد

1۔ ثناء۔تیسرا کلمہ

2۔ درود شریف

3۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

4۔ الحمد اللہ۔سورہ اخلاص

5۔ استقامت اور ثابت قدمی کے لئے دعا ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب (العمران:8)

6۔ دین ودنیا کی کامیابی کے لئے ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی لاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار (البقرہ:201)

7۔ نقصان سے بچنے کے لئے اور معافی کے لئے ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخسرین (الاعراف:23)

8۔نماز میں استقامت اور ماں باپ اولاد کے لئے دعا۔ رب اجعلنی مقیم الصلواۃ ومن ذریتی ربنا وتقبل دعآ o رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ (ابراھیم:41.40)

9۔مغفرت اور کرم کے لئے ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطانا ربنا ولا تحمل علینا اصرًا کما حَمَلْتَهُ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولنا فانصرنا علی القوم الْكَافِرِينَ (سورہ البقرہ:286)

10 علم میں اضافہ کے لئے رب زدنی علما (طہ:114)

کن لوگوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

1- مظلوم،مسافر اور والد کی دعا 2- غائب کی دعا 3- روزہ دار کی دعا 4- عادل حکمران کی دعا

5- مجاہد کی دعا 6- حاجی کی دعا 7- عفو ودرگزر کرنے والے کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

مسجدیں پسندیدہ ترین جگہیں اور بازار ناپسندیدہ ترین جگہ ہیں۔ بازار کا کفارہ چوتھا کلمہ ہے۔اس لئے جب بازار جائیں تو زبان پر چوتھے کلمے کا ورد رکھیں اور کوشش کریں کہ جلد از جلد خرید وفروخت کر کے لوٹیں کیونکہ شیطان کا ایک پڑپوتا زلنبور بازار پر متعین ہے اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ جو شخص بازار میں زیادہ وقت لگاتا ہے اس کے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے ''اس نافرمان چہرے پر میں قربان۔''

اس سارے بیان کا مقصد اور خلاصہ یہ ہے کہ **دعا کرنا یا دعا عاجزی اور انکساری کی حالت میں، کیفیت قلب کے اظہار کا نہایت آسان اور ایسا محبوب ترین عمل ہے جس کا انبیاء کرام کے ہاں بھی عمل رہا اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کا پسندیدہ معمول بھی یہی تھا۔** دعا کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انبیاء علیہ السلام کی زبان اقدس سے دعائیہ کلمات ''ربنا'' 105 مرتبہ، ''رب'' 69 مرتبہ ادا کروائے۔علاوہ ازیں لفظ ''اللھم'' کا 5 مرتبہ ذکر کیا۔اس کے علاوہ کتب احادیث میں حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے منسوب بے شمار مسنون دعاؤں کا ذکر ملتا ہے۔

****

تعلق مع اللہ

تعلق مع اللہ

جس طرح انسانی تعلقات کے کئی درجے ہیں مثلاً پہلے شناسائی، پھر دوستی، پھر محبت اور پھر عشق۔اسی طرح اللہ تعالیٰ سے تعلقات کے کئی مراحل ہیں مثلاً پہلے ترکِ گناہ پھر اعمال، پھر بلند اعمالی، پھر شب بیداری اور سحر خیزی پھر فنافی الذات۔یہ ایک کٹھن سفر ہے۔ہم اس کٹھن سفر میں آسان طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ **انسان گناہ کو چھوڑ دے۔**

جھوٹ، فریب، منافقت، بددیانتی، بے رحمی، فحش کاری، رعونت، لالچ اور دیگر رذائل (بری عادات) کو ترک کرنے کے بعد دوسرا قدم اعمال اور خیالات میں بلندی اور پاکیزگی پیدا کرنا ہے۔جب یہ اعمال ہوں گے تو دماغ خوف وخطر سے آزاد ہو جائے گا۔نہ دنیا میں کسی محاسبے کا ڈر رہے گا اور نہ آخرت میں۔حرص ناپید ہو جائے گی تو دنیائے دل بے نیازی سے معمور ہو جائے گا اور اس کے بعد تسلیم ورضا کی نعمت مِل جائے گی۔دراصل عبادت عبوبیت کا نام ہے۔عبوبیت اللہ کی مرضی میں ڈھل جانے کو کہتے ہیں۔جس کے لیے 2 قدم بہت ہی ضروری ہوتے ہیں۔اِن میں **پہلا قدم** ترکِ گناہ ہے۔ترکِ گناہ اور بلند اعمالی اور اُس کے ہر حکم اور ارشاد کی تعمیل، کیونکہ گناہ اللہ کے خلاف بغاوت اور شیطان کی غلامی ہے۔اللہ کے ہر حکم اور اشارے کی تعمیل کے بعد انسان سراپا تسلیم بن جاتا ہے۔اور جب وہ حضوری خداوندی میں سر جھکاتا ہے تو اُس کی روح اور جسم میں ایک کامل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

جو عبادت گزار جھوٹ بولتا ہے، غیبت کرتا ہے، ظلم توڑتا ہے، غصہ کرتا ہے، طنز کرتا ہے، منافقت کرتا ہے اور انسانوں کو ستاتا ہے، اُس کا جسم بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے لیکن روح شیطان کی غلامی میں جکڑی رہتی ہے۔جسم فانی ہے، روح غیر فانی ہے، بارگاہ ذوالجلال میں روح نے پیش ہونا ہے۔جسم نے نہیں ، جسم لاکھ عبادت کرے اگر روح عاصی سرکش ہے تو کچھ بھی نہیں ہے پھر جب کوئی شخص پورے خلوص سے عبادت کرتا ہے تو اُسے کئی انعامات ملتے ہیں۔

1۔ وہ ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔

2۔ وہ ارواح سے رابطہ کر سکتا ہے۔

3۔ وہ اپنی توجہ سے دوسروں کے گناہوں کو دھو سکتا ہے۔

4۔ وہ غیبی آواز سُن سکتا ہے۔

5۔ وہ آنے والے واقعات کی خبر دے سکتا ہے۔

لیکن یہ تمام مدارج منزل نہیں بلکہ راہ کے نظارے ہیں۔یہ تمام باتیں محض شعبدہ بازی ہیں۔اور سچے عابد کی منزل تو کہیں بہت آگے ہے۔"یعنی کائنات اور رَبِّ کائنات سے رابطہ "اصل عظمت روح کی عظمت ہے، جسے حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خواہش میں ڈھل جائے۔عبادت، پاکیزگی اور تقویٰ کو اپنا شعار بنالے، کینہ، کدورت، حسد، حرص اور دیگر سفلی جذبات کو جھٹک دے، دِل میں محبت اور عشق کی دنیا بسالے اور اِس کے بعد ہماری بصارت اور سماعت کا یہ عالم ہو جائے کہ ہر ذرّے میں ذرہ طور نظر آنے لگے۔تمام انبیاء علیہ السلام اور اولیاء اللہ اِس بات پر متفق ہیں کہ تمام مسرتوں، نعمتوں اور لذتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور جب تک اللہ سے رابطہ پیدا نہ کیا جائے یہ چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رابطہ کیسے پیدا ہو؟ یہ ہے وہ سوال جس پر تمام نسلِ انسانی کے اہلِ علم نے صدیوں سوچا، مختلف تجربے کئے اور آخر کار کچھ اصول منضبط کیے جو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہیں بس طریق کار کا فرق ہے۔یعنی مسلمان ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا تبتی یوگا، سب میں چند چیزیں مشترکہ ہیں یعنی پاکیزگی، افکار واعمال ،ذکر تسبیح، اور ذاتِ الٰہی میں محویت۔فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان جسم اور روح دونوں کے جائز تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یوگی تمام جسمانی اور مادی خواہشات کو جھٹک کر کسی غار میں جا بیٹھتا ہے۔روح میں بالیدگی اور قوت پیدا کرنے کے لیے مسلم اور غیر مسلم صوفیا کرام کے ہاں ایک ہی طریقہ ہے۔یعنی تمام فکری اور ذہنی آلائشوں سے پاک ہونا اور پھر عبادت کرنا، عبادت سے روح کیوں توانا ہوتی ہے؟ اور اِس کے بعد کائنات کی تمام طاقتیں ہماری امداد پر کیوں تیار ہو جاتی ہیں؟ ہم اس پر کوئی عقلی دلیل نہیں دے سکتے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس بات پر ہم سوا لاکھ انبیاء، لاتعداد اَولیاء، کروڑوں راہبوں کی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔مثلاً نظام الدّین اولیاءؒ، خواجہ اجمیریؒ، سلطان باہوؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، بوعلی قلندرؒ، داتا گنج بخشؒ وغیرہ۔یہ **" دانیان راز فطرت " ایک ہی بات بتاتے رہے کہ " اللہ کے سامنے جھکنے کے بعد تمام کائنات تمہارے آگے جھک جائے گی"۔**

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر 130)

"اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرو، سجدے میں گرو اور عبادت کرو، تاکہ تمہیں نعمت یقین حاصل ہو جائے طلوع وغروب آفتاب سے پہلے، دوران شب اور دن کے کناروں پر اللہ کی حمد وثنا کیا کرو تاکہ تمہیں مسرت وشادمانی نصیب ہو"۔

ایک عابد منزل بہ منزل اللہ کی طرف بڑھتا ہے۔ جب ایک اِنسان ترک گناہ کے بعد عبادت کو اپنا معمول بنالیتا ہے اور رات کے پرسکون ماحول میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو رفتہ رفتہ دل میں یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اَب میری یہ صدا بے کار نہیں جائے گی، اَب مَیں رب سے قریب ہو گیا ہوں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (سورہ زمر، آیت نمبر 9)

ترجمہ: "کیا وہ شخص جو رات کو قیام وسجود کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، اپنے اعمال سے ڈرتا ہے اور رحمتِ الٰہی کی امید رکھتا ہے اور وہ شخص جو ان صفات سے محروم ہیں، برابر ہو سکتے ہیں؟ اے رسول خاتم النبیین ﷺ انہیں کہہ دو کہ ارباب علم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے اور یہ باتیں دانش مندوں کے لیے بیان ہوتی ہیں" ۔

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے عبادت کو **علم** کہہ دیا ہے۔ **یہ اس لیے کہ علم ایک ایسی قوت ہے جو کائنات کو مسخر کر سکتی ہے اور عبادت وہ توانائی ہے جو حدود زماں و مکاں کو توڑ کر ہمیں رب کائنات کے حضور میں کھڑا کر دیتی ہے۔ علم سے دماغ کو اور عبادت سے رُوح کو نور ملتا ہے۔ فرشتوں پر انسان کی فوقیت علم سے ہے۔ اور انسانوں پر ان کی برتری عبادت سے ہے۔** قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے (سورہ الحجرات، آیت نمبر 13)

ترجمہ: "تم میں سے بڑا اور عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے"۔

جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق، ہر فعل اور ہر قدم ہمارے فائدے کے لیے ہے، یہ بادل، یہ ہوا، یہ درخت، یہ پھل و پھول، یہ اناج، یہ سورج، یہ پانی، یہ آگ، یہ روشنی، یہ خزاں، یہ بہار، یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ جانور، یہ سب ہماری خدمت کے لیے رَبِ کائنات نے بنائے، ہماری جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ اُس ذاتِ باری تعالیٰ نے ہماری روحانی تقاضوں کی تسکین کا بھی انتظام کیا ہے۔

اُس نے سینکڑوں کتابیں، صحیفے اُتارے، لاکھوں نبی بھیجے، اولیا کرام کا ایک تانتا باندھا، جب اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق ہمارے فائدے کے لیے ہے اور اِسی وجہ سے ہم اُسے رَبِّ العالمین، رحیم اور کریم کہتے ہیں تو پھر نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ فیض رساں رحیم اور کریم رب کو انہی لوگوں سے پیار ہو سکتا ہے۔ جن میں رحم، محبت، فیاضی، خدمت اور مروت کے خدائی اوصاف موجود ہوں، فیاض خدا بے فیض انسانوں کو کیسے پسند کر سکتا ہے؟ ساری کائنات سے محبت کرنے والا رَب، ظالم، سنگدل اور جفا کار کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے؟ پاکیزہ، جمیل اور لطیف اللہ کا رابطہ اور دوستی، ناپاک، غلیظ اور بدکار افراد سے کیسے ہو سکتی ہے؟ اِس لیے ہمارے بہترین اعمال ہی وہ رشتہ ہیں جو ہمیں رب کائنات سے منسلک کر سکتے ہیں۔ یہ رِشتہ قائم ہونے کے بعد جہان مخفی کی تمام اچھی طاقتیں (ملائکہ اور ارواح) ہماری مددگار بن جاتی ہیں اور ہر معاملے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ اُمّ موسیٰؑ کا دریا میں بہایا ہوا صندوق ساحل پر لگاتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی ملاقات کا بندوبست کرتی ہیں۔ اِس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم کوئی ایسی حرکت نہ کریں جن سے ان مخفی دوستوں کا مزاج برہم ہو جائے۔ جن لوگوں نے اِس مخفی دنیا سے رابطہ قائم کیا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ اور انبیاء علیہ السلام ان تمام کا تجربہ یہ ہے کہ یہ طاقتیں نیکی سے خوش ہوتی ہیں، اور گناہ سے اِن کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔

ایک حکیم کا قول ہے "بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی مثلاً طنز، ناشائستہ ریمارکس اور مذاق وغیرہ سبھی مضر اثرات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ انعامات ایسے ہیں جو براہ راست ہم تک آتے ہیں مثلاً بارش، ہوا، روشنی وغیرہ اور کچھ انسانوں کی وساطت سے ہمیں ملتے ہیں، مثلاً علم، شفقت اور محبت وغیرہ۔ اللہ سے تعلق قائم کرنے کے بعد صاحب رابطہ اللہ اور اُس کی مخلوق کے درمیان ایک واسطہ یا وسیلہ بن جاتا ہے"۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (سورہ المائدہ، آیت نمبر 35)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو"۔

اِس کائنات میں اتفاق نام کی کوئی چیز نہیں ہے، ہر واقعہ ایک سکیم اور پلان کے تحت ظہور میں آتا ہے، اگر ہم کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہوتے ہیں تو اس کی وجہ طبعی، اِخلاقی یا روحانی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ایک کمزور کشتی کو طوفان امواج میں ڈال دینا، طبعی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اِس کشتی کا ڈوب جانا یقینی ہے۔ آگ میں کودنے کا لازمی نتیجہ جلنا ہے، کیونکہ آگ اور جلنے کا رشتہ بالکل واضح ہے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کچھ ایسے حوادث سے بھی دوچار ہوتی ہے۔ جہاں اعمال

اور نتائج میں کوئی علاقہ قائم کرنا دشوار ہوتا ہے۔فرض کیا ایک دولت مند مردم آزار (لوگوں کو تکلیف دینے ولا بُرا شخص) اپنے اثر ورسوخ اور دولت کی وجہ سے ملک کے قانون کی گرفت سے بچتا چلا جاتا ہے، اور پھر کسی نہ کسی منزل پر اُسے فالج ہو جاتا ہے تو یہ اُسے اُس کے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔لیکن یہ بات ہم اُسے نہیں سمجھا سکتے کہ کس قاعدے سے تمہاری یہ مروم آزاری فالج کی علت بنی ہے۔ ہر بدکار کی زندگی پر ایسے حوادث آئے دن ٹوٹتے رہتے ہیں، کبھی گاڑی کی ٹکر ہوگئی، کبھی پیر ٹوٹ گیا، کبھی بچہ چھت سے گر گیا، کبھی بچہ ڈوب گیا، کبھی فالج گر گیا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔(سورہ النساء، آیت نمبر 62)

ترجمہ:"(نافرمانوں پر) اُن کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی ہے"

گناہ اور دُکھ نیز نیکی اور سُکھ میں کوئی ایسا رشتہ ضرور موجود ہے جو ہم نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہم اُسے سمجھ سکتے ہیں۔اِس زندگی کا سفر اللہ سے شروع ہو کر اللہ ہی پر ختم ہوتا ہے۔اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی انسان کی آخری منزل ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے(سورہ النجم، آیت نمبر 42)

ترجمہ: "تمہاری آخری منزل اللہ تعالیٰ ہی ہے"

کوئی مسافر منزل کے تصور سے غافل نہیں ہوسکتا اور پورا خیال رکھتا ہے کہ راہ سے بھٹک نہ جائے۔زندگی کی شاہراہ پر ہر مسافر کو مختلف قسم کے حوادث پیش آتے ہیں، کبھی سرکش اور نافرمانی پر اتر آتا ہے، کبھی گناہ کے غاروں میں گر جاتا ہے اور کبھی عارضی اور فانی دنیا میں اُلجھ کر منزل سے غافل ہو جاتا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کی ہم پر خاص نوازش ہے کہ اُس نے منزل کی تمام علامات ہمیں بتادی ہیں، پگڈنڈیوں سے خبردار کردیا، غاروں اور گڑھوں کا پتہ بتادیا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ" ہماری جبروت اور عزت کے گن گانے والے اور راتوں کو ہمارے حضور میں گڑگڑانے والے نہ تو راہ سے بھٹکیں گے اور نہ ہی مصائب کا شکار ہوں گے"۔

اللہ تعالیٰ سے رابطے کے لیے بہترین اور مختصر راستہ "ترکِ گناہ" کے بعد "شریعت کی پابندی" کے ساتھ ساتھ "ذکر اللہ" ہے، منطقی طور پر ذکر اللہ اور مسرت میں کوئی رابطہ قائم کرنا ناممکن ہے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ذکر کی صورت میں کرتے ہیں وہ ضرور دولتِ سکون واطمینان سے نوازے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: (سورہ رعد، آیت نمبر 28)

ترجمہ:" یادرکھو کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے-"

ذکرِ الٰہی سے وہ طاقتیں جنہیں ہم ملائکہ کہتے ہیں خوش ہوتی ہیں۔ذِکر اور تقویٰ سے وہ داخلی اِنسان (رُوح) جو اِس جسم خاکی کے غلاف میں لپٹا ہوا ہے، خوبصورت اور لطیف بن جاتا ہے اور فرشتے اِس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ملائکہ چونکہ خود اجسام لطیف ہیں اِس لیے اِن کا رشتہ ہمارے جسم لطیف ہی سے قائم ہوتا ہے۔گناہوں کی وجہ سے جسم لطیف مسخ اور غلیظ ہو جاتا ہے اس سے تعفن کی لپٹیں اٹھتی ہیں اور فرشتے قریب نہیں آتے، اِس لیے نیک لوگوں کے زیادہ تر کام ملائکہ کی مدد سے انجام پاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ جہاد میں جائیں تو فرشتے ساتھ جاتے ہیں (بدر وحنین)

فضاءِ بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اَب بھی

یہ فرشتے نیک لوگوں کو حوادث سے بچاتے ہیں اور کامیابی اور مسرت کی نئی نئی تجاویز ان کے دماغوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔اسباب کی کڑیاں بہم پہنچاتے ہیں۔لوگوں کے دل میں ان کے لیے جذبہ اِحترام پیدا کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جو اِحترام رومیؒ، خیامؒ، شمس تبریزؒ، خواجہ اجمیریؒ، بابا فریدؒ، داتا صاحبؒ اور سید عبدالقادر جیلانیؒ کو مِلا وہ بڑے بڑے شہنشاہ اور فاتح کو بھی نہ مل سکا۔اِس کا مطلب یہ ہے ہوا کہ "ترکِ گناہ"، "شریعت کی پابندیؒ" کے ساتھ "ذکر الٰہی" کا بلند اعمال میں بڑا درجہ ہے۔اِس کے بعد شب بیداری یا سحر خیزی، بلند اعمال میں بڑا مقام رکھتی ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے(سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 79)

ترجمہ:"رات کے ایک حصے میں جاگ کر نماز پڑھا کرو، ہم (بطور صلہ) عنقریب تمہیں ایک مقام پر پہنچادیں گے کہ دنیا اِس کی تعریف کرے گی"-

اِحترام ومحبوبیت کا یہ مقام جلیل شب خیزی کے بغیر میسر نہیں آسکتا۔

تعلق مع اللہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (سورہ مزمل، آیت نمبر 6)

ترجمہ: "(شب خیزی) شب بیداری، نفس کو کچلنے کے لیے بہت مفید ہے اس سے بات میں وزن بھی آتا ہے-"

شریعت کے بعد مرتبہ احسان یا طریقت یا راہِ سلوک یا تصوف میں بھی اللہ سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ اِس لیے کہ رابطے کے بے شمار فائدے ہیں۔

(1) ہدایت (2) قبولِ دُعا (3) فراخی رزق (4) دُکھ سے نجات (5) بات میں وزن (6) شخصیت میں کشش (7) دانش یا عقلمندی (8) حفاظت (9) ملائکہ کی دُعائیں

(1) **ہدایت**

ہدایت سے مُراد دماغ میں ٹھیک تجویز کا القا ہے۔ اعمال کی دو اقسام ہیں (1) مفید (2) مضر

اگر اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت عمدہ تجاویز دماغ میں آتی ہیں۔ جن کا نتیجہ لازماً بہتر نکلتا ہے۔ اور اگر سیاہ کاری یا گناہوں کی وجہ سے رابطہ قائم نہ ہو تو پھر شیاطین کی طرف سے تجاویز آتی ہیں اور ان کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہی نکلتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورہ النساء، آیت نمبر 175)

ترجمہ: "تو وہ جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کی رسی مضبوط تھامی تو عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف سیدھی راہ دکھائے گا"۔

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے (سورہ الحج، آیت نمبر 54)

ترجمہ: "یقیناً اللہ ایمان والوں کو راہ راست کی طرف رہبری کرنے والا ہے"۔

(2) **قبولِ دُعا**

نیک آدمی کی ہر جائز دُعا قبول ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورہ المومن (سورہ غافر)، آیت نمبر 60)

ترجمہ: "مجھ سے دعا کرو میں دعا قبول کروں گا"۔

جبکہ کافروں کی دعا قبول نہیں کی جاتی ہے- قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورہ رعد، آیت نمبر 14)

ترجمہ: "کافروں کی دُعا اور پکار اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے"۔

(3) **فراخی رزق**

رزق فراخ ہوتا ہے تو زندگی چین سے گُزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت عامہ یہی ہے کہ اُس کے محبوب بندے فقر و فاقہ کے شکار نہیں ہوتے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ فاروقؓ، حیدرؓ، دنیاوی نعمتوں کی پرواہ نہ کریں اور جو کچھ ہاتھ آئے خواہ وہ کسریٰ کے لامحدود خزائن ہی کیوں نہ ہوں فوراً اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیں۔

(4) **دُکھ سے نجات**

ایک مسلمان تو مسلمان، یورپ کے غیب بینوں نے بھی اس حقیقت کو پا لیا ہے کہ گناہ دماغی پریشانی اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اگر زندگی سے گناہوں کو نکال دیا جائے تو نہ پریشانی رہے گی اور نہ بیماری۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (سورہ الانبیاء، آیت نمبر 88)

ترجمہ: "تو ہم نے اس کی (ذوالنون کی) پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچا لیا کرتے ہیں"۔

(5) **بات میں وزن**

دُنیائے اِسلام میں اہلِ علم تو لاکھوں ہوئے ہیں لیکن جو مقبولیت رومیؒ، غزالیؒ، سعدیؒ، اِمام ابوحنیفہؒ، اِمام مالکؒ، اِمام شافعیؒ، اِمام احمد بن حنبلؒ، علامہ اقبال جیسے اہلِ دِل کے کلام کو حاصل ہوئی دوسروں کو نہ مِل سکی کیوں؟

بات یہ تھی کہ اُن کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے تھا اور جب اللہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اُس کی بات میں تاثیر رکھ دیتا ہے اور لوگ اُن کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

(6) **شخصیت میں کشش**

کردار پاکیزہ ہوتو صاحبِ کردار میں ایک مقناطیسی کشش پیدا ہوجاتی ہے جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ کشش عبادت کرنے سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اگر یہی عبادت بہت زیادہ ہوجائے تو عابد مقبول خلائق بن جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خواجہ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ اجمیریؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاؒ، داتا گنج بخشؒ کے مزارات پر جایئے اور پروانوں کے عشق اور ہجوم کا اندازہ لگایئے۔

(7) **دانش یا عقلمندی**

نیک لوگوں کو علم و دانش کی دولت عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اِرشاد فرماتے ہیں (سورہ القصص، آیت نمبر 14)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو علم و حکمت سے نوازا اور ہم نیک لوگوں کو اِس طرح اجر دیا کرتے ہیں"۔

(8) **حفاظت**

نیک انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے اور اِس کے بعد نہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے اور نہ کسی مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور نہ ہی اُسے سانپ ڈس سکتا ہے۔ سانپ کیسے ڈسے گا۔

شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے "اگرچہ تیر کمان سے گزرتا ہے لیکن دانش مند کو تیر کے پیچھے ایک کمان اور کمان کے پیچھے ایک کمان والا بھی نظر آتا ہے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے ایک مرتبہ پوچھا تھا "جب اللہ تعالیٰ کے تیر مرض، تیر مرگ، تیر غم و حادثہ چاروں طرف چل رہے ہوں تو اِن سے بچنے کی تدبیر کیا ہو سکتی ہے"؟ اِس سوال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا "اِن تیروں سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے کہ آدمی تیر انداز کے پہلو میں آجائے"۔

مندرجہ بالا باتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ نیک لوگ بیماری، حادثہ یا کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں تو یہ سب کچھ اُس بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے، کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (سورہ البقرہ، آیت نمبر 155)

ترجمہ: "اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو"۔

(9) **ملائکہ کی دُعائیں**

نیک لوگوں کے لیے فرشتے بھی دُعائیں مانگتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ (سورہ مومن، آیت نمبر 9-7)

ترجمہ: "عرش کو اٹھانے والے اور اُس ماحول کے دیگر فرشتے حمد خداوندی کے گیت گاتے ہیں اور اُس پر ایمان لاتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے یوں دُعا مانگتے ہیں۔ اے اللہ! تیری رحمت اور تیرا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔ تو اُن لوگوں کی خطائیں معاف کر جو گناہ سے تائب ہونے کے بعد تیری راہ پر چل پڑے ہیں، انہیں عذابِ جہنم سے بچانا اور جنتِ عدن میں پہنچا کہ تُو نے اُن سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ان کے ہمراہ ان کے نیک آباؤ اجداد، بیویوں اور بچوں کو بھی جگہ دے کہ تُو ہر چیز پر غالب اور صاحبِ حکمت ہے۔ ان لوگوں کو گناہوں سے دُور رکھ، آج اِس دنیا میں تُو نے جس شخص کو گناہ سے بچا لیا۔ اُس پر بڑا کرم کیا کیونکہ گناہ سے بچنا بہت بڑی کامیابی ہے"۔

یہ بات بارہا تجربے میں آتی ہے کہ کبھی کسی چیز کا شوق بڑھ جاتا ہے اور کبھی گھٹ جاتا ہے۔ ایک نمازی کو اس نشیب و فراز سے بارہا واسطہ پڑتا ہے کہ کبھی تو رات کی تہجد بھی قضا نہیں ہوتی اور کبھی فجر بھی قضا ہوجاتی ہے۔ اس شوق اور بدشوقی کا تعلق اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ ملائکہ اور شیاطین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں ہر وقت مصروف ہوتی ہیں۔ اور ہر طاقت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری طاقت کے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ ورغلائے۔ اور اس مقصد کے لیے دونوں طاقتیں اپنا پورا زور لگاتی ہیں۔

جب کوئی اللہ کی طرف چلا جاتا ہے تو شیاطین زیادہ طاقت ور لہریں اُس کی طرف چھوڑتے ہیں، جس سے اُس آدمی میں شوق عبادت کم ہوجاتا ہے۔ اِس پر فرشتوں کی صف میں ایک بے چینی پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی لہروں میں زیادہ توانائی بھر دیتے ہیں، جس سے اُس آدمی کے شوق کی آگ دوبارہ بھڑک اُٹھتی ہے، اور یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

****

اطاعت الٰہی

اطاعت الٰہی یہ ہے کہ بندہ خود کو بلکہ اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تابع کر دے۔ یہ اتباع ایک یا دو معاملوں میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں ضروری ہے تاکہ محب کی پوری زندگی حکم الٰہی کے اتباع میں رنگ جائے۔ اگر انسان کی زندگی حکم الٰہی کے تابع رہے تو اسے اطاعت الٰہی کہا جائے گا۔

قرآن پاک میں اس اطاعت کا ذکر یوں ہے، (سورہ توبہ، آیت نمبر 111)

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال خرید لئے ہیں"۔

جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال خرید لئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ اللہ کے حضور بِک گیا، جب مالک حقیقی نے سب کچھ خرید لیا تو اب بندے کا اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔ یعنی بندہ مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف اپنی آرزو، اپنی تمنا، اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنے قول و فعل کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ جو خود بِک گیا تو پھر تو اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانیں قربان کرنے کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے شیخ ابو طالب مکیؒ اپنی کتاب "قوت القلوب" میں فرماتے ہیں ''چنانچہ اہل محبت نے اپنے اموال کو جانوں میں داخل کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں فروخت کر دیا اور اس کی محبت کی خاطر سب کچھ بیچ دیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں عمدہ قرار دے کر خرید لیا'' اب محبت کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جان و مال خرید لیا اور فروخت کی علامت یہ ہے کہ ان سے ان کے جان و مال الگ ہو گئے اور اب اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے دلوں میں کچھ خواہش نہ رہی۔

اس آیت کریمہ میں اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْن میں ایک اور ارشاد بھی موجود ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جس سے اس کی جان و مال خریدتا ہے وہ مومن ہوتا ہے کیونکہ وہ خریدتا ہی مومن سے ہے۔ اور جو مومن اللہ کی راہ میں بک گیا وہ اسی لمحہ حیات جاوید پا کر انمول ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جو خوش نصیب اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا عزیز ہو کہ اللہ اس کا خریدار بن جائے، اور اس کی ہر شے کو اپنے قبضہ قدرت میں لے کر اپنا بنا لے تو اسے دنیا کی کونسی طاقت دوبارہ خرید سکتی ہے؟ جبکہ عالم امکان میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور بِکے ہوئے لوگوں کو دنیا کے سب خزانے لُٹا کر بھی کوئی اور خرید سکے۔

جب تک بِکے نہ تھے کوئی پوچھتا نہ تھا
تو نے خرید کر ہمیں انمول کر دیا

مراد یہ ہے کہ جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور نہیں بِکتا بے قیمت رہتا ہے، مگر جب وہی بندہ اللہ تعالیٰ سے لو لگا لیتا ہے، اور اپنی ہستی کو اپنے خالق کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، تو اس کی قیمت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اگر ساری دنیا ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور اسے دوسرے پلڑے میں، تو بھی اس کا پلڑا بھاری رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی نظر میں مقبول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب ہو گئی، وہ اگر معمولی بھی ہو تو انمول اور بے بدل بن جاتی ہے۔ اب جب بندے نے اپنا سب کچھ بیچ دیا اور رب نے سب کچھ خرید لیا، اور اب رب کی مرضی چاہے صحت مند رکھے یا بیماری میں مبتلا کر دے، چاہے بے حساب نعمتیں دے چاہے تنگ دستی دے۔ چاہے ہنسائے چاہے رُلائے۔ الغرض جس حال میں اس کا رب رکھتا ہے، بندہ مومن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو یہی ہے کہ اس کا فرمانبردار بن جانا، ہر حکم ماننا، اب اللہ تعالیٰ حکم دینے والے ہیں حکم کبھی کسی کام کو کرنے کے لئے دیا جاتا ہے، اور کبھی کسی کام کو کرنے سے منع کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ یعنی ''اوامر'' بھی ہیں (کسی کام کو کرنے کا حکم) اور ''نہی'' بھی یعنی (کسی کام کو کرنے سے منع کرنے کا حکم) یعنی کبھی یہ آتا ہے اے بندے فلاں کام کرنا ہے اور کہیں یہ حکم ہے کہ اے بندے اس کام کو مت کرنا رُک جا۔ اس لئے جس کام کو کرنے کے لئے کہا گیا ہے اس کو کرنا، اور جس کام کو کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے رُک جانا اطاعت الٰہی ہے۔

ترک نواہی کمال اطاعت ہے:

یہاں خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اطاعت میں حکم کی تعمیل قدرے آسان ہے، لیکن وہ چیزیں جن سے عمر بھر کے لئے منع کیا گیا ہو، اس سے رُک جانا خاصا مشکل

ہے۔اس لئے عارفین کا قول ہے''اطاعت تو حکم کی تعمیل ہے اور کمال اطاعت یہ ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے زندگی بھر اس کی طرف قدم نہ اٹھائے''
چنانچہ شیخ ابو طالب مکیؒ کسی بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں کہ''افضل ترین نیکی یہ ہے کہ انسان نیکیوں پر استقلال دکھائے ،اور نیکی پر استقلال دکھانا نیکی کو ستر گنا تک بڑھا دیتا ہے۔لیکن برائیوں سے پرہیز استقلال دکھانے سے سات سو گنا زیادہ اجر رکھتا ہے، گویا وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے قائم مقام ہے۔اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک امتحان میں ڈالا گیا ہے،اور اس پر نفس کا دباؤ یعنی جہاد اکبر سے گزرنا پڑا۔مگر جب اس نے خواہش کو ترک کیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا،اس وجہ سے اس کی نیکیوں میں سات سو گنا اضافہ ہو گیا،اور اس کی محبت ثابت ہوگئی۔ارشاد خداوندی ہے(سورۃ الرحمن،آیت نمبر 46)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝

ترجمہ:"اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں"-

اطاعت محبت کی اولین پہچان:

جس طرح محبت کی پہچان محبوب کی یاد یعنی کثرت ذکر ہے اس طرح خالص محبت کی پہچان محبوب کی اطاعت ہے۔اور اطاعت کا تقاضہ یہ ہے کہ محبوب کی پسند پر اپنی پسند کو قربان کر دیا جائے۔جو لوگ محبوب کی پسند کو اپنی پسند پر قربان کرنا نہیں جانتے وہ دعویٰ محبت میں جھوٹے ہوتے ہیں۔اگر کوئی شخص نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا دعویٰ کرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ دار ہے تو اس کا دعویٰ اطاعت ومحبت باطل ہوگا۔
اس بات کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود واضح کیا ہے:(سورۃ البقرہ آیت نمبر 8)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ:"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر،اور نہیں وہ ایمان لانے والے"-(یعنی نہیں وہ ایمان لائے)

کیوں ایمان نہیں لائے؟اس لئے کہ وہ صرف اللہ اور آخرت پر ایمان لا رہے ہیں۔نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی ذات وبابرکات کو درمیان میں سے نکال کر ایمان لا رہے ہیں،اور جب آپ خاتم النبیین ﷺ کی ذات کو درمیان میں سے نکال دیا جائے تو کونسا ایمان؟اور کہاں کا ایمان؟
اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے(سورۃ آل عمران،آیت نمبر 31)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

ترجمہ:"اے محمد(خاتم النبیین ﷺ)ان سے کہہ دیں"اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو،تو میری پیروی کرو،(میری اتباع کرو)پس اللہ اُن سے محبت کرے گا"۔
غرض حکم محبوب کے مقابلے میں اپنی پسند کو قربان کرنا اگرچہ اطاعت کا بنیادی تقاضہ ہے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔نفس انسانی کئی قسم کے حیلے بہانے بناتا ہے مثلاً یہ کہ کاروبار میں معمولی سے ہیر پھیر سے لاکھوں روپے کی آمدنی زیادہ ہو جائے گی۔انسان دل میں سوچتا ہے کہ کوئی بات نہیں بس ایک جھوٹ ہی تو بولنا ہے ،ہزاروں کا فائدہ ہو جائے گا۔اور کونسی چیز خالص مل رہی ہے جو صرف میری دیانت داری سے فرق پڑ جائے گا۔غرض نفس بہکاتا ہے کہ ساری دنیا ایسا کر رہی ہے تم کر لو گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔
کسی شخص کی محبت اور اطاعت کو پرکھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ ایک طرف مال ودولت کے ڈھیر،امارت دلفریبیاں،جاہ ومنصب،عزت اور اقتدار ہو اور دوسری طرف اپنے رب کی رضا،اس کی محبت،اس کا خوف اور اس کا جذبہ اطاعت اسے ان چیزوں سے بے نیاز کر رہا ہو اور وہ ان تمام رغبتوں کو ٹھکرا کر اپنے اللہ کی محبت کو اپنا لے۔
کامل اور سچے محب کی شان یہ ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی رغبت کو جو اسے اپنے محبوب کی اطاعت سے باز رکھے،حقارت سے ٹھکرا کر اپنے محبوب کی رضا جوئی کے لئے ہمہ وقت مستعد رہے اور زبان حال سے کہتا رہے''اے اللہ میں یہ سب کچھ تیری رضا کے لئے چھوڑتا ہوں''
علامہ اقبال نے اس لئے توحید کا یہ معیار بیان کیا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے تھا

ماسوائے اللہ کے ایسی بے نیازی صرف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی شان ہے ورنہ ہر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات اس وقت تک سمجھ میں بھی نہیں آتی جب تک کوئی اللہ کا بن کر اس کے ہاتھ فروخت ہو کر نہ دیکھے۔ اس سے آشنائی کی لذت سے لطف اندوز نہ ہو جائے۔ اور اپنے تن من میں اس کی اطاعت کا جذبہ طاری نہ کرے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے یہ لذت آشنائی

جب یہ لذت آشنائی نصیب ہو جاتی ہے تو بندہ خود بخود ''توکل علی اللہ'' کے عالی درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔

ایسے ایمان والوں کے لئے فرمایا گیا ہے، (سورہ انفال، آیت نمبر 2)

وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ۝

ترجمہ: "اور وہ صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بعد کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی رب کا مطیع بندہ یا دنیا کا مطیع۔ پس یا تو اللہ تعالیٰ کو منا لے، یا دنیا کے جھوٹے بتوں کے آگے جھک جائے، یعنی مال و دولت کی حرص اور دنیا طلبی کی لالچ میں اہل دنیا کی پیروی کر یا اللہ کی محبت اور اطاعت کا راستہ اختیار کر۔ اگر اہل دنیا کی بجائے رب کو اپنا بنا لیا تو اس کے ہاتھوں اپنی ہستی کا سودا کر دیا۔ اور پھر اس کی اطاعت میں اپنے آپ کو غرق کر دیا تو یہ دنیا اور اس کی تمام مخلوق خود بخود پیچھے دوڑنے لگے گی۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

آج کچھ لوگ محبت کے بغیر اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کے خیال میں اطاعت خود محبت اور عشق ہے۔ مزید محبت کی ضرورت کیا ہے؟ بس یہاں انسان ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی نوکر، ملازم، ڈرائیور، مالی، چوکیدار ہے حکم تو وہ بھی مانتا ہے، ہمارے اشاروں پر چلتا ہے، مگر اس کا محرک محبت نہیں بلکہ وہ اُجرت ہے جس کے عوض وہ ہمارے ہاں کام کرتا ہے۔ حکم کی تعمیل اطاعت تب گنی جاتی ہے جب سر کے ساتھ دل بھی جھک جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ سر سے پہلے دل جھکے، اور دل کا جھکنا سر کو جھکنے پر مجبور کر دے۔ اور یہ بات محبت کے بغیر ہرگز ممکن نہیں بن پاتی، اس لئے کہ دل پر کسی کا زور نہیں اور یہ دل نہ تو دنیا اور قانون کے تقاضے جانتا ہے۔ اور نہ ہی خوف اسے کسی بات پر مجبور کر سکتا ہے۔ دل صرف اور صرف جذبہ محبت کو جانتا ہے اور جذبہ محبت سے ہی کسی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اطاعت جو انسان کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ بنا دے اور اس کے لئے قرب الٰہی کا ذریعہ بن جائے وہ محبت سے کی ہوئی اطاعت ہوتی ہے۔ اور ایسی اطاعت اور فرمانبرداری جس میں جذبہ محبت نہ ہو بلکہ کوئی خارجی سبب ہو وہ منافقت اور فریب ہے۔

شوق میرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

مدینہ طیبہ میں منافقین نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ باقاعدہ نمازیں پڑھتے تھے۔ لیکن ان کی اطاعت اور صحابہ اکرامؓ کی اطاعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

جب سر کے ساتھ دل بھی جھک جائے تب اسلام سے ایمان تک کا سفر طے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت خضرؑ حضرت بشر حافیؒ کے پاس تشریف لائے، بشر حافیؒ نے پوچھا" آپ کون ہیں"؟ فرمایا" میں خضر ہوں" عرض کیا" میرے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کیجئے"۔ حضرت خضرؑ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں دعا کی، "اے باری تعالیٰ تو اپنی اطاعت کو بشر پر آسان کر دے" حضرت بشر حافیؒ نے دوبارہ درخواست کی ایک دعا اور فرمائیں، حضرت خضر علیہ السلام نے دعا کی "اے باری تعالیٰ یہ جتنی اطاعت کرے اسے اس کی نظروں سے اوجھل کر دے"۔

اس لئے کہ اگر بندے کو اپنی اطاعت دکھائی دیتی رہے تو وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں مطیع ہو گیا ہوں۔ جوں ہی یہ خیال آیا اطاعت جاتی رہی کیونکہ اطاعت پر نظر تکبر کو جنم دیتا ہے۔ اور تکبر ہر نیکی کو ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا صرف وہی اطاعت انسانی سیرت و کردار کی تعمیر اور روحانی ترقی کا باعث بنتی ہے جو انسان کی نظروں سے اوجھل رہے۔ بندہ جوں جوں اطاعت کرتا جائے یہی سمجھے کہ ابھی کچھ نہیں کر پایا، پس یہی فکر رہے تو اطاعت میں اثر پیدا ہو گا اور انسان روحانی منازل طے کرتا رہے گا۔ جس لمحے اس کے شعور میں یہ بات آ گئی کہ اب میں مطیع ہو گیا ہوں، اسی لمحے' وہ اطاعت اور بندگی رعونت اور تکبر کا باعث بن جائے گی اور انسان نفس کے ہاتھوں ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔ اس لئے اطاعت الٰہی کا محرک خوف نہیں بلکہ محبت ہونا چاہئے۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ خوف الٰہی بھی تو جزو ایمان ہے اور ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ

تعالیٰ سے ڈرتا رہے کیونکہ اللہ سے ڈرنا ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔اور خوف الٰہیٰ کا ثمر بھی دوسری تمام نیکیوں سے زیادہ ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:(سورۃ الرحمن،آیت نمبر 46)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ

ترجمہ:"اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں"۔

اب اگر خوف الٰہیٰ کی اتنی اہمیت ہے تو اطاعت کا محرک ہم محبت کو کیوں قرار دے رہے ہیں خشیت کو کیوں نہیں؟اس نکتے کی وضاحت کے ضمن میں خوف الٰہیٰ کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

خوف الٰہیٰ کا مفہوم:

اہل محبت کے ہاں خشیت الٰہی محبت کا حجاب ہے،اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اور ہمہ وقت اس کی رضا کے طلب گار رہتے ہیں، وہ اس کی بندگی اس کے خوف کی وجہ سے نہیں کرتے،وہ تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں،اور محبت ہی ان کی بندگی کا محرک ہوتا ہے۔انہیں نہ تو جنت کا لالچ ہوتا ہے اور نہ دوزخ کا ڈر ہوتا ہے،کہ اللہ کے عذاب سے خوف زدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں۔وہ اللہ سے ڈرتے ضرور ہیں مگر یہ خوف ایسا ہوتا ہے جیسے ایک محب اپنے محبوب سے ڈرتا ہے۔کہ کہیں کسی وجہ سے محبوب ناراض نہ ہو جائے،اس کی پیشانی پر کہیں شکن نہ آ جائے۔کہیں محبوب مجھ سے منہ نہ موڑ لے۔الغرض اہل محبت کو زیادہ سے زیادہ اسی نوعیت کا خوف ہوتا ہے۔ان کے نزدیک باقی ہر قسم کا خسارہ اور نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے،لیکن محبوب کی ناراضگی ان کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرنا کیا ہے؟یہ اللہ کے خاص اور مقرب بندوں کا احساس ندامت ہے،وہ اپنے محبوب کے سامنے اپنے آپ کو اس قدر ہیچ سمجھتے ہیں،کہ اس کے سامنے آنے سے بھی ڈرتے ہیں۔حالانکہ ان کے دلوں میں محبوب حقیقی کے لئے محبت کے الاؤ بھڑک رہے ہیں،جو انہیں دیدار کے لئے ہمہ وقت مضطرب کئے رکھتے ہیں۔وہ اگر محبوب کو یاد بھی کرتے ہیں،تو ڈرتے ہیں کہ کہیں محبوب کی بارگاہ میں گستاخی نہ ہو جائے۔یہ خوف انہیں کسی عذاب کے ڈر کی وجہ سے نہیں ہوتا،بلکہ محبوب کی عظمت شان کے پیش نظر اپنی کم مائیگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہل اللہ جو کامل اطاعت کرنے والے ہیں،وہ اطاعت محبت کی وجہ سے کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی محبت کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔گویا خوف الٰہیٰ بھی محبت کی ایک قسم ہوتی ہے۔اس لئے جب اطاعت کا محرک بھی محبت ہو اور خشیت الٰہیٰ کا محرک بھی محبت ہو،تو پوری زندگی نہ اطاعت میں دشواری آتی ہے اور نہ حصول تقویٰ میں کوئی رکاوٹ حاصل ہوتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہل محبت کی اطاعت کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اسے محبوب کا قرب نصیب ہو،جبکہ محبت سے خالی اطاعت کرنے والا کسی نہ کسی اُجرت اور دنیاوی یا آخروی طلب کے پیش نظر اطاعت کرتا ہے۔اہل محبت اور اہل عشق تو اس عبادت کو شرک تصور کرتے ہیں،جس کا مقصد خالق کی رضا کے حصول کے سوا کچھ اور ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطاعت کرنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں،

1) ایک وہ اُجرت پاتے ہیں

2) ایک وہ جو قربت چاہتے ہیں

اُجرت اور قربت میں بڑا فرق یہ ہے کہ:

1) اُجرت میں حساب رکھا جاتا ہے،اور ہر کام کرنے والے کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی اس نے محنت کی ہو،مگر قربت میں حساب اٹھا لئے جاتے ہیں۔

2) اُجرت میں محنت کرنے والا بھی اپنی محنت کا حساب رکھتا ہے اور اجر دینے والا بھی اس کو اسی حساب سے اجر دیتا ہے،مگر قربت میں نہ محنت کرنے والا حساب رکھتا ہے اور نہ اجر دینے والا حساب سے دیتا ہے کہ اس کو عطا کرتے ہوئے اس کی محنت کو مدنظر رکھتے ہوئے معاوضہ دے۔محبت کرنے والا نہ حساب دکھاتا ہے اور نہ دینے والا اس سے حساب کا مطالبہ کرتا ہے۔اسی لئے جو لوگ محبت میں اطاعت کرتے ہیں وہ قربت پاتے ہیں اور جو کسی منفعت میں اطاعت کرتے ہیں وہ اجرت پاتے ہیں۔

قربت چاہنے والے اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ کام کرنے سے مجھے اتنی نیکیاں ملیں گی اور میرے اتنے درجات بلند ہوں گے۔یہ دوگنا،دس گنا،ستر گنا کے فائدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔کیونکہ وہ ثواب لینے کے لئے عمل نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کرتے ہیں رب کی رضا اور خوشنودی کے لئے کرتے ہیں۔رب کی رضا کے حصول کے لئے یہ جو اعمال کرتے ہیں اس پر یہ ثواب اور عذاب کا تصور نہیں کرتے۔

جو اطاعت کے بدلے میں اجر مانگے گا اسے اسی قدر اجر دیا جائے گا۔ اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی پارسا کیوں نہ ہو، اسے اپنی اطاعت اور اعمال کے قبول ہونے کا یقین نہیں ہونا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ جس اطاعت کے عوض اس نے جنت طلب کی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہی نہ ہوئی ہو۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ اطاعت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے قرب کا متلاشی ہونا چاہئے۔ قرب کا طلب گار بندہ اپنی اطاعت پر فخر محسوس نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ اس کی غلطیوں پر درگذر فرماتے ہیں۔

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہئے
کہ دانہ خاک میں مل کر گُل و گلزار ہوتا ہے

اگر ہم صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے تو وہ ہمیں اپنی قربتوں سے نوازے گا۔ اور اگر قربت حاصل ہوگئی تو کائنات کے تمام اجر ہمارے قدموں میں آجائیں گے۔ پھر دنیا بھی ہماری اور آخرت بھی ہماری۔ جو اللہ کا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تمام چیزیں اس کی ہوجاتی ہیں۔

ایک بہت کامل صوفی بزرگ گزرے ہیں، جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا اور حجاب اٹھادیئے گئے تو کچھ دیر پہلے جنت دکھادی گئی۔ ارشاد ہوا،

ترجمہ: ''اے بندے تو زندگی بھر میری اطاعت کرتا رہا دیکھ تیرا ٹھکانہ یہ ہے''۔

حالت نزع میں جنت کو دیکھ کر ایک شعر ان کے منہ پر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے، ''مولا میں نے زندگی میں جو کچھ کیا تو اس کا اجر جنت کی صورت میں دینا چاہتا ہے، اگر ایسا ہی ہے تو میری پوری زندگی ضائع ہوگئی، تیری عزت کی قسم میں نے کوئی بھی عمل جنت کے لئے نہیں کیا میں اجرتوں کا خواہاں نہیں ہوں میں تو تیری قربت کا طلب گار ہوں"۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ پردہ حائل ہوگیا، اور جب دوبارہ اٹھا تو 'حُسن الٰہی' کا جلوہ نظر آیا، اور اس کے ساتھ ہی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اللہ کے بندے نے جو چاہا تھا اسے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ کے بندے کو آخری وقت تک آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، کہ یہ بندہ اجرت کا طلب گار ہے یا اسے میری محبت اور قربت عزیز ہے۔ قربت والوں کو اللہ تعالیٰ ان گنت نوازشات سے بہرہ ور فرماتا ہے، کیونکہ وہ اپنے اللہ سے سوائے دیدار کے اور کچھ نہیں چاہتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اس کی رضا اور اس کے فضل کے ہر وقت طلب گار رہتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: (سورۃ الحشر آیت نمبر 8)

يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً

ترجمہ: "وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل اور رضا کے طلب گار ہیں"۔

یہ ہاتھ باندھ باندھ کر اپنے رب کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں، رُو رُو کر منہ تر کرتے ہیں، کبھی قیام، کبھی رکوع اور کبھی سجود میں پڑے رہتے ہیں۔ کبھی سسکیاں لیتے ہیں، اور کبھی روتے ہیں کبھی تڑپتے ہیں، کبھی بلکتے ہیں یہ سب کچھ کیوں؟

فقط اس لئے کہ محبوب اپنی قربتوں سے نواز دے۔ حتیٰ کہ محبوب کی رضا کے لئے جان کا نذرانہ تک خوشی سے پیش کرتے ہیں اور پھر بھی احسان نہیں جتلاتے اور کہتے ہیں۔

جان دِی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

****

رضائے الٰہی

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورۃ الفجر آیت 30-27)

ترجمہ: ''اے نفس مطمئنہ لوٹ چل اور واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا''۔

وقت نزاع کا خطاب

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس کی موت ونزاع کے وقت خطاب کیا جائے گا جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے جیسے شرعی خطابات زندگی میں کیے گئے ہیں۔ یہ زندگی کے خاتمے کا وقت کا خطاب ہے جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔

ملک الموت دو قسم کے ہیں ایک اصحاب یمین اور ایک اصحاب شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بیضن الوجود ہیں، یعنی سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے، تاریک اور سیاہ اور ڈراؤنے ان کے چہرے ہوں گے۔ مومن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحاب یمین کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''بندہ جس کی موت قریب آ چکی ہے یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر سینکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں، وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں اسے ایک قسم کا اندیشہ پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحاب یمین اور ملک الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔ دور سے اس لیے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے نئے عالم کی مخلوق سامنے آ رہی ہے ایک دم سامنے آنے سے کہیں مومن گھبرا نہ جائے۔ اس لیے پہلے دور بیٹھ کر اپنا جمال دکھاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ قریب ہوتے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ انس پیدا ہو۔ یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر عالم تحیر طاری ہے کہ یہ سورج اور چاند ہیں کیا چیز؟

یہاں تک کہ بالکل قریب آ جاتے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض روشنیاں نہیں ہیں بلکہ ان کی شکل وصورت سب نمایاں ہو کے سامنے آ جاتی ہیں وہ اس مومن کے ساتھ نہایت ہی خاطر مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کر دیں بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پاک روح اور نفس نکل اس بدن سے کہ تو نے اپنے عمل سے اِسے پاک بنا دیا تھا، تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک، کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں، نعمتوں، آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب ناک نہیں ہوگا بلکہ رحمت کرنے کے لیے تیار ہے اس طرف چل۔ یہ گویا ایک قسم کا واعظ ہوتا ہے جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں پھر اس دنیا کی گندگی اور برائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا تھا، پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم والم اور نہ پریشانی ہے بلکہ بشارتیں، راحتیں اور انبساط ہیں۔ ادھر چل اور اخیر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی۔ محنتیں کیں، اب وہ نتیجہ قریب آ رہا ہے۔ یہ ایک وعظ وترغیب ہے تاکہ مومن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرنا آسان ہو جائے، دوسرے عالم کی طرف نکلنا سہل ہو جائے، یعنی ملائکہ، موت، مومن کو ترغیب دے کر آخرت کیلئے آمادہ کرتے ہیں۔ غرض پہلے دنیا کی برائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں مگر طبعی طور پر موت انسان کو شاق ہے کہ عالم سے نکل کر جس میں پچاس، ساٹھ، ستر برس گزارے ہوں، دوسرے عالم میں جائے۔ اس لیے جیسے بدن کو چھوڑنا بھاری ہے، اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے، اس لیے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت گوارا نہیں کرتی، لاکھ بشارتیں دی جائیں، نعمتوں کا پیغام سنایا جائے مگر وہ طبعی کراہت اور جھجک غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔ بعض طبائع تو وہ ہیں جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فارغ بنا لیا تھا، فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

مومن کو عند الموت حق تعالیٰ براہ راست بھی خطاب فرماتے ہیں

حدیث میں موت کی تمنا کی مخالفت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا ''کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے''۔ (صحیح بخاری)

اس لیے کہ موت آ کر زندگی کے عمل کو قطع کر دے گی، جتنی زیادہ زندگی نیکی کے ساتھ گزرے اتنی بہتر ہے۔ اس لیے موت کی تمنا مت کرو۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے: (سورہ جمعہ، آیت نمبر 6)

ترجمہ: ''اے یہود! اگر تمہیں اولیا اللہ اور ولی کامل ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ''۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کی تمنا مومن ہونے اور ولایت کا خاصہ ہے۔ اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے بظاہر ایک تعارض سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو، ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو، یہ دو باتیں آپس میں ٹکرا گئیں لیکن ایک دوسری حدیث میں اس مضمون کو صاف کر دیا گیا تو فرمایا گیا'' کوئی شخص کسی مصیبت سے اکتا کر موت کی تمنا نہ کرے'' (بخاری) یہ بے صبری ہے اور اللہ پر بے اعتمادی کی علامت ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کہے کہ موت ہی کیوں نہیں آجاتی۔ اگر موت آجائے اور وہاں پر مصیبت ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا، یہ نعمت خداوندی کو ٹھکرانا ہے، بے صبری ہے اس کی مخالفت ہے۔ لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا ہو تو عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش، داڑھی کا ایک ایک بال کھلا ہوا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوشی ان کے دل سے ابلی پڑتی تھی۔ فرمایا ''کل انشاءاللہ حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ اور ان کے اصحابؓ سے ملاقات ہوجائے گی اس کی خوشی ہے''۔ یہ خوشی عین مطلوب ہے اس کے لیے اگر موت کی تمنا ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔ البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا یہ خلاف مطلوب ہے۔ بہر حال ولایت جب کامل ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔

حدیث پاک ہے'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے دعا فرمائی اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت پیدا کر دے جو میرے نبی اور رسول ہونے کا قائل ہے'' اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی کہ ''موت مومن کے لیے تحفہ ہے جو ایک عاشق کو اس کے محبوب تک پہنچاتا ہے اگر عاشق ہو تو محبوب کے پاس جانا مطلوب ہوتا ہے یا مکروہ؟ جو عاشق خداوندی ہے اس کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کی تمنا ہوگی اور اللہ سے نہیں مل سکتا جب تک بیچ میں موت نہ آئے تو موت درمیانی واسطہ ہے اس واسطے کے بغیر محبوب سے نہیں مل سکتا۔ بہر حال جب ولایت ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو واقعی موت کے شائق ہیں لیکن ہم اور آپ جیسے جن کو طبعاً موت مکروہ ہے۔

ملائکہ علیم السلام اور ملک الموت آکر انہیں موت کی ترغیب دیتے ہیں کہتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔ اس عالم کی طرف چلو جہاں روح و ریحان ہے اور اس رب کی طرف چلو جو کبھی نامہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دوامی ہوگی۔ جب اس کے دل میں انعام کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہوجاتا ہے۔ پھر نزع شروع ہوجاتا ہے لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آمادہ کر کے نکالنی ہے۔ گویا ظاہری طور پر جبراً اس کو کھینچنا نہیں ہے یہ مومن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔ تو حدیث میں ہے'' اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لا کر دکھلاتے ہیں یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں ان کو دیکھ کر پھر مومن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کرنے کا جوش پیدا ہوتا ہے'' حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ'' پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم الٹا کر دو تو غرغر کر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے اس وقت یہ کہا جاتا ہے

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ (سورۃ الفجر، آیت نمبر 30-27)

ترجمہ: "اے اطمینان والی روح تو اپنے رب کیطرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں چلی جا"۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ

ترجمہ: "اے نفس مطمئنہ آ"۔

اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے

ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً

ترجمہ: "لوٹ اپنے رب کی طرف کہ خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی"۔

یہ اس وقت کا خطاب ہے جو اللہ کی طرف سے بندے کو ہوگا۔ یہ تو وہ واقعہ ہے جو ہر بندے کو پیش آئے گا۔ مگر یہ خطاب صرف مومن کیلئے ہوگا۔

مومن کیلئے اعلان رضا کی بشارت

بشارت اس میں کیا ہے؟ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً یہ بشارت ہے۔ یعنی اے نفس مطمینہ آ اور ہماری طرف لوٹ، اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی، اعلان رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ مومن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔ مومن کے راضی ہونے کے کیا معنی؟ بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا

کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود کے ہی قائل نہیں۔ باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس کے راضی ہونے پر ہے کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہوں؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے بڑا خدا ایک ہی ہے، یہ بھی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ غرض مومن کیلئے یہ کون سی بات نئی ہے۔ سارے اللہ سے راضی ہیں۔ مومن کی کیا خصوصیت ہے؟

احادیث کے اندر اس کی رضا کی تفسیر بیان فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے ایمان کیلئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔ یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں جب تک ان افعال الٰہیہ کے ساتھ رضا مندی نہ ہو جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں، یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے یہ ایمان کے لیے ضروری ہے۔ حق تعالیٰ شانہ جیسے خالق و مالک ہیں، رب ہیں، رب کے معنی پالنے والے کے ہیں۔ پرورش کے اندر وہ افعال بھی کیے جاتے ہیں جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے، ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چمکارتی ہے تھپڑ بھی مارتی ہے، جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے، باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے، کبھی یہ بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا، تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتا، دل میں محبت موجود ہے، مگر کہہ رہا ہے میرے گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اگر اب کوتاہی کی تو تجھے دیوار سے دے ماروں گا۔

کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار پر دے مارے صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے ایسا کہا ہے۔ غرض جیسے بچے سے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی مامتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے۔ اسے بھی تربیت کہتے ہیں یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔ اگر ماں کے دودھ پلانے پر ہر بچہ خوش ہو جائے، روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے۔ اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں تو کہا جائے گا کہ بڑا نامعقول اور نا خلف بیٹا ہے، جسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہیے تھا ایسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصلحت کے تحت تھا، کیونکہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں، محبت کا ہے، اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی، خلف، صالح وہ کہلائے گا جو باپ کے چمکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے، کھانا کھلانے پر بھی راضی اور سزا دینے پر کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا ایک وقت کی روٹی بند کر دے تو بھی راضی ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے تحت ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں۔ جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی ماں کی گود میں جاتا ہے۔ طمانچہ مارتی ہے تو روتا جاتا ہے مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے، سمجھتا ہے کہ اس کے سوا میرے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ میرا ٹھکانہ یہی ہے۔، بہرحال جب کھانا پلانا اور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے، تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تو تربیت ہے، بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو، اگر وہ تونگر بنا دے، تو جتنا اس وقت ہو راضی ہو، اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو، جب وہ ساری نعمتیں چھین کر مفلس بنا دے، تب کہا جائے گا یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے۔ اگر وہ مصیبت بھیج دے تو جتنی رضا مندی نعمت میں تھی اتنی ہی مصیبت میں بھی ہو۔ اس لیے کہ اللہ بندے کو مصیبت بھیجتا ہے تو کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔ بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے، مثلاً بے شمار دولت دے دی، اقتدار دے دیا، مگر بندے نے اس کو غلط طریقے سے استعمال کرنا شروع کیا، بجائے اس کے کہ شکر گزاری کرے دن رات اپنے رب کے آگے جھکے، اس نے تعیش میں آ کر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بنا لیا، تو انصاف اور عقل سے سوچیئے کہ تھپڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے اس لیے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں، حقیقتاً وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی تھی۔ لاؤ اس سے چھین کر بھر لو بلکہ تنبیہ مقصود تھی، شاید اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آ جائے اور جس طرح برائی کی طرف جا رہا تھا توبہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے جس کو قرآن میں فرمایا گیا (سورہ البقرہ، آیت نمبر 156-155)

ترجمہ: "اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو- کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا"-

بہت سی قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کر جھک جاتی ہیں، پھر ان پر انعامات کی بارش ہوتی ہے۔ لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔ (سورہ الانعام، آیت نمبر 43-42)

ترجمہ: "اور بیشک ہم نے تم سے پہلی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے تو انہیں سختی اور تکلیف سے پکڑا کہ وہ کسی طرح گڑگڑائیں- تو کیوں نہ ہوا کہ جب ان پر ہمارا

عذاب آیا تو گڑگڑائے ہوتے لیکن ان کے دل تو سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے کام ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھائے"۔

اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزین ہو جاتی ہے کہ اسی کی رنگینیوں میں الجھ کے رہ جاتے ہیں، دوسری طرف دھیان نہیں جاتا۔ تو جیسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ (سورہ الانعام، آیت نمبر 45-44)

ترجمہ: ''پھر جب انہوں نے بھلا دیا جو نصیحتیں ان کو کی گئیں تھیں ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا اب وہ آس ٹوٹے رہ گئے، تو جڑ کاٹ دی گئی ظالموں کی اور سب خوبیاں سراہا اللہ رب سارے جہاں کا''۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیت الٰہیہ میں جیسے انعام واکرام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لیے ہے، جیسے دینا ربوبیت ہے، چھیننا بھی ربوبیت ہے تو عبرت ونصیحت دلانے کیلئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے افعال پر بھی راضی رہنا چاہیے

حاصل یہ نکلا کہ بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہو، اس کے افعال سے بھی راضی ہو، یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو، اس کے انعام پر بھی راضی ہو اور اس کے انتقام اور سزا پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لیے کہ نعمت اور مصیبت بھیجنے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے، بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کی دی ہوئی نعمت پر راضی ہو جائیں اور بھیجی ہوئی مصیبت پر راضی نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضامندی ہونی چاہیے۔ ایسے بندے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں، بلکہ افعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات پر بھی راضی ہو، اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی، نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے، مصیبت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے یہ رضا شروع ہو جاتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے۔ لہٰذا ہم بھی اس کے۔ اگر یہ ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان، نہ مصیبت کا دھیان۔ اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں الجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔

تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی۔ نعمت میں بھی نہ بھولے، مصیبت میں بھی نہ بھولے، دنیا میں نعمت بھی آزمائش کیلئے ہے، مصیبت بھی آزمائش کے لیے ہے، بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے، اس لیے کہ رضا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سب اللہ کے قائل ہو گئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں، اس طرح تو مومن اور غیر مومن دونوں راضی ہیں، مومن کے راضی ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے افعال سے اس کی تقدیرات سے اور اللہ اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی۔ اگر وہ نعمت بھیج کے بادشاہ بنا دے تو کہے ''اے اللہ میں راضی تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جا اس وقت جنگ کرو وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، میں جا کر جنگ کرونگا''۔ اور اگر کہے کہ جان دے دو، تو بندہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہم سب مال چھیننا چاہتے ہیں، کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، اس لیے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے، آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہو سکتی، اب غنی عن العالمین ہیں حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لیے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت۔ ان کا نفع نقصان سے کیا تعلق؟

اگر سارے بندے مل کر ایک جیسے اتقیٰ قلب بن جائیں، سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کرام کا قلب ہوتا ہے تو میری ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتے، اللہ کو نہ نفع کی پرواہ ہے، نہ نقصان کی نہ وہ نفع کا محتاج ہے نہ نقصان کا، اس لیے کہ جو کچھ ہے بندے کی مصلحت کیلئے ہے، اور اگر بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے، اس کو راضیہ کہا گیا ہے، اس حالت میں تو ہمارے پاس آرہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا، ہر حالت اور ہر تقدیر پر راضی رہا، اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

آدمی صاحب نسبت کب ہوتا ہے؟

حضرات صوفیاء کی اصلاح میں اسی کا نام نسبت ہے۔ یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں صاحب ارباب نسبت میں سے ہیں نسبت کے معنی ہیں کہ بندے کو اللہ سے اتنا قوی تعلق پیدا ہو جائے کہ وہ اللہ سے راضی، اللہ اس سے راضی ہو، جانبین سے جب رضا ہو گئی تو کہیں گے کہ آدمی صاحب نسبت بن گیا، جہاں ایک طرف سے رضا مندی ہو وہ صاحب نسبت نہیں اللہ بھی راضی ہو جب صاحب نسبت بنے گا۔

مقام صاحب نسبت

اس مقام کے بارے میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ حضرت عمرؓ کے بارے میں فرماتے ہیں "اللہ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا ہے"۔(جامع ترمذی) جب عمرؓ رضائے حق کے اندر اتنے فانی ہو چکے تھے کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضی خداوندی ہوتا تھا تو حضرت عمرؓ کو اللہ کی رضا خود ڈھونڈتی تھی جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ امور میں حضرت عمرؓ کی رائے وحی میں مل گئی جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہوگئی۔

1۔ حدیث پاک میں ہے کہ ابتداء میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا، مجلس میں ازواج مطہرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھیں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، جہاں صحابہ کرامؓ ہیں بعض منافق بھی شامل ہیں مجھے یہ پسند نہیں آتا کہ ازواج مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں"۔ یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہوگئی کہ:

فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ اور وَقَرۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53 اور 33)

ترجمہ: ''کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو"۔ اور " گھروں میں ٹھہری رہو، باہر مت نکلو'۔

جو رائے دی اسی کے مطابق وحی آگئی اسی طرح سے متعدد واقعات گزرے کہ عمرؓ نے رائے دی اور وحی آگئی حدیث میں ہے کہ

2۔ '' مقام ابراہیم پر (حج کرنے والے جانتے ہیں کہ) طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے لیا جاتا ہے تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور بیچ میں مقام ابراہیم آجائے، طواف دوگانہ واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ پتھر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت ابراہیمؑ کے پیروں کے نشان بھی ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ یہ فضائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا'' یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کیسا اچھا ہوتا کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں جس دن یہ کہا شام کو آیت نازل ہوگئی "مقام ابراہیم کو مصلی بناؤ" اور اسے درمیان میں لے کر دوگانہ ادا کرو۔ اس طرح متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں جن کے بارے میں حضرت عمرؓ نے جو رائے دی وحی بعینہ اس طرح نازل ہوئی، گویا ان کا ضمیر وحی خداوندی کا اتباع کرتا تھا۔ ادھر ہی چلتا تھا جدھر وحی خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔

اس لیے حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا'' اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتا''۔(جامع ترمذی)

مناسبت نبوت سے اتنی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں وحی اس کے مطابق آتی ہے مگر یہ صورت کب ہوئی؟ یہ صورت جب ہوئی کہ جب حضرت عمرؓ کا نفس بالکل رضائے الٰہی میں فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہ رہی اس حالت میں نفس میں جو بھی خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ ہے، حق اور مرضی خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے حتیٰ کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو، اس لیے کہ اسے منشاءِ حق کی طلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی، نعمت دے دے جب بھی راضی، مصیبت دے دے جب بھی راضی۔

بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں

تو انسان کے نفس میں اللہ سے محبت، تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشاشت کے ساتھ راضی ہو، مجبوری کے ساتھ نہیں، صبر بشاشت کے ساتھ ہو، مجبوری کا صبر سبھی کو آتا ہے کسی کے ہاں خدانخواستہ میت ہو جائے تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آجاتا ہے، مگر صبر وہ ہے جو بروقت کیا جائے، جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو اسے صبر کہتے ہیں۔

جیسے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا گزر ایک عورت پر ہوا جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اللہ سے ڈر اور صبر کر"۔ وہ بولی" جاؤ جی پرے ہٹو۔ یہ مصیبت تم پر پڑی ہوتی تو پتہ چلتا"۔ وہ آپ خاتم النبیین ﷺ کو پہچان نہ سکی تھی۔ پھر جب لوگوں نے اسے بتایا" یہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ تھے" تو اب وہ (گھبرا کر) نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے دروازہ پر پہنچی۔ وہاں اسے کوئی دربان نہ ملا۔ پھر اس نے کہا" میں آپ خاتم النبیین ﷺ کو پہچان نہ سکی تھی۔ (معاف فرمایئے)" تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" صبر تو جب صدمہ شروع ہو اس وقت کرنا چاہیے (اب کیا ہوتا ہے)"۔(صحیح بخاری)

یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے سے اور اختیار سے کیا جائے اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے من جانب اللہ ہے اور خیر اسی کے اندر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں درحقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاءِالٰہی پراُخروی وابدی انعام

غرض مومن کو یہ بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ اے نفس مطمئنہ ! تجھے اللہ کے ہرفعل اورتقدیر پراطمینان حاصل تھا۔راحت ہو یا پریشانی ہو،نعمت ہو یا مصیبت ہو،خوشی ہو یاغمی ہوتو ہرحالت میں اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لیے خیر ہو رہا ہے۔تواے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر طمانیت وبشاشت حاصل ہوگئی تھی اب تو اس حالت میں ''ارجعی'' ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی ہم سے راضی ،ہم بھی تجھ سے راضی تونے اپنی عمر ہماری رضا میں گزار دی ہم اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے۔ہم تجھ سے راضی ہیں،کبھی ناراض نہیں ہونگے۔جب تو اس مقام پر ہے تو''فادخلی فی عبادی''اب تیرا نام میرے بندگان خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔تو ان میں داخل ہے۔مطلقاً بندے تو سبھی ہیں،کفار وفجار بھی اس کے بندے ہیں،ابلیس بھی اسی کا بندہ ہے،مگر عبادِ خاص نہیں ہیں جن کو مقرب کیا جائے جن پر عبد کا اطلاق آئے ،**عبدوہ ہے جس میں عبدیت ہو اور عبدیت مطلقاً ،عبدیت کے معنی غلامی کے ہیں یعنی اللہ کے سامنے ایسی غلامی ہو کہ جو بھی وہ کرے یا کہے بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو، ناخوشی کا سوال ہی نہ ہو،اسے ''عبدِ مطلق'' کہتے ہیں** دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے اسے تفویض کہا ہے(سورہ المومن،آیت نمبر 44)

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلیٰ اللہ

ترجمہ:"ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں"۔

اسی لیے تفویض میں راحت،تجویز میں مصیبت ہے جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں۔

واقع یہ ہے کہ بندے کیلئے راحت بشاشت جتنی ہے(تفویض) کے اندر ہے جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ویسا ہوتا نہیں،تو بیٹھ کر گھٹتے ہیں یہ مصیبت ہے اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں کہ جو اللہ تعالیٰ کردے میں اسی پر راضی ہوں ، پھر خلاف طبع کوئی چیز پیش نہیں آئے گی جب خلاف طبع نہیں پھر مصیبت کیا ہوئی۔مصیبت ہے ہی اپنی تجویز اور جب تفویض کردی،سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا جو ہوگا خیر ہوگا قلب کے اندر گھٹن پیدا نہیں ہوگی نعمت آجائے جب بھی راضی،مصیبت آجائے جب بھی راضی۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟انہوں نے کہا کہ اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو،جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں،لوگوں نے کہا آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہاں کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں؟،فرمایا الحمد اللہ میں اسی درجے کا ہوں۔لوگوں نے کہا آخر یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہوسکتا ہے اور میرے اندر ہوگیا ہے کہ دونوں جہان کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کردیا ہے جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔تو کوئی چیز میری خلاف طبع اس دنیا میں ہوتی ہی نہیں،کوئی پیدا ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں الحمداللہ،یہی ہونا چاہیے تھا،کوئی دنیا سے گزرتا ہے تو میں کہتا ہوں الحمداللہ یہ ہونا چاہیے تھا۔میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے،نہیں ہونا چاہیے تھا۔

دنیامیں قانون مکافات کاعمل جاری ہے

اس لیے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مکافات جاری کیا ہوا ہے یعنی ادل بدل کا قانون کہ جیسا تم کروگے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہوگا۔جیسی تم راہ اختیار کروگے ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی۔اگر تم گناہ کرنے سے لوٹ جاؤ گے تو اللہ بھی عذاب دینے سے لوٹ جائیں گے،تم بدی کی طرف لوٹو گے،اللہ عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے،جیسا تم کروگے،ویسا اللہ کریں گے،جو اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کریں گے،جو اللہ سے ملنا مکروہ جانتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا مکروہ جانتے ہیں،اللہ بھی اس سے نہیں ملیں گے،تم اللہ کی مدد کروگے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔تم اللہ کو یاد کروگے،اللہ بھی تمہیں یاد کریں گے-

غرض قانون مکافات میں ہے جو برتاؤ بندے کا ہوگا وہی اللہ کا بندے کے ساتھ ہوگا۔

اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹی

اس لیے اگر کوئی شخص اپنے بارے میں یہ دیکھنا چاہے کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ میرا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا ہے؟اس پر قیاس کرے،ویسا ہی اُس کا تعلق ہے۔اگر ہماری طبیعت میں اللہ کی طرف سے بُعد ہے تو ادھر بھی بُعد(دوری)ہے،اور اگر ہماری طبیعت میں رجحان ہے اور جھک رہے ہیں ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہوگی۔یہ کسوٹی ہے ہر شخص،پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا میرے ساتھ کیا معاملہ ہے؟۔وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنا آپ قطع نظر کر کے اللہ کے معاملات کو دیکھا تو۔مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا،شکایت پیدا ہوجائے گی۔کوئی برائی آئی اور شکایت پیدا ہو کہ مصیبت کیلئے کیا میرا ہی گھر رہ گیا تھا،مجھ پر ہی مصیبت بھیجنی تھی حالانکہ میں

مومن ہوں۔ یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس لیے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں۔ جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کر رہا ہوں کتنی اطاعت کر رہا ہوں اور اللہ سے کتنا راضی ہوں تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہوگی، سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔ اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بُعد ہو، غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو (اللہ سے) دیکھ لے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ''بعض صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔ فرمایا اس پر دیکھ لو کہ تم اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو، اگر پڑوسی کو ستاتے ہو تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کو بھی تم سے بُعد ہے اس کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی ہوگا اور اگر تم پڑوسی کے ساتھ انتہائی لطف و کرم کا معاملہ کرتے ہو تو یقیناً امید رکھو ادھر سے بھی لطف و کرم کا برتاؤ ہوگا۔ اور یہ کہ اپنے عمل کو دیکھو اگر عمل کر رہے ہو تو فضل متوجہ ہے۔

تو کسوٹی بیان کر دی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے اس لیے اگر ہم خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شام تک ہمارے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آجائے، ہم مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں، بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں، سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی ہمارے ہر فعل سے راضی ہیں۔

مومن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں

اس کو فرمایا گیا ہے اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ اے نفس لوٹ کر آ۔ یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا تھا، تو دنیا کی چیز نہیں، تو آخرت کی چیز ہے اب تو نے اپنی رضا و اطمینان دے دیا، اس لیے مقصد پورا ہو گیا، اس لیے اب لوٹ کر ہماری طرف آجا، اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔ اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے، اسے ارجعی کہ لوٹ کر آ کا خطاب نہیں دیا جائے گا۔ تو دنیا کا تھا دنیا ہی میں رہ۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے ملائکہ اس کو لے کر جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس پر نفرین و لعنت کی جاتی ہے۔ وہیں سے اس کو پٹخ دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ شیخ اکبرؒ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ آسمان سے نیچے نیچے جتنا علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔ آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں اس سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں، حق تعالیٰ نے ایک رسی ٹانگ دی ہے کہ جو اس کو پکڑ لے گا وہ اس تہہ خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا اور وہ رسی کیا ہے؟ (سورہ آل عمران، آیت نمبر 103)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ

ترجمہ: "اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو۔"

یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے جو اس کو تھام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اللہ تک پہنچا دے گی گویا مومن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا، وہ جہنم میں موجود ہیں، جہنم میں رہیں گے یہ نہیں کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے وہ اب بھی جہنم میں ہیں، نکلنے والے نکل جائیں گے، رہنے والے رہ جائیں گے۔ تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مومن کو اس لیے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر لوٹ کر آئے، کافر اس لیے بھیجا ہے کہ تو جا رہا ہے تو ابدالآباد تک وہیں رہے گا۔ اس کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔ اس لیے کافر کو دنیا سے نہیں نکلنا ہے، مومن کو نکل بھاگنا ہے۔ اس لیے ''ارجعی'' رجوع کرو۔ تو پہلے بھیجا گیا ہے بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے چند دن بھیجا تھا۔ اب لوٹ آؤ۔

علت رجوع

اور کس حالت میں لوٹ آؤ؟ یہ گویا، رجوع کی علت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔ جو ہم سے ناراض ہے اسے ہم اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے تو ''ارجعی'' کی حکمت یا علت ''رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ہے کہ لوگو! اس لیے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی، تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے، اس کے بعد کے عالم میں نہیں ہے جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔ بعینہٖ وہی جہنم ہے۔ مومن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لیے کہ وہ ایمان قبول کر چکا ہے کافر نکلنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

جو بندہ نہیں بننا چاہتا حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتا

اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا جتنی بندگی اس نے کی ہوگی۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ترجمہ: ''میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے خاص بندے ہیں''

انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا جنہوں نے میرا دین نہیں مانا تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔ جیسے حضرت رابعہ بصریؒ کا معقولہ ہے کہ جب انہیں دفن کر دیا گیا تو جیسے حدیث میں ہے کہ دو فرشتے منکر نکیر آئے انہوں نے کہا ''من ربک'' تیرا رب کون ہے؟ رابعہ بصریؒ تو ولیہ اور عارف باللہ تھیں انہوں نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ رب سے پوچھو کہ وہ مجھے بندی سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں اسے رب جانتی ہوں یا نہیں۔ اس لیے کہ اگر میں پچاس دفعہ کہوں کہ وہ میرے رب ہیں اور وہ یوں کہہ دیں کہ ہم تجھے بندی بنانا نہیں چاہتے ہیں۔ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ ان سے پوچھو کہ وہ مجھ کو اپنی بندی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بعد میں مجھ سے پوچھنا۔ وہ فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے کہ جو ہم سے ہی سوال کرتا ہے۔ تو بات یہی ہے کہ بندہ وہی ہے جسے وہ بندہ بنالیں اور جسے وہ کہہ دیں کہ تو ہمارا بندہ ہی نہیں۔ وہ نہ بندہ ہے نہ اس کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تو کافر نے صفائی سے کہہ دیا کہ میں بندہ بننا نہیں چاہتا۔ میں آپ کا غلام اور مطیع بننا نہیں چاہتا نہ آپ کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی فرما دیتے ہیں کہ یہ خود ہی اپنا ذمہ دار ہے۔ بے شک اسی عالم میں رہ جس پر تو راضی ہے۔ ہم سے راضی ہوتا۔ ہماری طرف آتا تو ہم سے بُعد پر راضی ہے تو اسی عالم میں رہ۔ اور مومن کہتا ہے کہ ''امن اللہ'' ہم ایمان لے آئے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔ اس کو فرماتے ہیں تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں۔ پھر وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہمارے پاس چلے آؤ اس لیے ''ارجعی'' کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن کر لوٹ کر آ گیا تو فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ میرے عباد میں داخل ہو جا۔ صحیح معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور مستحق ہے اور تو ہی اس کے قابل ہے کہ تو اس مقام کریم و قرب میں پہنچ۔ تو خطاب موت کے وقت مومن بندے کے لیے ہے: (سورہ فجر، آیت نمبر 30-27)

یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ

ترجمہ: "اے نفس مطمینہ واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا"۔

****

معرفت الٰہی

حق تعالیٰ کو پہچاننے کے بیسیوں طریقے قرآن پاک میں ذکر کئے گئے ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں انسان کے اندر موجود ہیں کائنات میں موجود ہیں جو ان کو پہچان لیتا ہے وہ اللہ کو پہچان لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ تعمیر کو دیکھ کر معمار پہچانا جاتا ہے لکھائی کو دیکھ کر لکھنے والا پہچانا جاتا ہے۔ شعر کو دیکھ کر شاعر کی پہچان ہوجاتی ہے۔ تو اتنی بڑی کائنات اور بڑی نشانیاں، انہیں دیکھ کر خود اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بنانے والا کوئی بہت بڑا ہے اور بڑی عظیم الشان ذات ہے جس نے اتنی بڑی کائنات بنا کر رکھ دی۔ یہ کائنات خود بخود نہیں بن گئی ہے بلکہ یہ کسی نے بنائی ہے اور وہ ہی اس کو چلا رہا ہے۔ بہت سے دہریوں نے انکار کیا کہ اللہ کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ کائنات از خود بن گئی ہے۔ یہ جہالت ہے اور فطرت کے خلاف ہے دلیل سے انسان اللہ کو نہیں پہچانتا بلکہ دل پر ایک دباؤ ہے کہ اسے ماننا پڑتا ہے کہ ہے کوئی ذات۔

امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں مہدی جو اموی خلیفہ تھا اس کے دربار میں ایک دہریہ آیا جو خدا کی ذات کا منکر تھا اس نے کہا کہ میں نہیں مانتا کہ کسی خدا کا وجود ہے یہ کائنات خود بخود بن گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے لوگ پیدا ہوتے مرتے ہیں یہ ایک طبعی کارخانہ ہے۔ اس کا بنانے والا کوئی نہیں ہے اس نے چیلنج کیا کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اسے میرے مقابلے میں لایا جائے تاکہ میں اس سے بحث کروں۔ لوگ غلطی میں مبتلا ہیں اپنی طاقتوں کو خواہ مخواہ ایک غیبی طاقت کے تابع کر دیا ہے جو سارے جہان کو چلا رہی ہے۔

اس زمانے میں سب سے بڑے عالم حضرت امام ابوحنیفہؒ تھے مہدی نے امام صاحب کے پاس ایک آدمی بھیجا رات کا وقت تھا۔ رات ہی کے وقت دربار منعقد ہوتا تھا کہ وہ آکر اس دہریے سے بحث کریں اور اس کو راہ راست پر لائیں۔ چنانچہ آدمی وہاں پہنچ گیا اور صورت حال سے امام صاحب کو آگاہ کر دیا اور کہا" آپ کو مناظرہ کے لئے بلوایا گیا ہے"۔ بغداد میں ایک بہت بڑا دریا ہے اسے دجلہ کہتے ہیں اس کی ایک جانب شہر اور دوسری جانب شاہی محلات۔ امام ابوحنیفہؒ شہر میں رہتے تھے اس لئے دریا پار کر کے آنا پڑتا تھا۔

امام صاحب نے پیغام لانے والے سے کہا" اچھا جا کر کہہ دو میں آرہا ہوں"۔ دربار لگا ہوا تھا خلیفہ اور امرا بیٹھے ہیں وہ دہریہ بھی بیٹھا ہوا ہے وہ آدمی واپس آگیا اور کہا" میں نے امام صاحب کو اطلاع کر دی ہے وہ آنے ہی والے ہیں"۔ اب دربار لگا ہوا ہے سب لوگ انتظار کر رہے ہیں امام صاحب نہیں آئے۔ رات کے بارہ بج گئے۔ دہریے نے کہا" معلوم ہوتا ہے تمہارے امام صاحب ڈر گئے ہیں"۔ سب لوگ پریشان۔ جب رات کا ایک بجا تو امام صاحب دربار میں حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے تعظیم کی جیسا کہ علمائے ربانی کی کی جاتی ہے۔ تمام دربار کھڑا ہوگیا۔ بیٹھنے کے بعد خلیفہ نے امام صاحب سے کہا'' آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی رات 10 بجے بلایا گیا تھا اور آپ ایک بجے تشریف لائے ہیں''؟ امام صاحب نے فرمایا" ایک عجیب حادثہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے دیر ہوگئی"۔ سب لوگ حیران ہوئے کہ کیسا حادثہ؟ فرمایا" عجیب واقعہ تھا۔ خود مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیا ہوا؟ اور کیسے ہوا"؟ امیر المومنین نے کہا" فرمائیے ہوا کیا تھا"؟'' قصہ یہ ہوا کہ میں شاہی محل میں آنے کے لئے دریا کے کنارے پر پہنچا تو اندھیری رات تھی نہ کوئی ملاح تھا نہ کوئی کشتی۔ میں حیران تھا کہ دریا کس طرح پار کروں؟ اس شش و پنج میں کھڑا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دریا کے اندر سے لکڑی کے عمدہ تختے نکلنا شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلتے جا رہے تھے۔ میں حیرت میں تھا کہ یکا یک تختے خود بخود جڑنے شروع ہوگئے اور کشتی کی صورت اختیار کرنے لگے میں حیران تھا کہ آخر ان کو کون جوڑ رہا ہے کہ بالکل ترتیب سے جڑتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے اور پیتل کی کیلیں نکلنی شروع ہوئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھکنے لگیں اور جڑ جڑ کر بہترین قسم کی کشتی بن گئی۔ ابھی میں حیرت میں تھا کہ وہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھنا شروع ہوئی اور کنارے پر آگئی۔ میں اس میں سوار ہوگیا وہ خود بخود مجھے لے کر روانہ ہوگی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ کشتی پانی کے بہاؤ کے خلاف چل رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ پانی کے بہاؤ کے مخالف یہ کیسے چل رہی ہے؟ آخر اس حیرت میں کنارہ آگیا۔ کشتی رک گئی اور میں اتر کر یہاں آگیا اور اب بھی سوچ رہا ہوں کہ یہ کیا واقعہ ہوا''؟

یہ تمام باتیں دہریے نے سنیں اور کہا" امام صاحب میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں مگر آپ تو بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں، خود بن گئی۔ کوئی کیلیں ٹھوکنے والا نہیں۔ خود بخود ٹھک گئی۔ کوئی چلانے والا نہیں خود ہی چل پڑی، خود ہی سمجھ گئی کہ آپ کو شاہی محل جانا ہے یہ کوئی عقل میں آنے والی باتیں ہیں"؟ امام صاحب نے فرمایا" اچھا یہ بات نادانی اور بیوقوفی کی ہے"؟ اس نے کہا" جی ہاں"۔ امام صاحب نے فرمایا" ایک کشتی تو بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتی، بغیر کیلیں ٹھوکنے والے کے کیلیں نہیں ٹھک سکتیں اور بغیر چلانے والے کے کشتی چل نہیں سکتی؟ یہ معمولی کشتی جسے انسان بنا سکتا ہے یہ تو خود

بخود بن نہیں سکتی تو اتنا بڑا جہاں اتنی بڑی کائنات اتنے احسن طریقے سے بغیر بنانے والے اور چلانے والے کے کیسے بن گئی اور کیسے چل رہی ہے؟ ہے نا اس کے بنانے والا اور اس کو چلانے والا کوئی اور وہ ہے اللہ"۔

مناظرہ ختم۔ وہ دہریہ اپنا سا منہ لے کر دربار سے اٹھا اور فوراً دربار سے باہر چلا گیا۔

انسان اگر سوچے تو قدم قدم پر اللہ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں کام کرتے ہیں۔ ہزاروں تمنائیں ہوتی ہیں لیکن کچھ میں کامیابی اور کچھ میں ناکامی ہوتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اولاد ہو، علاج کرواتا ہے، دوائیاں استعمال کی جاتی ہیں لیکن نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اولاد نہ ہو۔ برتھ کنٹرول کی دوائیاں استعمال کرتے ہیں لیکن اولاد ہوتی رہتی ہے آخر یہ سب کچھ کرنے والا کون ہے؟ دنیا میں انسان ہزاروں باتیں چاہتا ہے کہ یہ ہوں مگر نہیں ہوتیں۔ لاکھ پریشانیاں ہوں لیکن جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ میں مرجاؤں؟ سارے زندگی چاہتے ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں تو دوائیاں استعمال کرتے ہیں۔ غذائیں کھاتے ہیں۔ آب وہوا بدلتے ہیں لیکن جب وقت آجاتا ہے تو بادشاہ، نواب، لکھ پتی، سب مجبور اگر روپیہ خرچ کر کے جان بچائی جاسکتی تو امیر آدمی کبھی نہ مرتا۔ پھر یہ موت دینے والا کون ہے؟ ہم سب مجبور ہیں۔ کوئی ہے جس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے، ہم مخلوق نہیں اور اگر مخلوق ہیں تو کوئی ہمارا خالق ضرور ہوگا۔ تو ہر قدم پر انسان اللہ کو اور اس کی نشانیوں کو پہچاننے پر مجبور ہے۔

عقل سے اللہ کا اقرار کیا جاتا تو فلاسفر عارفین کاملین ہوتے:

دلائل پر اللہ کا وجود نہیں ہے اگر دلائل پر موقوف ہوتا تو سب سے بڑے عارف اور خدا پرست یہ فلسفی لوگ ہوتے۔ حالانکہ فلسفی جو عقل پرست ہیں وہ ہی خدا سے دور ہیں۔ امام رازیؒ کا واقعہ ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے وجود پر 100 دلیلیں پڑھیں۔ بڑی فلسفیانہ اور مضبوط دلیلیں اور انہیں ناز تھا کہ میرا ایمان سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس لئے کہ میں نے اللہ کے وجود پر سو دلیلیں قائم کی ہیں۔ ایک دن امام رازی ایک کھیت پر سے گزر رہے تھے کھیت کا کاشتکار سامنے آگیا۔ بے چارہ اَن پڑھ، نہ مولوی، نہ فلسفی، نہ عالم۔ امام صاحب نے اس سے پوچھا "کون ہو"؟ کہا "مسلمان ہوں"۔ امام صاحب نے کہا "مسلمان کس کو کہتے ہیں"؟ اس نے کہا "جو یہ کہے کہ اللہ ایک ہے۔ رسول خاتم النبیین ﷺ ایک ہیں۔ آخرت حق ہے وہ مسلمان ہوتا ہے"۔ امام صاحب نے کہا "اچھا تو مسلمان ہے تیرے مسلمان ہونے کی دلیل کیا ہے"؟ دیہاتی نے کہا "اچھا معلوم ہوتا ہے تو کوئی دہریہ ہے"۔ لاٹھی اٹھائی۔ امام صاحب آگے آگے اور یہ دیہاتی پیچھے پیچھے۔ کہ مسلمان ہونے کی دلیل مانگتا ہے۔ "ارے بیوقوف مسلمان تو اللہ کو دل کے یقین سے پہچانتا ہے نہ کہ دلیل سے"۔ "دلائل کے پیر لکڑی کے ہوتے ہیں۔ لکڑی آگ میں جل جاتی ہے پانی میں بہہ جاتی ہے ہوا میں اڑ جاتی ہے"۔ پھر وہ دیہاتی واپس مڑ گیا۔ تو دلیلوں پر اللہ کا وجود نہیں۔ اللہ کا وجود دل کے یقین پر ہے۔

قرآن کریم نے مشاہدات اور واقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے

قرآن پاک نے جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کے دلائل پیش کئے ہیں وہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کے نہیں ہیں۔ بلکہ مشاہدات کو پیش کیا ہے کہ تم اس چیز کو دیکھو اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کے وجود کو نکالو۔ اس کے متعلق امام شافعیؒ سے کسی نے پوچھا "تم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کیسے پہچانا"؟ فرمایا "میں نے شہتوت کے پتے سے پہچانا۔ اس طرح کہ شہتوت کا پتا بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں نکلنی شروع ہوجاتی ہیں۔ ہرن کھاتا ہے تو مشک نکلنا شروع ہوجاتا ہے۔ ابر ریشم کا کیڑا کھاتا ہے۔ تو ریشم نکلنا شروع ہوجاتا ہے تو ایک پتا ہے کہیں مینگنی نکلی کہیں مشک نکلا اور کہیں ریشم نکلا۔ یہ پتے کی طبیعت نہیں ہے۔ طبیعت (خاصیت) ایک کام کرسکتی ہے اس طبیعت کے اوپر کوئی بنانے والا ہے کبھی یہ بنادیا کبھی وہ بنادیا تو میں نے اس حقیر سے پتے سے اللہ کے وجود کو سمجھا ہے"۔ اس لئے اگر انسان سمجھنا چاہے تو ایک حقیر سے پتے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کو نکال سکتا ہے اور نہ سمجھنا چاہے تو انبیاء علیہ السلام نے ہزاروں دلیلیں پیش کر دیں۔ رات دن معجزے دکھائے۔ نہیں سمجھ سکا۔ ابوجہل کو نہیں سمجھنا تھا۔ نہیں سمجھا۔ ابولہب کو نہیں ماننا تھا آخری وقت تک نہ مانا اور مان لیا تو صدیق اکبرؓ نے عمر فاروقؓ نے جس نے مانا تو کوئی صدیق ہوا اور کوئی فاروق ہوا۔ نہیں مانا تو کوئی ابوجہل ہوا اور کوئی ابولہب رہ گیا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا "آپ مسلمان ہیں"؟ فرمایا "ہاں الحمدللہ" اس نے کہا "مسلمان کون ہوتے ہیں"؟۔ آپ نے کہا "جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو"۔ اس نے کہا "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے؟ وہ موجود ہے اور کائنات بھی اسی نے بنائی ہے"؟ اب امام صاحب اگر یہ فرماتے کہ یہ باتیں ہمیں اللہ کی کتاب سے معلوم ہوئیں تو وہ جاہل نہ سمجھ پاتا۔ آپ نے فرمایا "میں جو اللہ کی ذات کو سمجھا ہوں تو ایک عجیب انداز سے سمجھا ہوں میں نے دیکھا ایک محل ہے چاندی کا بنا ہوا ہے اس میں کوئی در نہیں ہے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی سوراخ نہیں ہے۔ کوئی روشن دان نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے اس محل کے اندر ایک سونے کا محل ہے۔ اس میں بھی کوئی دروازہ اور کھڑکی وغیرہ نہیں ہے۔ غرض یہ دو محل ہیں ایک محل دوسرے محل کے اندر ہے۔ ان دونوں کے اندر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہوا گزرنے

کا راستہ بھی نہیں ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس محل کی دیوار ٹوٹی اور اس میں سے ایک جاندار نکلا اور پیدا ہوتے ہی اس نے وہ کام شروع کر دیا جو ایک تجربہ کار جانور کرتا ہے۔ اب اس محل میں باہر سے تو کوئی اندر گیا نہیں اور اندر سے یہ باہر نکلا ہے۔ تو کوئی اس محل کے اندر بنانے والا ہے۔ جس نے اندر ہی اندر اس کو تیار کر دیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے"۔ لوگوں نے کہا" حضرت یہ محل کہاں ہے"؟ آپ نے فرمایا" تم نے انڈا نہیں دیکھا وہ چاندی کا محل ہی تو ہے۔ مرغی لے کر اسے بیٹھ گئی اچانک انیس دن کے بعد دونوں محلوں کی دیوار ٹوٹی اور بچہ نکل آیا۔ یہ بچہ نہ کسی سکول میں گیا نہ کہیں تربیت حاصل کی۔ نہ کوئی ڈگری۔ پیدا ہوتے ہی بالکل اپنی ماں کی طرح دانہ چگنا شروع کر دیا۔ تو انسان کے بچے کو جب تک مکتب میں نہ بیٹھائیں کچھ نہیں آتا۔ مادری زبان بھی سیکھنا پڑتی ہے۔ اس کے سامنے الفاظ دہرائے جاتے ہیں وہ گھر کے لوگوں کو الفاظ ادا کرتے ہوئے سنتا ہے تو آہستہ آہستہ سیکھتا ہے۔ اور یہ مرغی کا بچہ پڑھا پڑھایا۔ سیکھا سکھایا پیدا ہوا۔ گویا یہ ترقی یافتہ پیدا ہوا۔ یہ تعلیم اس محل کے اندر اس نے کہاں سے پائی؟ اس کو سکھانے والا اندر کون تھا"؟ یہ اس نے تعلیم دی جس نے فرمایا تمہارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہر چیز کے مطابق اس کے قلب میں ہدایت ڈال دی''۔

انسان کا بچہ ہے تو انسانی حرکتیں خود بخود اس سے سرزد ہونا شروع ہو جاتی ہیں (علم کی بات الگ ہے) چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا کھانے کی خواہش سونے کی خواہش یہ بغیر کسی تعلیم کے خود بخود کرتا ہے۔ تو اندر کوئی تعلیم دینے والا ہے جس نے دل میں راہنمائی کی ہے۔ اور وہ ہے اللہ کی ذات جو دل کے اندر ہدایت دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے:

ہمارے جسم کے اندر روح ہے اور بدن کی تربیت اندر روح ہی کرتی ہے۔ یہ بدن کے اوپر تازگی اور چہرے پر جو سرخی ہے یہ روح ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ روح نکل جائے تو بدن مرجھا، کملا جاتا ہے۔ مٹی ہو جاتا ہے تو جسم کے شیرازے کو روح نے جوڑ رکھا ہوتا ہے۔ لیکن روح ہمیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ روح ہے اور اگر نہیں ہے تو ہماری زندگی نہیں ہے۔ اگر کوئی زندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر روح ہے؟ لیکن کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ روح ہے تو یہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کو ہم نے بلا دلیل مان لیا ہے۔ تو اللہ کی ذات کو نہ مانیں یہ حیرت کی بات ہے۔

جب ہمارا یہ بدن روح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو اتنا بڑا بدن جس کا سر آسمان ہے جس کے پیر زمین ہے تو اتنا بڑا بدن کس طرح قائم ہے؟ جب تک اس کے اندر کوئی روح موجود نہیں ہے اور وہ اسے چلا نہیں رہی ہے؟ غرض جس طرح سے ہم اپنی روح کے ماننے کے لئے دلیل کے محتاج نہیں۔ محض قوت یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اس طرح پوری کائنات کے مدبر اعظم اور روح اعلیٰ کو دلیل سے نہیں مانا گیا۔ قلب کے یقین سے مانا گیا ہے۔

حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت میں نہیں

اس لئے جو روحانی لوگ ہیں ان کے ہاں کالے گورے کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حقیقت پسند انسان کی نظر اوپری چمڑی پر نہیں ہوتی وہ صورت کو نہیں سیرت کو دیکھتا ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ میں حضرت بلال حبشیؓ سیاہ فام، موٹے موٹے ہونٹ جب انہیں نکاح کی ضرورت پیش آئی تو بڑے بڑے صحابہؓ نے کہا کہ سیدنا بلالؓ کے لئے ہماری بیٹیاں حاضر ہیں۔ تو صورت تو اللہ نے بنائی ہے۔ اللہ کو حسن سیرت مطلوب ہے۔ صورت ہمیشہ فتنوں میں ڈالتی ہے۔ سیرت ہمیشہ امن پیدا کرتی ہے۔ صورت تو خراب ہو جاتی ہے۔ سیرت انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے۔ تو صورت ترقی اور رفعت کا باعث نہیں ہے۔ جیسے ہم خوبصورت ہیں۔ بہت سے جانور بھی خوبصورت ہیں۔ مور کتنا خوبصورت ہے پہاڑوں کے اندر جو مرغ زرین ہوتا ہے کئی کئی رنگ اس کے پروں میں ہوتے ہیں۔ شیر کی کھال دیکھیں اعلیٰ قسم کا کمبل ہے۔ تو صورت بڑا نہیں بناتی سیرت کام بناتی ہے۔ ہمارے بہت سے بھائی بند ہیں صورت کے لحاظ سے کم رتبہ لیکن تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے بڑے بڑے ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔ اگر صورت معیار ہوتی تو حضرت بلالؓ کی تعریف کوئی نہ کرتا۔ عطا ابن ابی رباحؒ کی تعریف امام ابوحنیفہؒ کبھی نہ کرتے تو معلوم ہوا کہ صورت سے انسان، انسان نہیں بنتا بلکہ سیرت سے آدمی، آدمی بنتا ہے۔

اہل سیرت ہی کو تاریخی عظمت نصیب ہوتی ہے

دنیا میں ہر دور میں ہزاروں حسین گزر گئے اور خاک میں خاک ہو گئے۔ کوئی جاننے والا نہیں لیکن جو سیرت والے گزرے ہیں آج تک ان کے نام عظمت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہ السلام کا ذکر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں علیہ سلام۔ صحابہ کرامؓ کا آتا ہے تو ہم کہتے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اولیا کرام کا ذکر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور آپ خاتم النبیین ﷺ کا ذکر آئے تو درود بھیجتے ہیں۔

ہمارے ان بزرگوں کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرسکتا۔ یہ ہستیاں ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن ان کی سیرت کی وجہ سے ان کی عظمتیں آج بھی وہی ہیں جیسی ان کے اپنے زمانے میں تھیں۔ ان کی سیرت اور علم وفضل ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے اصل بنانے کی چیز سیرت ہے۔ اسی کام کے لئے انبیاء کرام اس دنیا میں آئے۔ وہ صورتیں بنانے کے لئے نہیں آئے ان کی تعلیم تھی کہ دلوں کے اندر اخلاق ربانی اجاگر کرو۔ دلوں کے اندر محبت الٰہی پیدا کرو۔ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب بننے کے لئے آیا ہے۔ نائب میں بھی مالک کے اوصاف ہوں گے تو نائب مالک کی مرضی کے مطابق کام کرے گا۔ تو انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ خلیفہ اور نائب الٰہی بن کر آیا ہے۔ صحابہؓ اور تابعین کی عظمت ہمارے دلوں میں ان کے کمالات کی وجہ سے ہے۔ یہ جان کر کہ ان کے اندر علم کا مادہ موجود ہے۔ ان کی ہم عظمت کرتے ہیں یہ علم ہی درحقیقت اللہ کی چیز ہے۔ یہ کسی انسان کی چیز نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں نہ علم ہے نہ اخلاقی کمالات۔ یہ حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ محنت کر کے آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

علم دینے کے لئے مدرسے ہوتے ہیں۔ برسوں محنت کرتا ہے تب آدمی عالم بنتا ہے۔ اخلاق درست کرنے کے لئے خانقاہیں ہوتی ہیں۔ شیوخ کی خدمت اور صحبت میں محنت اور ریاضت کرنی ہوتی ہے۔ تب جا کے اخلاقی کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے سیرت بنانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ صورت تو من جانب اللہ جیسے ملتی ہے مل جاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو حسن سیرت مطلوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاندان اور قبیلے بنائے۔ خاندانوں سے پہچان اور وراثت ملتی ہے۔ خاندان فخر کرنے کے لئے نہیں ہوتے کہ ہم سید ہیں اور ہم شیخ ہیں اور ہم اعوان ہیں اسلام نے ان تمام اونچ نیچ کو مٹا دیا ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (سورہ الحجرات، آیت نمبر 13)

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ

ترجمہ: ''اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ اچھا وہ ہے جو تقویٰ میں اعلیٰ ہے''۔

اور تقویٰ حاصل کرنا انسان کا اختیاری فعل ہے۔ تو متقی بن کر جس کا جی چاہے باعزت بن جائے اور فاسق وفاجر بن کر جس کا دل چاہے وہ ذلیل بن جائے۔ خلقی طور پر (بنانے کے طور پر) جوہر میں فرق نہیں ہے کہ کسی کا جوہر اچھا ہے اور کسی کا اچھا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہماری سمجھ میں ہماری محنت میں ہماری ریاضت میں فرق ہوتا ہے۔ ہم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ یعنی جوہر سب کا مٹی ہے اور ایک جیسا ہے۔ کیونکہ ہم سب ہی آدم کی اولاد ہیں۔

مدار نجات فضل خداوندی ہے:

نجات اللہ کے کرم اور اس کے فضل سے ہی ہوگی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس بات ہی کو پکڑ لیں کہ اللہ نے تو فضل سے بخشنا ہے ہمیں عمل کی ضرورت ہی نہیں۔ عمل کرنا ضروری ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا ''مجھے کیسے معلوم ہو کہ اللہ کا فضل میری طرف متوجہ ہے'' ؟ انہوں نے جواب دیا'' برخوردار اپنے عمل کو دیکھ لو۔ اگر تم عمل کر رہے ہو تو فضل متوجہ ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمل علامت ہے اس بات کی کہ فضل متوجہ ہے۔ دنیا میں فضل متوجہ ہوتا ہے تو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جب فضل متوجہ ہوگا تو جنتوں کی صورت میں صلہ ملے گا۔ یہاں بھی فضل اور وہاں بھی فضل ہی کام کرے گا۔

جنت عمل نہیں ایمان کا صلہ ہے۔

جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا۔ عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال شکل وصورت سے نہیں بلکہ سیرت سے ہے اور سیرت کا تعلق علم سے، اخلاق سے، اعمال صالحہ سے۔ ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے۔ اس سے سیرت بنتی ہے۔ یہی اصل مقصود ہے۔ اسے بنانے کی ضرورت ہے۔

دلائل قدرت:

اسی کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دلائل قائم کئے ہیں۔ اپنے وجود کو منوانے اور اپنے کمالات کو بتلانے کے لئے دلائل قائم کئے ہیں۔ اور وہ دلائل فلسفیانہ نہیں ہیں بلکہ دنیا کی چیزیں پیش کی تھیں کہ ان ہی میں غور کرو تا کہ اللہ کا وجود تمہاری سمجھ میں آجائے۔ یہ جو آیت ہے یہ بھی اللہ کے وجود کی مستقل دلیل ہے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (سورۃ الحج، آیت نمبر 63)

ترجمہ: ''اے مخاطب تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا ہے''۔

پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جاتا اسے اوپر چڑھا کے کون لے گیا؟۔ پانی نیچے سے ابلنا چاہیے۔ اسے نیچے جانا چاہیے یہ ہزاروں میل کی مسافت پر اوپر چڑھا کر کون لے گیا؟ کہ اوپر سے پانی کو گرانا شروع کیا تو پہلی دلیل تو یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ پانی کو نہ ہم بادلوں پر لے کر گئے اور نہ ہمارے آباواجداد۔ کوئی بڑی ذات ہے کہ جس کے حکم سے پانی اوپر پہنچ گیا۔ اور اپنی طبیعت کے خلاف وہاں جانے پر مجبور ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا وجود پہلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پانی آ کر زمین میں جذب ہوا اور زمین سے پھل، پھول، غلہ، ترکاریاں اور مختلف چیزیں اگنا شروع ہوئیں۔ کاشت کار نے اگر بیج ڈال دیا تو کیا۔ منوں مٹی پھاڑ کر اسکے اندر سے ننھی سی نرم و ملائم کونپل کون نکال رہا ہے؟ ہم نے نکالی یا ہمارے آباواجداد نے؟ کاشتکار نے بیج ڈالا پانی ڈالا اس کے بعد اسے معلوم نہیں کہ زمین کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہ کونپل ایسی نرم و نازک چیز ہے کہ آدمی اسے انگلیوں سے مسل دے لیکن طاقتور اتنی کہ زمین کو پھاڑ کر نکل رہی ہے۔ تو اس میں یہ طاقت کس نے پیدا کی؟۔ جبکہ اس کی طبیعت تو نیچے جانے کی ہے۔ گھاس کو ہم اوپر اچھالیں وہ نیچے آئے گی۔ نیچے سے اوپر چڑھانے والا کون ہے؟

تو پانی کا نیچے اتارنا، اوپر چڑھانا، پھر زمین کے اندر بیج میں طاقت پیدا کرنا، بیج کا پھٹنا اس میں سے کونپل کا نکلنا۔ منوں مٹی کو پھاڑ کر اوپر آ جانا۔ یہ سارے کام کرنے والا بجز خالق اور مالک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور آگے دلیل یہ بیان کی ہے کہ ''مُختَلِفٌ اَلوَانُھا ہر پھل کا رنگ الگ الگ ہے۔ سیب، آم، انگور، کیلا ہر ایک کا رنگ الگ پر سیب، آم، انگور، کیلا ہر ایک میں الگ الگ اقسام بھی ہیں حالانکہ جنس ایک ہے۔ مزے بھی مختلف ہیں ''فَتَبٰرَکَ اَحسَنُ الخٰلِقِیْن'' سبحان اللہ کیا بات ہے خالق کی، سب سے اچھا خالق حالانکہ سب کی اصل زمین ہے سب زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں رنگ مختلف ہیں، اگر زمین کی طبیعت رنگ بناتی تو طبیعت تو ایک رفتار پر چلتی ہے۔ پھر پھولوں کو دیکھیں کتنے رنگ اور کتنے خوبصورت کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے پھر آگے دیکھئے کہ رنگ صرف پھلوں اور پھولوں میں ہی نہیں ہیں بلکہ دالوں، ترکاریوں، پہاڑوں، مٹی، کوئلہ ہر ایک میں مختلف رنگ پائے جاتے ہیں۔ انسان اگر اس کی صنائی کا نظارہ کرنے لگے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور قدرت دیکھئے کہ آم کے درخت پر ہمیشہ آم ہی لگیں گے، گلاب کا پودا گلاب کا پھول ہی دے گا۔ کہیں بھی کسی چیز میں کوئی غلطی، کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آئے گی۔ کھجور کے درخت پر کہیں کیلے نہیں نظر آئیں گے اور کیلوں کے درخت پر کبھی کھجوریں نہیں لگیں گی۔ یہ قدرت کا ہاتھ ہے۔ انسانی ہاتھ نہیں کہ بھول چوک یا غلطی ہو جائے۔ اس طرح انسانوں کو دیکھو تو ان میں مختلف رنگ ہیں۔ عربوں کو دیکھو سرخ رنگ، حبشیوں کو دیکھو تو کالے، چین اور جاپان زرد دار پیلے رنگ، ہندوستان میں دیکھو تو کہیں کالے کہیں گورے سب گڈ مڈ۔

اگر انسان کی طبیعت کا تقاضہ تھا کہ وہ سفید ہو تو پھر کالے اور سفید کیوں ہو گئے؟ طبیعت تو سب کی انسان ہی ہے۔ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رنگ بھرنے والا موجود ہے کہ کوئی ہے خالق کہ جیسا چاہتا ہے ویسا کر دیتا ہے۔ پھر انسانوں کو کیا چوپایوں کو پرندوں کو درندوں کو جس کو بھی دیکھیں مختلف ایک دوسرے سے بالکل رنگ میں شکل میں بناوٹ میں مختلف تو اللہ کی شان ان تمام چیزوں کے اختلاف کو دیکھ کر ثابت ہوئی۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے وجود کو منوایا ہے اور دلیلیں بھی ایسی بیان کی ہیں جو فلسفیانہ انداز کی نہیں ہیں۔ ایسی ہیں کہ گاؤں کا رہنے والا اور شہر کا رہنے والا دونوں کی عقل میں آ جائیں۔ کیونکہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے کتاب ہے اس میں ایسے دلائل ہونے چاہیے جس کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکیں۔ اس لئے اس میں ایسے دلائل سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا گیا ہے کہ کم فہم سے کم فہم اور بے پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ جائے۔

****

محبت الٰہی

محبت دل یزداں کی نوری تجلی ہے۔حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ میں وہ تجلی راست ہے(Direct) صحابہ کرامؓ میں وہ تجلی بلواسطہ ہے۔اولیاء کرامؒ میں وہ تجلی تواتر سے ہے۔یہ نور سینہ بہ سینہ آیا ہے۔ایک سینہ دوسرے کے لیئے شجر ہوتا ہے۔یہ تجلی ایسی ذات سے آتی ہے جس کے لیئے سب ممکن ہے۔ناممکن کچھ نہیں ہے۔اسی لیئے اولیاء اللہ برسوں کے مردے زندہ کر دیتے ہیں۔اور وہ کچھ وجود میں لے آتے ہیں۔جہاں انسانی خیالوں کی رسائی تک نہیں جاسکتی۔یہ اس لیئے کہ محبت دل یزداں سے آتی ہے۔یہ اُن کے اختیارات لے کر آتی ہے۔پھر جس پر تجلی وارد ہوتی ہے اُس کے اختیارات سے معلوم ہوجاتا ہے کہ کس مقام سے آئی ہے۔جتنی ذات بلند ہوتی ہے۔اتنی ہی اُس کی عظمت اختیارات کے بانٹنے میں ہوتی ہے۔

ایمان کی اساس محبت پر رکھی گئی ہے۔اِس لیئے اللہ تعالیٰ کو جو توحید سے یاد کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اُسے تائید سے یاد فرماتا ہے۔جو خدمت سے یاد کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں نعمت سے یاد فرماتا ہے۔جو خوف سے یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں امان سے یاد فرماتا ہے۔اور جو اُس کو محبت سے یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں قرب سے یاد فرماتا ہے۔اور جس نے مقام محبت میں قدم رکھا اُسے بھٹی میں تپنا پڑے گا۔پھر کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہوں گے۔پھر دام لگیں گے اِس لیئے محبت کا دعوٰی نہ کریں۔مدعی پر رحم نہیں کیا جاتا اُس کا امتحان ہوتا ہے۔جو اللہ سے اُس کا فضل وکرم چاہتے ہیں وہ کبھی بھی دعوٰی نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ اپنے سے محبت کرنے والوں کو اُن کی صلاحیت کے مطابق خدمتیں سپرد کرتے ہیں۔اِس لیئے تمام چاہنے والوں کو اللہ کا دوست (اولیاء اللہ) ہی کہا جاتا ہے۔تعلق کا مقام دوست کے دل میں ہوتا ہے۔اس لیئے اولیاء اللہ کا تقابل نہیں کرنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ سے نسبت (محبت) کی بنا پر سب قابل احترام ہیں۔

رب سے محبت کرنے والے جب رب کو پکارتے ہیں تو اُن کے قلوب پر انوارات کا نزول ہوتا ہے۔جب تک یہ اولیاء اللہ دعا مانگتے رہتے ہیں عرش سے لے کر اُن کے ہاتھ تک نور کی بارش ہوتی رہتی ہے اور اس دعا کے رد ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

محبت اور نفرت قلب انسانی کے دو مکین ہیں۔جیسے اندھیرا اور اجالا یکجا نہیں ہوسکتے۔ویسے ہی محبت اور نفرت بھی یکجا نہیں ہوتی۔یہ بات اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار میں رکھی ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے قلب میں بسالے۔محبت کے روپ میں اللہ تعالیٰ اور نفرت کے روپ میں شیطان ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت ظاہر کی تو ذات مصطفی خاتم النبیین ﷺ بنائی۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے اپنی محبت کا اظہار فرمایا تو آفتاب ولایت قائم فرمایا۔جو حضرت علیؓ شیر خدا کی ذات اقدس ہے اَب انسان تو پستی میں ہے۔اِس کی منزل بلندیوں پر ہے۔اُن بلندیوں تک پہنچنے کے لیئے دامان مصطفی خاتم النبیین ﷺ کی وابستگی ضروری ہے۔

ہر دل شکار ہے کوئی محبت دنیا کا شکار ہے اور کوئی محبت آخرت کا۔جو جس کا شکار ہے اُسے شکاری کے مزاج کے مطابق ڈھلنا ہوتا ہے۔جو محبت دنیا کا شکار ہے۔وہ ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا یہ دنیا چاہتی ہے اور جو محبت آخرت کا شکار ہے۔وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔جیسا اللہ اور اُس کے محبوب حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ چاہتے ہیں۔صرف وہی کامیاب ہے جو محبت آخرت کا طلب گار ہو۔

****

تقرب الٰہی

باوجود یہ کہ شاہی اعلان ہو چکا ہے کہ فلاں بن فلاں کو ہم نے اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا ہے وہ ہمارے قانون سے باہر کوئی حکم نہیں کرتا۔ جس نے اس کے حکم و احکامات کو تسلیم نہ کیا اس نے بادشاہ کے حکم کو تسلیم نہ کیا۔ بادشاہ کی خوشنودی رعایا کے لیے وزیر اعظم اور اس کے کل عملے کے احکامات تسلیم کرنے پر موقوف ہے۔ اگر کوئی وزیر اعظم یا اس کے عملے کے احکامات تسلیم نہ کرے تو وہ موجب سزا ہوگا۔ خواص و عوام کی بہبود وزیر اعظم کے فرمان کے مطابق عمل کرنے پر موقوف ہے۔ قرآن پاک میں سورہ الحجر، آیت نمبر 42 میں ہے:

ترجمہ: ''شیطان کا زور انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا رفیق بناتے ہیں''۔

سورہ النحل آیت نمبر 63 میں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (مفہوم)

ترجمہ ''شیطان اپنے دوستوں کو ایسی توحید کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کے باطن میں زہریلے اثرات ہوتے ہیں وہ فوراً کسی کو معلوم نہیں ہوتے یہ نہایت ہمدرد بن کر مشورہ دیتا ہے کہ احادیث صحیحہ سے انکار کرو اور صرف کلام الٰہی کو تسلیم کرو جو توحید کا مغز ہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے لیکن آخر میں نتیجہ نکلنے پر معلوم ہوا کہ افسوس صد افسوس احادیث صحیحہ سے انکار کرنے پر کلام ربانی سے بھی انکار ہو گیا۔''

یاد رہے کہ سورہ النساء، آیت نمبر 14 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے نکل جائے گا اس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ذلت کا عذاب ہوگا"۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح آیت نمبر 10 میں اپنے محبوب سے ارشاد فرمایا کہ:

ترجمہ: ''جو لوگ تم سے بیعت (عہد) کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ پھر جو عہد کو (بیعت کو) توڑ دے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہوگا اور جو اس بات کو جس کا اس نے اللہ سے عہد کیا ہے پورا کرتے ہیں تو وہ عنقریب اجر عظیم پائے گا''۔

احادیث رسول خاتم النبیین ﷺ سے انکار کرنا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے انکار کرنا ہے۔ یہی شیطان کے باطنی زہریلے اثرات ہیں جو فوراً سمجھ میں نہیں آتے۔

سورہ آل عمران، آیت نمبر 31 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور وہ تمہارے گناہ، معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

پس حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی پیروی کرنا اللہ تعالیٰ کی دوستی کا مکمل ثبوت ہے۔ قرآن پاک میں سورہ نجم، آیت نمبر 3 میں فرمان الٰہی ہے:

ترجمہ: ''ہمارے حبیب اپنی خواہش نفس سے کوئی بات منہ سے نہیں نکالتے''۔

پھر سورۃ النور، آیت 56 میں فرمایا:

ترجمہ: ''نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے''۔

معلوم ہوا کہ خدا کی رحمت کا نزول صرف اور صرف پیغمبر خدا کے فرمان پر چلنے پر موقوف ہے۔ قرآن پاک میں سورہ توبہ کی آیت نمبر 128 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: ''لوگو تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں''۔

اب دیکھئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے متعلق کہتا ہے کہ وہ مومنوں کے ساتھ انتہائی ہمدرد ہیں اور ان کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اگر گمراہ لوگ یقین نہ ہونے کے باعث تمام ارشادات نبوی خاتم النبیین ﷺ سے انکار کرتے ہیں تو اس صورت میں ایمان کہاں باقی رہتا ہے؟۔

سورہ نور، آیت نمبر 63 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: ''جو لوگ رسول (خاتم النبیین ﷺ) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی آفت آ پڑے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل ہو جائے۔''

آل عمران، آیت نمبر 104 میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ ''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ پھر فرمایا کہ یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں''۔

پس ایک جماعت کثیر صحابہ کرامؓ نے بعد وصال رسول خاتم النبیین ﷺ کے اس فریضہ کو ادا کیا۔ جمع قرآن اور زیر زبر پیش کا لگانا، صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں ہوا۔ عشق رسول خاتم النبیین ﷺ میں قرآن مجید اور احادیث شریفہ کو خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھایا۔ اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں تبلیغ کی جس سے کوئی گوشہ دنیا کا باقی نہ رہا۔ حضرات ائمہ کرام نے قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں مسائل دینی کو مخلوق خدا کے سامنے پیش کیا۔ جس سے لاتعداد لوگوں کو آج تک نفع پہنچ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید سورۃ التوبہ، آیت 119 میں ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

یہاں پر سچوں سے مراد صدیقین، شہدا، صالحین جیسے حضرات آئمہ شریعت و آئمہ طریقت ہیں۔ جنہوں نے لوگوں کو شریعت وطریقت سے آراستہ کر کے محمد خاتم النبیین ﷺ کے سیدھے راستے سے اللہ تک پہنچایا۔ جن کے حالات کلام اللہ اور کلام رسول خاتم النبیین ﷺ کے مطابق ہیں اور ان کی زیارت ان کی محبت اور ان کی صحبت موجب نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ حم السجدہ، آیت نمبر 33 میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''اس شخص سے بات کا اچھا کون ہوسکتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں''

اللہ تعالیٰ سورہ الاعلیٰ، آیت نمبر 13-9 میں ارشاد فرماتے ہیں

ترجمہ: ''سو جہاں تک نصیحت نافع ہو نصیحت کرتے رہو، جو خوف رکھتا ہے، وہ تو نصیحت پائے گا، بدبخت (بے وقوف) پہلوتہی کرے گا جو (قیامت کو) بڑی (تیز) آگ میں داخل ہوگا پھر وہاں نہ مرے گا اور نہ جیے گا''۔

پس اے لوگو اپنی نادانی اور الرحم الراحمین کی شان رحیمی کا مشاہدہ کرو۔

اللہ تعالیٰ سورہ النحل، آیت نمبر 119 میں ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''پھر جن لوگوں نے نادانی سے برا کام کیا پھر اس کے بعد توبہ کی اور نیکوکار ہو گئے تو پروردگار ان کی توبہ قبول فرمائے گا اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے''

جہاں تک توبہ کا تعلق ہے تو شیطان جب راندہ گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ: (سورہ الاعراف، آیت نمبر 17)

ترجمہ: ''میں تیرے ان بندوں کو کچھ کو آگے سے پکڑوں گا، کچھ کو پیچھے سے، کچھ کو دائیں سے پکڑوں گا، کچھ کو بائیں سے اور تو ان میں سے بہتوں کو نافرمان پائے گا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (سورہ الحجر، آیت نمبر 42-41)

ترجمہ: ''فرمایا یہ راستہ سیدھا میری طرف آتا ہے، بیشک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں سوا ان گمراہوں کے جو تیرا ساتھ دیں،''

ابلیس کا ایک لشکر صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اپنے سروں پر راکھ ڈالتا ہوا ابلیس کے پاس آیا، ابلیس نے پوچھا" کیا ہوا"؟ کہا" ان لوگوں پر (صحابہ کرامؓ) پر ہمارا کوئی وار ہی نہیں چلتا"۔ ابلیس نے جواب دیا" کوئی بات نہیں آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جن پر تمہارا وار خوب چلے گا"۔ پھر یہی لشکر تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں ابلیس کے پاس آیا اور کہا" ہم ان لوگوں سے کچھ سستی اعمال میں کروا لیتے ہیں یعنی ان لوگوں پر ہمارا وار چل جاتا ہے۔ لیکن پھر یہ لوگ اپنے اعمال پر نادم (غفلت پر) ہو کر اتنا روتے اور توبہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو دگنا کر دیتا ہے"۔ ابلیس نے کہا" کوئی بات نہیں آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جو تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کریں گے وہ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے اور جب گناہ کو گناہ نہیں سمجھیں گے تو توبہ نہیں کریں گے اور توبہ نہیں کریں گے، تو بغیر توبہ کئے مر جائیں گے اور جہنم کے مستحق ہوں گے"۔

تو اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ من چاہی زندگی گزارتے ہیں۔ رب چاہی زندگی کو بھلا دیا۔ اپنی مرضی سے اوقات کار بنا لیے رب کے بنائے ہوئے اوقات کار بھول گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کی کسی کو پرواہ ہی نہیں رہی۔ یاد رہے کہ "ایمان لانا کمال کی بات نہیں، ایمان رکھنا بھی کمال کی بات نہیں، اس دنیا سے ایمان لے جانا کمال کی بات ہے۔ یعنی کمال کی بات خاتمہ بخیر ہونا، یعنی ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے جانا ہے"۔

قرآن پاک میں سورہ یونس، آیت نمبر 103 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''ہم اپنے پیغمبروں کو اور مومنوں کو نجات دیتے رہے ہیں اس طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ہم مومنوں کو نجات دیں گے''۔

لیکن کون سے مومن؟ فرض قرض ہے۔ہم مومن ہونے کے دعوے دار ہیں، عمر بھر میں ایک مرتبہ حج فرض ہے وہ بھی ادا نہیں کر پاتے ،ایک سال میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں، کسی کے تین ، پانچ ،اور سات روزے رہ گئے وہ بھی عمر بھر پورے نہیں کئے گئے۔دس برس کی عمر سے نماز فرض ہے وہ بھی پوری نہیں۔سجدہ تلاوت قرآن پاک کا ادا کرنا فرض ہے وہ بھی ادا نہیں کئے تو اتنے بہت سے قرض کے ساتھ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔دنیا میں کسی کا دوسو روپے کا قرض دینا ہو تو ہم فکر پال لیتے ہیں اور اس کو سر سے اتار کر دم لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا قرضہ اتارنے کی فکر ہی نہیں کرتے۔

سورہ العلق، آیت نمبر 7-6 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ترجہ:''انسان سرکش ہوجاتا ہے جبکہ اپنے آپ کو غنی دیکھتا ہے''۔

سورہ ہود، آیت نمبر 9 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:''جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو خوش ہوجاتا ہے اور اگر اس کو اس کے اعمال کی وجہ سے کوئی سختی پہنچتی ہے (تو سب احسانوں کو بھول جاتا ہے) بے شک انسان بڑا ناشکرا ہے"۔سورہ حم السجدہ، آیت نمبر 50 میں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:''انسان بھلائی کی دعائیں کرتے کرتے تو تھکتا نہیں، کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو ناامید ہوجاتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے۔اور اگر تکلیف کے بعد ہم اس کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا''۔

ایک اور جگہ سورہ حم السجدہ، آیت نمبر 51 میں فرماتے ہیں:

ترجمہ:''جب ہم انسان پر اپنا کرم کرتے ہیں تو پہلو تہی کرتا ہے اور پہلو پھیر کر چل دیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے''۔

سورہ زمر، آیت نمبر 49 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ:''جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ نعمت تو میرے علم اور دانش کے سبب سے ملی ہے (نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے''۔

یاد رکھیں! سب سے بڑی عبادت جس سے رحمت الٰہی کے دروازے کھلتے ہیں وہ دعا ہے۔اللہ تعالیٰ کو اپنے سے مانگنے والے سب سے زیادہ پسند آتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''جو شخص اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتا اللہ اس پر غصہ کرتا ہے- اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی چیز قدر کی نہیں'' حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''رات کے پچھلے پہر میں رب تبارک تعالیٰ نچلے آسمان کی طرف نزول فرماتے ہیں اور فرماتا ہے" کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اس کا سوال پورا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے اور میں اس کو بخش دوں"؟(صحیح مسلم)

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''جس شخص کو دعا کی توفیق ہوگئی اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھل گئے''-(جامع ترمذی)

لہٰذا قرآن پاک اور احادیث شریف کے مطابق دعائیں مانگنی چاہیں کیونکہ جب بادشاہِ وقت اور اس کے مقرر کردہ وزیر نے عرضی کا مضمون خود بنا دیا ہے تو اس عرضی کی منظوری میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا اور دعا میں عاجزی اور گریہ زاری کرنا تقرب الی اللہ کے وسیلوں میں سے ایک وسیلہ ہے۔اسلام کے معنی عربی زبان میں اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں اور مذہب اسلام کا نام اسلام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمابرداری میں لگ جاؤ، یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینے کا نام اسلام ہے یا اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اپنی آزادی اور خودمختاری سے دستبردار ہونا اسلام ہے۔جو شخص اپنے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے وہ مسلمان ہے اور جو معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے وہ مسلمان نہیں۔دوسرے لفظوں میں رب چاہی زندگی گزارنے والے مسلمان اور من چاہی زندگی گزارنے والے مسلمان نہیں۔اللہ تعالیٰ کو وہ عبادت پسند ہے جو باقاعدگی سے کی جائے اگر یہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، عبادت میں استقامت ہونی چاہیے اس کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔سب سے پہلے نفس آگے بڑھتا ہے، پھر شیطان پکڑتا ہے، پھر علائق دنیا گھیر لیتے ہیں لیکن داعی حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر استقامت پیدا کرے کہ اللہ کی راہ میں مستقل مزاجی سے چلے جب تک جسم میں قوت ہے چلتا رہے۔ٹانگیں جواب دے دیں تو گھسٹنا شروع کر دے اور گھسٹتا رہے اور جب یہ بھی نہ ہو تو مسرت بھری نگاہوں سے اور پیار بھری زبان سے دوسروں کو منزل کی طرف اشارہ کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے خاتمہ بخیر کی دعا کرتے ہوئے اس جہان فانی سے کوچ کر جائے (آمین)

ذکر الٰہی (حصہ اوّل)

ذکر اللہ کے لیے کہا ہے "وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ" اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔ ذکر اللہ تک پہنچنے کے لئے سب سے چھوٹی سیڑھی ہے ذکر اللہ اعمال شرعیہ کی روح ہے۔ اس لئے ذکر اللہ ہی اعمال میں سب سے افضل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں بلکہ عمل مقبول ہوتا ہے ذکر اللہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی زندگی روح سے ہے۔ محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک بدن کے اندر روح نہ ہو روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے باقی رکھا جائے بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا ایک تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ اسے جلد از جلد دفن کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ محبت درحقیقت بدن سے نہیں ہوتی۔ بدن کے اندر جو روح ساوی ہوئی ہوتی ہے اس سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ نکل گئی تو تعلق ختم ہو گیا۔

تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے نہ زندگی ہے اور نہ کسی شے کے لئے بقا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کا ذکر کرتی ہے۔ جس طرح ان مادی چیزوں میں روح ہی سے بقا ہے اسی طرح اعمال شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکر اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کی مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر نماز میں یاد خداوندی کے بجائے غفلت آ جائے تو نماز ختم۔ اس لئے فرمایا گیا "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي" ترجمہ: نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے۔ جب ذکر نہ رہا تو روح نماز ختم ہو گئی۔ اب محض ایک اٹھک بیٹھک اور ایک بدنی ورزش ہے جس کی کوئی قدر و قیمت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ اسی طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر، تلاوت، تراویح وغیرہ نہ ہوں تو روزے کا وہ ثواب وہ اجر نہیں جو ان چیزوں کے ساتھ ہے یعنی ذکر اللہ کے ساتھ۔ نیت کے سچے اور اس میں ذکر اللہ یا، یاد خداوندی ہونے سے اعمال میں جان پڑ جاتی ہے (روح) اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ جان یہ روح نکل جائے تو یہی عبادت، عادت بن جاتی ہے۔

تو عبادت اور عادت میں یہی فرق ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جس میں یاد نہیں۔ یاد ہے تو کم ہے (دھیان ہی نہیں) اگر یاد بھی ہے تو نفس کی یعنی (اپنی دنیا کی خواہشات کی طرف توجہ ہے) اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی ہے۔ نفس کی یاد نہیں ہوتی۔ اس طرح اگر حج میں ذکر اللہ نہیں (یاد خداوندی نہیں) تو بس سیر و سیاحت ہے۔ ذکر اللہ اور سچی نیت آ جائے تو حج ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے اور عبادت میں جذبہ یاد حق۔ اور یاد حق میں کیا گیا ہر کام عبادت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے تو اسی طرح پوری شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے۔ اگر دنیا میں سے روح نکل جائے تو دنیا ڈھانچہ بن جائے۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی۔ عبادت نہیں رہے گی۔

حدیث پاک میں ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس دنیا میں ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ جب ایک بھی باقی نہ رہے گا تو قیامت قائم کر دی جائے گی"۔ (صحیح مسلم)

قیامت کا مطلب دراصل عالم کی موت کے ہیں جیسے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم پھول، پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ پہاڑ گالوں کی طرح اُڑتے پھیریں گے۔ پانی مٹی میں اور مٹی پانی میں۔ سارا کارخانہ گڑبڑ اور درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ قیامت ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا کی روح ذکر اللہ ہے۔ تو پوری دنیا میں زندگی یعنی روح درحقیقت یاد خداوندی سے ہے۔

دنیا کے ایک ایک جز میں ذکر اللہ سے ہی زندگی ہے۔

قرآن پاک سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 44 میں ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ: "کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح (کی کیفیت) کو سمجھ نہیں سکتے، بے شک وہ بڑا بردبار بڑا بخشنے والا ہے"۔

چلتا ہوا پانی اللہ کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ رک جاتا ہے تو تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ تو وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے۔ جہاں پانی ٹھہرا، چند دن کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ سڑ جاتا ہے۔ میل کچیل بڑھ جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی میں میل کچیل نہیں رہ سکتا۔ اس لئے بہتا ہوا پانی اگر تھوڑا بھی ہو تو اس سے وضو کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں گندگی بھی گر جائے تو اس کی پاکی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس میں تسبیح اور ذکر اللہ جاری ہے۔ وہ اسے ناپاک نہیں ہونے دیتا اور ٹھہرے ہوئے پانی میں پاکی نہیں رہتی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس

لئے کہ اس کے اندر سے روح ختم ہوگئی تو چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور ٹھہرا ہوا پانی تسبیح سے محروم ہوجاتا ہے۔ اور وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے۔

درخت کی پتیاں، ٹہنیاں جب تک سرسبز ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح بند ہوئی جبھی ان پر زردی آجاتی ہے۔ خشک ہوجاتی ہیں۔ وہی جلانے کے قابل بن جاتی ہیں۔ گویا جہاں ذکر کی روح نکلی جلانے کی چیزیں بن گئیں۔ پھر انہیں جلا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح صاف کپڑا، نیا کپڑا، اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب اس پر میل کچیل آیا تسبیح بند ہوگی۔ پھر پہننے کے قابل نہیں رہتا۔ انسان کی صفائی بھی حقیقت میں ذکر اللہ سے ہے۔ جب اس میں ذکر اور یاد حق باقی نہیں رہی جبھی انسان کے قلب میں میل کچیل، گندگی اور نجاست آنی شروع ہوجاتی ہے۔ روح کے اندر جتنا ذکر زیادہ رہے گا۔ اتنی صفائی زیادہ رہے گی۔ ذکر جتنا کم ہوگا کدورت اتنی بڑھ جائے گی۔ جتنی کدورت اور ظلمت پیدا ہوگی۔ گناہ معصیت اور نافرمانی کے جذبات اتنے ہی زیادہ پیدا ہوں گے۔ جب تک ذکر قائم ہے روح تازہ رہے گی اور روح کی تازگی سے بدن تازہ رہے گا، نفس کے اندر صفائی ہو تو نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان ہو یا دنیا کا کوئی بھی جزو ہو وہ جبھی تک زندہ ہے جب تک اس میں ذکر اللہ (یاد خداوندی ہے) ذکر نہ ہو تو عالم کے لئے فنا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔

دنیا اللہ کی محبت اور خوف خدا سے قائم ہے۔

دنیا کے بہت سے طبقات کو یہ دعویٰ ہے کہ اس دنیا کو ہم نے سنبھال رکھا ہے۔ کاشتکار دعویٰ کرتا ہے کہ ''دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کھانے پینے سے قائم ہے میں اگر غلہ (اُگاتا ہوں، گیہوں، چاول، چنا سب میری وجہ سے اُگتا ہے) اُگانا چھوڑ دوں لوگوں کو کھانے کو نہ ملے ساری دنیا فنا ہوجائے۔ تو دنیا کی زندگی تو میرے دم سے قائم ہے۔ اگر کاشتکار اور زمین دار نہ ہوں تو دنیا ختم ہوجائے''۔ تاجر نے آکر کہا کہ ''دنیا کو تو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ اس لئے کہ تو کچی جنس اُگاتا ہے۔ ان اجناس کو بنا سنوار کر میں دوکان پر نہ لاؤں۔ کپڑا، غلہ، پھل پھول سپلائی نہ کروں۔ دنیا بھوکی مرجائے گی۔ تو میری بدولت یہ دنیا قائم ہے۔ تو نے غلے کا انبار لگا دیا۔ روٹی کے ڈھیر رکھ دیئے میں نے آٹا بنوا کر، کپڑا بنا کر رکھا تو لوگوں کے کام آیا تو دنیا کو سنبھالنے والا تو میں ہوں۔ ان دونوں کے بالمقابل ایک سیاسی اور حکومت کا آدمی ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم دونوں غلط ہو۔ دنیا کو تو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ کیونکہ میں نے امن قائم کر رکھا ہے۔ اگر میں امن قائم نہ کروں تو کاشتکار تاجر کو ختم کردے اور تاجر کاشتکار کو۔ سرمایہ دار مزدور کو مار دے اور مزدور سرمایہ دار کو۔ کاشتکار اور تاجر کی دوکانوں پر ڈاکے مارے جائیں۔ یہ میں نے عدل وانصاف سے دنیا کو سنبھال رکھا ہے''۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''تم سب غلط کہتے ہو۔ دنیا کو سنبھالنے والا ہمارا نام لینے والا ہے۔ جو ہماری یاد میں مصروف ہے اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے''۔ غور کریں تو اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہی سچا ہے۔ اگر کاشتکار دیانت داری سے کام کرتا ہے۔ جتنا غلہ اس کے ہاں اُگتا ہے۔ اس کو بازار میں جا کر بیچ دیتا ہے۔ نہ بے ایمانی کرتا ہے نہ دوسرے کے غلے کو اپنے غلے میں ملاتا ہے تو جب تک وہ دیانت داری سے کام کرتا ہے اس کا کام بھی خوب چلتا ہے اور دنیا کا کام بھی چلتا رہتا ہے۔ کاشتکار کی یہ دیانت داری اس کی طرف سے ذکر اللہ ہے۔ اس نے دیانت داری کیوں کی؟ اس لئے کہ اسے خوف خداوندی ہے۔ وہ اللہ سے محبت رکھتا ہے۔ اس کو راضی رکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح زمین دار نے اگر سنبھال رکھا ہے تو دیانت داری سے۔ سیاسی آدمی نے اگر سنبھال رکھا ہے تو عدل وانصاف سے۔ تو زمیندار کی دیانت داری اور تاجر کا عدل و انصاف ان کی طرف سے ذکر اللہ ہے۔ انہیں اللہ یاد ہے جبھی انہوں نے دیانت اور عدل سے کام لیا۔ اس طرح یہ دنیا کو سنبھالنے والوں میں شامل ہوگئے۔

درحقیقت تاجر کی دیانت داری نے دنیا کو سنبھالا ہے۔ یہاں تاجر کی طرف سے اس کی یہ دیانت داری ذکر اللہ ہے۔ تو اللہ کا نام لینے والے دنیا کو سنبھالنے والے ہیں۔ کرسی عدالت پر بیٹھنے والا جج یا کرسی پر بیٹھنے والا حاکم۔ بے شک اس نے امن کا نظام قائم کر رکھا ہے مگر کب؟ جبکہ وہ عدل وانصاف کرے اور کسی پر ظلم نہ کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے ایمان والو! اقوام بالقسط بن جاؤ''۔ یعنی عدل وانصاف سے فیصلے کرو۔ دیانت داری سے فیصلے کرو اگرچہ دیانت داری سے تمہارے نفس کے خلاف ہی فیصلہ ہو۔ تو اپنے اوپر برداشت کرو۔ مگر فیصلہ حق کا کرو۔ اگرچہ تمہاری اولاد پر بن جائے۔ مت پرواہ کرو۔ عدل سے کام لو۔

امیر المومنین حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک دعویٰ کیا اور قاضی شریح نے امیر المومنین کو عدالت میں طلب کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ خلیفۃ المسلمین ہیں اور قاضی شریح ان کے ماتحت ہیں لیکن عدل اور انصاف کا مقام اتنا بڑا ہے کہ امیر ہو، غریب، عوام ہو خلیفہ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ ایک مدعی اور مدعا علیہ کی طرح سے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ امیر المومنین ہیں تو ان کے لئے کرسی بچھا دی جائے اور مدعی بن کر آئے گا تو اسے وہیں کھڑا ہونا ہوگا جہاں عام مدعی اور مدعا علیہ کھڑے ہوں گے۔

حضرت علیؓ کے پاس سمن پہنچا کہ آپ عدالت میں حاضر ہو جائیں۔ اور یہودی کو بھی عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ امیر المومنین کے سامنے یہودی کی کیا حیثیت، دونوں کو حاضر ہونا پڑا اور دونوں کو ایک درجے میں کھڑا ہونا پڑا۔ قاضی کی نگاہ میں دونوں ایک درجے کے تھے اس لئے دونوں کو برابر برابر کھڑا کیا گیا۔ قاضی شریح نے فرمایا کیا دعویٰ ہے؟ امیر المومنین نے فرمایا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے میری زرہ پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ مجھے دیتا نہیں ہے حالانکہ زرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا ان کی زرہ نہیں ہے یہ میری ہے۔ حالانکہ زرہ حضرت علیؓ کی تھی۔ قاضی شریح نے کہا کہ کوئی گواہ ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ''ہاں ایک تو میرا غلام ہے اور ایک میرا بیٹا حضرت حسنؓ ہیں''۔ قاضی نے کہا کہ '' بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں اور دو گواہ کے بغیر دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور گواہ لاؤ''۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ''یہی دو گواہ ہیں ایک میرا بیٹا اور ایک میرا غلام۔ قاضی نے کہا ایک گواہ کی موجودگی ناکافی ہے آپ کو ڈگری نہیں دی جا سکتی۔ یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ زرہ اسی کی ہے۔ حضرت علیؓ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا دعویٰ سچا تھا۔ مگر ضابطے کا ثبوت میسر نہیں ہوا۔ اس لئے فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا۔ یہودی پر اس عدل کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے وہاں کھڑے کھڑے ہی کہا: '' اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ '' اور سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا اور کہا کہ ''جس دین کے اندر اتنا عدل و انصاف ہے کہ ایک امیر المومنین اور ایک غریب سے غریب غیر مسلم کو ایک نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میں اس کی حقانیت کا قائل ہو گیا ہوں اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ میرا دعویٰ غلط تھا۔ سچے حضرت علیؓ ہی ہیں اور اپنی زرہ ان کو دے دی''۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ''اب مجھے زرہ کی ضرورت نہیں۔ زرہ بھی تو رکھ لے تیرا دین جب میرا دین بن گیا تو مجھے سب کچھ مل گیا''۔ تو ایک سچائی نے کتنوں کو فائدہ پہنچایا؟۔ امیر المومنین کی حقانیت کھلی، یہودی کو دین نصیب ہوا، زرہ بھی اس کو مل گئی، اسلام کی عظمت واضح ہو گئی۔ ایک سچائی سے کتنی برکات حاصل ہوئیں؟ اور کتنے فائدے حاصل ہوئے۔ افراد کے حق میں الگ، دین کے حق میں الگ اور اسلام کی عدالت کے حق میں الگ۔

اس لئے اگر ایک حاکم عدل سے فیصلے کر رہا ہے تو درحقیقت اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ مگر حاکم نے نہیں اس کی دیانت داری اور عدل نے سنبھال رکھا ہے۔ اب حاکم کی طرف سے اس کا عدل ذکر اللہ ہے (اسے اللہ یاد ہے ، اسے خوف الٰہی ہے، اسے اللہ سے محبت ہے تو وہ عدل کر رہا ہے) تو بات وہی نکلی کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔ اگر حاکم عدالت دیانت چھوڑ دے تو یہ سب دنیا کی تباہی کا ذریعہ بنیں گے۔

حضرت عمرؓ کا زمانہ ہے، خلافت کا دور ہے، حضرت عمرؓ کا رعب اور دبدبہ وہ ہے کہ ان کا نام سن کر تمام دنیا کے بادشاہوں کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جبلہ ابن اوھم جو روم کا بادشاہ یا گورنر تھا دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ گیا اور پھر حج کے لئے مکہ مکرمہ چلا گیا۔ وہ طواف کر رہا تھا تو قبیلہ فزار کا ایک بدوی دیہاتی بھی طواف کر رہا تھا۔ جو لوگ حج کرنے گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مطاف کے اندر ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی ایک وقت میں طواف کر رہے ہوتے ہیں تو دھکے بھی لگتے ہیں۔ ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن نہ تو کوئی جان بوجھ کر وہاں دھکے دیتا ہے اور نہ جان بوجھ کر کوئی کسی کو گراتا ہے۔ تو کوئی کسی سے ٹکرا جائے یا گر جائے تو کوئی برا نہیں مانتا، نہ بدلہ لیتا ہے اور نہ ہی مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا وہ دیہاتی بدو بھی طواف کر رہا تھا۔ جبلہ ابن اوھم بھی طواف کر رہا تھا تو جبلہ ابن اوھم کی لنگی پر اس دیہاتی کا پیر پڑ گیا اور لنگی کی گرہ کھل گئی جبلہ نے جلدی سے لنگی کو سنبھالا وہ اپنے ہاں کا بادشاہ تھا جذبات اس کے وہی تھے اس نے دیکھا کہ اس کی لنگی پر ایک دیہاتی کا پیر پڑا ہے اس نے زور سے ایک طمانچہ مارا۔ وہ دیہاتی بے چارہ چوٹ کھا کر گرا۔ اس نے جبلہ بن اوھم کو دیکھا اور پھر کھڑا ہو گیا اور طواف میں مشغول ہو گیا۔ دیہاتی نے حضرت عمرؓ کے ہاں دعویٰ کیا کہ اس نے ناحق مجھے طمانچہ مارا ہے۔ اس کی لنگی پر میں نے جان بوجھ کر پیر نہیں رکھا تھا اور وہاں کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی کہ لنگی پر آدمی جان بوجھ کر پیر ڈالے گا۔ مجمع کے اندر کوئی کسی کی لنگی کھول کر تھوڑی لے جائے گا۔ اس نے کہا یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور میں نے اس پر بدنیتی سے بھی پیر نہیں ڈالا۔ ہزاروں آدمی وہاں موجود تھے۔ دھکے مکے میں میرا پیر لگ گیا تو یہ غلطی ہو گئی مگر یہ ارادی غلطی نہیں تھی یہ مجھے تنبیہ کر سکتا تھا۔ دھول مارنے کا کونسا موقعہ تھا؟ اس کا کیا حق تھا؟ یہ دعویٰ دائر کر دیا۔

حضرت عمرؓ کی عدالت میں جبلہ بن اوھم کے نام پر سمن جاری ہوا کہ عدالت میں حاضر ہو وہ حاضر ہوا۔ آپؓ نے اس سے فرمایا" تو نے دیہاتی کو چپت کیوں ماری"؟ اس نے کہا" اس نے میری لنگی پر پیر ڈالا تھا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا" لنگی پر پیر ضرور پڑا لیکن وہ جگہ ایسی ہے کہ وہاں ایسا ہو جاتا ہے۔ وہاں ارادے سے کوئی کسی پر پیر نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے تم سے قصاص لیا جائے گا۔ یا تو یہ دیہاتی تمہارے بھی اتنی ہی زور سے چپت مارے جیسے تم نے اس کو ماری تھی یا پھر تم مالی طور پر اس کو کچھ ادا کرو؟ اس نے جو چوٹ کھائی ہے۔ اس کے بدلے میں کچھ مال اسے دے دو"۔ جبلہ نے کہا" ایک بادشاہ اور ایک دیہاتی برابر ہیں" ؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا" اسلام میں دونوں برابر ہیں۔ یہاں پر کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ اللہ کے گھر میں ایک دیہاتی اور ایک امیر بالکل برابر ہیں۔ یہاں سب بندے ہیں۔ بندہ نواز کوئی نہیں۔ بندہ نواز تو اللہ کی

ذات ہے جو ہر دم اپنے بندوں کو نوازتا رہتا ہے۔ اس عدالت میں بھی میں اور یہ دیہاتی برابر ہیں۔ بادشاہ اور فقیر ایک جیسے ہیں"۔ جبلہ کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اس وقت وہ خاموشی سے واپس آ گیا۔ راتوں رات بھاگ گیا۔ اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور دوبارہ عیسائی بن گیا۔ عیسائیوں نے خوشیاں منائیں۔ اس کی بادشاہت اس کو واپس مل گئی۔ اسلام نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ایک صحابیؓ قسطنطنیہ بلا ارادہ ہجرت، تجارت کے سلسلے میں تشریف لے گئے تو جبلہ ابن اوھم کو اس کی خبر ہوئی کہ ایک صحابیؓ آئے ہیں آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی۔ ان صحابی کو اس نے دعوت دی اور بلایا۔ صحابی دعوت پر پہنچ گئے تو اس نے کہا ''آپ کو معلوم ہے میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور ایک دیہاتی بدو کے ساتھ میرا مقدمہ ہوا تھا اور تمام باتیں ان صحابیؓ کو بتائیں اور بتایا کہ میں یہ کہہ کر چلا آیا تھا کہ ایک بادشاہ اور ایک دیہاتی برابر نہیں ہو سکتے۔ لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک مجھے سکون نہیں ملا۔ میں ہر وقت بے سکون اور بے چین رہتا ہوں۔ سچی بات وہی تھی جو حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی۔ میں اس پر نادم ہوں کہ میں مرتد ہوا۔ گو مجھے ظاہری بادشاہت تو مل گئی لیکن میرے دل کا سکون اور چین ختم ہو گیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام قبول کر لوں مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس لئے اپنے وقار کو بھی قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں اپنی قوم کو یہ کہہ سکوں کہ میں نے اسلام قبول کر لیا تو کیا ہوا مجھے فلاں نعمت بھی تو مل گئی اور وہ یہ کہ اگر امیر المومنین حضرت عمرؓ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں تو میں اس کو حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں گا۔ بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں۔ یا میں ہی انکار کر دوں گا لیکن میرے لئے ایک بات بن جائے گی اور میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں جب وہ اپنی بیٹی مجھے دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے اس کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ اس لئے میں پھر اسلام قبول کر رہا ہوں''۔

ان صحابی نے کہا کہ ''میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس جا کر اس کا ذکر کروں گا اور پھر آپ کے پاس آ کر جواب دوں گا''۔ چنانچہ یہ واپس ہوئے اور حضرت عمرؓ کو سارا واقعہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ''تم نے کیوں نہ وہیں وعدہ دے دیا عمرؓ کی بیٹی اسلام کے مقابلے میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمر کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے میری بیٹی کی اسلام کے مقابلے میں کیا وقعت ہے''؟ تمہیں وعدہ کر کے آنا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا ''امیر المومنین میں تو ڈر رہا تھا۔ میں کیسے وعدہ کر سکتا تھا؟'' فرمایا" نہیں فوراً واپس قسطنطنیہ جاؤ اور جبلہ سے کہو کہ عمر کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر"۔ چنانچہ وہ واپس ہوئے لیکن جب قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جبلہ ابن اُوھم کا جنازہ جا رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام قبول کرنا نہیں تھا۔ صحابی بے چارے واپس آ گئے۔

تو ایک حاکم عدالت یا امیر کرسی عدالت پر بیٹھ کر دنیا کو سنبھال رہا ہے اور امن قائم کر رہا ہے تو حاکم عدالت دنیا کو نہیں سنبھال رہا بلکہ اس کا عدل دنیا کو سنبھال رہا ہے۔ اب حاکم کی طرف سے اس کا عدل ہی ذکر اللہ ہے۔ بس دنیا کو سنبھالنے والے اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔

سلاطین دنیا بدنوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں۔

ظاہر میں یہ بے چارے اللہ اللہ کرنے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ کوئی مال و دولت نہیں رکھتے، کوئی لاؤ لشکر اور فوج ان کے پاس نہیں۔ مگر ان کا سب سے بڑا لشکر اور فوج اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی مقبولیت ہے۔

مولانا جامی کہتے ہیں کہ ''یہ جو اللہ اللہ کرنے والے ہوتے ہیں یہ اللہ کے عشاق ہیں یہ عاشقین خداوندی ہیں۔ انہیں حقارت سے مت دیکھو یہ بادشاہ ہیں اگرچہ ان کے سر پر تاج نہیں ہے اور لاکھوں کا پٹکا ان کے سر پر بندھا ہوا نہیں۔ یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تاج والا بادشاہ بدنوں پر حکومت کرتا ہے اور یہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہوں کی عزت اور عظمت آدمی جبری طور پر کرتا ہے۔ دل سے چاہے نہیں چاہتا تب بھی عزت کرتا ہے لیکن اللہ والوں کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے''۔ تو حقیقی محبت اور حقیقی عظمت وہ ہے جو دلوں سے کی جائے اور دلوں میں کی جائے۔ دنیا کے بادشاہوں کی عظمت بھرے مجمعوں میں تو ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ کا ڈر ہوتا ہے۔ اس ڈر کے مارے آدمی بادشاہ کی عزت و عظمت کرتا ہے اور تنہائی میں آ کر لعنت بھیجتا ہے۔ لیکن اللہ والوں کے سامنے بھی اور تنہائی میں بھی گستاخی نہیں کرتا سمجھتا ہے میری آخرت بگڑ جائے گی۔

پھر یہ کہ ان کی عظمت کے لئے ان کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔ وہ نگاہوں کے سامنے چھوڑ، دنیا میں بھی نہ ہوں پھر بھی عظمت کی جاتی ہے۔ آج حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام آئے تو ہمارے قلوب جھک جاتے ہیں اور ہم کہتے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اللہ ان سے راضی ہو) آج حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا نام آئے تو ہم عقیدت سے اپنی گردن جھکا لیتے ہیں اور کہتے ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔

سب لوگ اللہ کے مقبول بندے تھے۔ ان کی برکات ان کے قلوب میں موجود تھیں ان کی عظمت کی وجہ سے آج تک ہماری گردن جھکی ہوئی ہے۔ تو ان کی حکومت دلوں پر ہے اور ایسی کہ وہ دنیا میں بھی نہیں۔ جب بھی حکومت قائم ہے۔

مسٹر آرنلڈ سرسید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ انہوں نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی ہے۔ اس نے اسلامی تہذیب کے دور دہرائے ہیں کہ اسلام دنیا میں کس کس طرح پھیلا؟ عرب ہندوستان چین وغیرہ میں کیسے آیا؟۔ اسلامی طور طریقے، آداب، مبلغین اسلام کی محنتیں اوجانفشانیاں اور ان کی جدوجہد ان سب پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ایک حقیقت کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہندوستان میں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب میں اجمیر گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے اور پوری ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔ اس کو لوگ امیر الہند، امام الہند، سلطان الہند کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر غریب نوازؒ۔

اس لئے کہ خواجہ صاحب نے ہندوستان میں آکر اسلام کو پھیلایا، اجمیر شریف میں چھپر کی ایک کٹیا ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہندو مسلم اور دیگر غیر مسلم ان کے دربار میں حاضر ہوتے۔ عقیدت سے بیٹھتے ان کی زبان ترجمان سے کلمات حق سنتے ان کی دیانت ان کے معاملات کی صفائی اور خدا پرستی دیکھ کر قلوب پر اثر ہوتا۔ ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ خود اس آرنلڈ نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز کے ہاتھ پر بلا واسطہ ننانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کی تعداد الگ ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ اجمیر میں ایک انوکھا واقعہ ہے کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا پورے ہندوستان کا سلطان بنا ہوا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ حالانکہ خواجہ صاحب دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی عظمت ایسی قائم ہے جیسے اگر خواجہ صاحب دنیا میں ہوتے تو ان کی عظمت اور عزت ہوتی۔ یہی بات ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دلوں پر ان کی عظمت اور حکمت قائم ہوتی ہے۔ آخر ان لوگوں کی عظمت ہمارے دلوں میں کیوں ہے؟ اس لئے کہ ان کے دلوں میں ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ یاد حق نے ان کو اللہ سے ملا دیا ہے۔ خاصانِ خدا، خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے۔ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو اہل اللہ کا ذکر بھی آتا ہے اور جب اہل اللہ کا ذکر آتا ہے تو اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین ﷺ کا ذکر بھی آتا ہے۔

تو ذکر اللہ درحقیقت سب سے بڑی سلطنت ہے۔ جب یہ سلطنت آجاتی ہے تو ان لوگوں کی حکومت لوگوں کے قلوب پر قائم ہو جاتی ہے۔ انبیاء کرام علیہ السلام اور اولیا عظامؒ کی محبت لوگوں کے دلوں میں ذکر اللہ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت

حضرت بایزید بسطامیؒ اولیا اللہ میں سے ہیں۔ ایک دن ان کی زبان سے ایک بڑا بھاری کلمہ نکلا وہ یہ کہ جب وجد طاری ہوا اور معرفت الٰہی کا غلبہ ان پر طاری ہوا تو زبان سے نکلا ''ملکی اعظم من ملک اللہ'' ترجمہ: ''میری سلطنت اللہ کی سلطنت سے بڑی ہے''۔ تمام مرید پریشان دم بخود جب شیخ کو ہوش آیا اور آفاقہ ہوا تو انہوں نے کہا حضرت آج آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا تھا۔ فرمایا کفر کا کلمہ؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ انہوں نے کہا کہ "تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہ خبردار کیا؟ تم نے کیسے برداشت کیا؟ آپ ناراض ہوئے اور یہ بھی کہا کہ آئندہ کبھی میری زبان سے کوئی کفریہ کلمہ نکلے تو مجھے سزا دینا۔ کفریہ کلمہ منہ سے نکالنے والا ایسا نہیں ہوتا کہ اسے معاف کیا جائے۔ فوراً ہی اس کو تنبیہ کی جائے اور اس کی خبر لی جائے''۔

شیخ پر دو چار دن کے بعد پھر غلبہ حق ہوا۔ پھر وجد میں آئے، پھر وہی کلمہ منہ سے نکلا ''مُلکی اعظم من ملک اللہ'' مریدین کے لئے شیخ کا حکم تھا۔ انہوں نے شیخ کے کہنے کے مطابق گھر میں رکھا ہوا کوڑا اٹھایا اور اس کو شیخ پر مارا (منشاء شیخ کو ہوش میں لانا تھا) لیکن وہ کوڑا دوبارہ مارنے والے کی طرف پلٹا اور اس کی اپنی پیٹھ پر پڑا۔ اس کے بعد دوسرے مرید نے اٹھایا۔ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہ بیچارے مرتے کیا نہ کرتے شیخ کا حکم بجالانے کے لیے کوڑا اٹھاتے اور کوڑا ان کی پیٹھ پر پڑتا۔ کچھ ہی دیر میں یہ سب تھک گئے اتنے میں شیخ کو ہوش آگیا۔ تو سب کو تکلیف میں پایا۔ وجہ معلوم کی تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے۔ شیخ نے پھر پوچھا مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا تھا؟۔ مریدوں نے بتایا کہ آپ نے کہا تھا ''ملکی اعظم من ملک اللہ'' میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔

شیخ نے کہا بیوقوفو، نامعقولو یہ کلمہ کفر کا کلمہ کہاں ہے؟ یہ تو عین توحید کا کلمہ ہے۔ انہوں نے کہا حضرت یہ کیسے ایمان کا کلمہ ہے؟ فرمایا اس کا مطلب سمجھ لو۔ یہ بتاؤ کہ اللہ کا ملک کیا ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا اللہ کا ملک ہے یہ زمین، یہ آسمان، یہ پہاڑ، یہ سورج، چاند، تارے میں ہوں۔ تم ہو یہ سب اللہ کا ملک ہے اور میرا ملک کیا ہے؟ میرا ملک کہاں ہے؟ میرا ملک ہے اللہ۔ اس کی ذات اس کی صفات، میں اسی میں گھیرا رہتا ہوں تو میرا ملک اللہ کی ذات اور اللہ کا ملک میری ذات۔ اب

بتاؤ کہ میرا ملک بڑا ہے یا اللہ کا ملک؟

تو بظاہر یہ کلمہ کفر تھا مگر شیخ نے بتایا کہ یہ تو عین ایمان کا کلمہ ہے تو میرا ملک اللہ کی ذات ہے تو ملک میرا بڑا رہا۔ جس کو وہ ملک ہاتھ آجائے وہ تو اس پورے جہان کی پرواہ نہیں کرے گا۔ اب دیکھئے ظاہر ذکر اللہ ہے۔ اب اگر نماز پڑھنے کے باوجود انسان فحش اور برائی سے نہیں بچتا تو نماز کا صرف ڈھانچہ قائم ہے اور نماز کے اندر جو ذکر ہے اس کی روح ہے۔ روح ہوتی تو نماز جاندار ہوتی تو یقیناً جاندار نماز ہر برائی سے بچاتی ہے۔ نماز عظمت خداوندی ہے اور یاد حق ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں غرق رہے دوسری چیزیں دل سے فنا ہو جائیں تو یاد جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ بے حیائی سے بچے گا۔ یاد نہیں ہوگی تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے جب بھی نہیں بچے گا۔ لیکن روح نہ ہونے کی وجہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے۔ یعنی حاضری اور وقت پر حاضری ضروری رکھی جائے۔ حضوری کے لئے دعا کرتے رہیں۔ یہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے کسی نہ کسی وقت نصیب ہو ہی جائے گی۔

ذکر کثیر کے حصول کی سہل صورت

ذکر کی سیدھی صورت یہ ہے کہ شریعت نے جو اعمال بتائے ہیں اگر بچوں کو شروع ہی سے یاد کروا دیئے جائیں تو موقع بموقع کی دعائیں پڑھی جاتی رہیں اور یہی ذکر کثیر ہے۔ قرآن پاک میں جو حکم ہے: (سورہ الاحزاب، آیت نمبر 41)

ترجمہ: ''اے ایمان والو اللہ کا ذکر کثیر کرو''۔

تو یہ کثرت ذکر کیا ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن اوقات کی جو دعائیں ہیں انہیں اوقات میں پڑھی جائیں

مثلاً صبح اٹھتے ہی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَیْہِ النُّشُوْر

رات کو سوتے وقت: اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَ اَحْیٰی

کھانے سے پہلے: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

کھانے کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

باتھ روم میں جاتے وقت بایاں قدم اندر رکھ کر: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَائِث

باتھ روم سے نکلتے وقت دایاں پاؤں باہر رکھ کر: غُفْرَانَکَ اَللّٰھُمَّ

صبح و شام چھ چھ تسبیحات کرنی ہیں

1۔ تیسرا کلمہ 2۔ پہلا کلمہ 3۔ استغفر اللہ 4۔ درود شریف 5۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم

6۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ

صبح کی تسبیحات، ظہر تک ختم کر لیں اور پھر یہی تسبیحات ظہر کے بعد سے عشاء تک مکمل کر لیں۔ تلاوت قرآن ضرور روزانہ کرنا چاہے دو رکوع ہی پڑھا جائے۔

مندرجہ ذیل سورتوں کے دس دس خاص فضائل ہیں جو خاص ان سورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لئے ان سورہ مبارکہ کو روزانہ پڑھنا چاہیے۔

چھوٹی سورتیں:

1۔ سورۃ فاتحہ 2۔ سورۃ کوثر 3۔ سورۃ کافرون 4۔ سورۃ اخلاص 5۔ سورۃ فلق 6۔ سورۃ الناس

بڑی سورتیں:

1۔ سورۃ یٰسین 2۔ سورۃ واقعہ 3۔ سورۃ دخان 4۔ سورۃ الملک

جمعہ کے دن سورۃ کہف اور درود شریف 500 مرتبہ باقی روٹین کی پڑھائی۔

****

فضائل ذکر الٰہی (حصہ دوم)

حدیث قدسی ہے (حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے کسی قول یا فعل کو روایت کریں) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں جیسا وہ میرے متعلق گمان رکھتا ہے میں ویسا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنے دل میں (تنہائی میں) میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اپنی تنہائی میں اسے یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی ان کے مجمع میں (فرشتوں کے مجمع میں) اس کا ذکر کرتا ہوں''۔ (مسلم، بخاری، ترمذی، نسائی)

1- قرآن پاک سورہ العنکبوت، آیت نمبر 45 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"کوئی چیز (عمل خیر) اللہ کے ذکر سے افضل نہیں ہے"۔

2- قرآن پاک، سورہ طٰہٰ، آیت نمبر 14 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے''۔

3-قرآن پاک، سورہ الاحزاب، آیت نمبر 41 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو''۔

4-قرآن پاک، سورہ البقرہ، آیت نمبر 152 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا''۔

<u>احادیث مبارکہ میں ذکر کی اہمیت وفضیلت:</u>

1-ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

''رسول پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے (اس پر مامور ہیں کہ راستوں میں گھوم پھر کر اللہ کا ذکر کرنے والوں کو تلاش کریں۔ پس وہ کسی جماعت کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ آؤ اپنے مقصود (ذکر اللہ) کی طرف آ جاؤ۔ تو وہ سب فرشتے مل کر آسمان تک ان ذکر کرنے والوں کو اپنے بازوؤں کے سائے میں لے لیتے ہیں"۔ (مسلم، بخاری)

2-حدیث:

حضور اقدس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ دنیا میں نرم نرم بستروں پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت کے اعلیٰ درجوں تک انہیں پہنچا دیتا ہے"۔ (مسلم، ترمذی)

3-حدیث:

حضور پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ اور مردے کی سی ہے کہ ذکر کرنے والا زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے"۔ (مسلم، بخاری، بیہقی)

4-حدیث:

حضور پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر ایک شخص کے پاس بہت سے روپے ہیں اور وہ ان کو تقسیم کر رہا ہے اور دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے تو ذکر کرنے والا افضل ہے"۔ (طبرانی)

5-حدیث:

حضور اقدس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت میں جانے کے بعد اہل جنت کو دنیا کی کسی چیز کا بھی قلق اور افسوس نہ ہوگا سوائے اس گھڑی کہ جو دنیا

میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر گزر گئی ہوگی"۔(طبرانی، بیہقی)

6- حدیث :

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جو لوگ بھی اللہ کے ذکر کے لیے جمع ہوتے ہیں اور ان کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہوتا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ ندا کرتا ہے کہ تم لوگ بخش دیئے گئے اور تمہاری برائیاں نیکیوں سے بدل دی گئیں ہیں"۔(طبرانی، احمد، بیہقی)

7- حدیث :

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ کے ذکر سے بڑھ کر کسی آدمی کا کوئی عمل عذاب قبر سے زیادہ نجات دینے والا نہیں ہے"۔(طبرانی، ترمذی)

8- حدیث :

حضرت زیدؓ ارشاد فرماتے ہیں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے" مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم ڈر اور خوف کی وجہ سے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے ورنہ میں اس کی دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی عذاب قبر دکھادے"۔(السلسلۃ الصحیحۃ)

9- حدیث :

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض قوموں کا حشر اس طرح فرمائیں گے کہ ان کے چہروں پر نور چمکتا ہوا ہوگا وہ موتیوں کے ممبروں پر ہوں گے۔لوگ ان پر رشک کرتے ہوں گے وہ انبیاء اور شہداء نہیں ہوں گے "۔کسی نے عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ آپ خاتم النبیین ﷺ ان کا حال بیان کر دیجئے تا کہ ہم ان کو پہچان لیں"۔حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی محبت میں مختلف جگہوں اور مختلف خاندانوں سے آ کر ایک جگہ جمع ہوں گے اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں گے"۔(طبرانی)

10- حدیث :

حدیث میں ہے "جنت میں یاقوت کے ستون ہوں گے جن پر زمرد (زبرجد) کے بالا خانے ہوں گے۔ان میں چاروں طرف دروازے کھلے ہوئے ہوں گے وہ ایسے چمکتے ہوں گے جیسے کوئی روشن ستارہ چمکتا ہے۔ان بالا خانوں میں وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ ہی کے واسطے ایک جگہ اکٹھے ہوں اور وہ لوگ جو اللہ ہی کے واسطے آپس میں ملتے جلتے ہوں"۔(جامع صغیر، بیہقی)

11- حدیث :

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" جب جنت کے باغوں پر گزرو تو خوب چرو"، کسی نے عرض کیا "یا رسول اللہ جنت کے باغ کیا ہیں"؟ ارشاد فرمایا "ذکر کے حلقے"۔(ترمذی، بیہقی)

12- حدیث :

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو تم میں سے عاجز ہو راتوں کو محنت کرنے سے اور بخل کی وجہ سے مال بھی خرچ نہ کیا جاتا ہو اور بزدلی کی وجہ سے جہاد میں بھی شرکت نہ کر سکتا ہو اس کو چاہیے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرے"۔(طبرانی، بیہقی)

13- حدیث :

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ کا ذکر اس قدر کثرت سے کیا کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں"۔(ابن حبان، حاکم)

14- حدیث :

ایک حدیث میں ہے "(ذکر اللہ) سے غافل لوگوں میں اللہ کا ذکر کرنے والا اس مجاہد کی مانند ہے جو (میدان جنگ سے) بھاگنے والوں (کی جماعت) میں ثابت قدم رہا"۔(مشکوۃ المصابیح)

15- حدیث :

ایک حدیث میں ہے" ذاکرین ہنستے ہوئے جنت میں جائیں گے"۔(صحیح ابن حبان)

حضرت عثمانؓ جب کسی قبر پر تشریف لے جاتے تو اس قدر روتے تھے کہ داڑھی مبارک تر ہو جاتی تھی۔ کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ آپ جنت اور دوزخ کے ذکر سے ایسا نہیں روتے جتنا کہ قبر کے سامنے آجانے پر روتے ہیں؟۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا "قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔ جو شخص اس سے نجات پالے، بعد کی تمام منزلیں اس پر سہل ہو جاتیں ہیں اور جو اس سے نجات نہ پائے بعد کی تمام منزلیں دشوار ہوتی چلی جاتی ہیں"۔ پھر آپؓ نے حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد سنایا حضور پاک خاتم النبیین ﷺ یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ''کوئی منظر قبر سے زیادہ گھبراہٹ والا نہیں ہے''۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ'' حضور پاک خاتم النبیین ﷺ ہر نماز کے بعد عذاب قبر سے پناہ مانگا کرتے تھے''۔ (بیہقی)

16- حدیث :

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا " کس بات نے تم کو یہاں بیٹھایا ہے"؟ عرض کیا "یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کی حمد وثنا کر رہے ہیں کہ اس نے ہم لوگوں کو اسلام کی دولت سے نوازا یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی احسان ہم پر ہے"۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "اللہ کی قسم کیا صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہو "، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "اللہ تعالیٰ کی قسم صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہیں"۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا " کسی بدگمانی کی وجہ سے میں نے تم لوگوں کو قسم نہیں دی بلکہ جبرائیل ابھی ابھی میرے پاس آئے تھے اور مجھے یہ خبر سنا گئے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی وجہ سے ملائکہ پر فخر فرما رہے ہیں"۔ (مسلم، احمد، ترمذی، نسائی)

17- حدیث :

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں؟ جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر اور تمہارے پروردگار کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن سے (میدان جہاد میں) مقابلہ کرو اور پھر تم ان کی گردنیں کاٹو۔ اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں"؟ صحابہؓ نے عرض کیا " کیوں نہیں یارسول اللہ ضرور بتلایئے" آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "وہ عمل اللہ کا ذکر کرنا ہے''۔ (ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

18- حدیث:

حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ دولت کدہ میں تھے کہ آیت: (سورہ الکہف، آیت نمبر 28)

واصبر نفسک مع الّذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی

نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اپنے آپ کو ان لوگوں کے پاس بیٹھنے کا پابند کیجئے جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں''۔

حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ اس آیت کے نازل ہونے پر لوگوں کی تلاش میں نکلے۔ ایک جماعت کو دیکھا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہے۔ بعض لوگ ان میں بکھرے ہوئے بالوں والے اور خشک کھالوں والے اور صرف ایک کپڑے والے ہیں (کہ ننگے بدن ایک لنگی صرف ان کے پاس ہے) جب حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ان کو دیکھا تو ان کے پاس بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا "تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ خود مجھے ان کے پاس بیٹھنے کا حکم ہے"۔ (طبرانی)

19- حدیث:

حضرت سیدنا ابوایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ:

''جو شخص صبح کی نماز کے بعد اُسی ہیت سے بیٹھے ہوئے بولنے سے قبل یہ دعا دس مرتبہ پڑھے گا

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحی ویمیت وھو علی کل شی قدیر ہ

ترجمہ: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کہ وہ اپنی ذات اور صفات میں اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں سارا ملک دنیا اور آخرت اس کا ہے جتنی خوبیاں ہیں وہ اسی پاک ذات کے لیے ہیں وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہی ہر چیز پر قادر ہے"۔

تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی دس برائیاں معاف فرمادی جائیں گی اور جنت میں دس درجے بلند کئے جائیں گے اور تمام دن شیطان اور مکروہات سے محفوظ رہے گا"۔(مسند احمد)

20- حدیث:

رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جو کسی جگہ بیٹھے اور اس میں وہ اللہ کا ذکر نہ کرے، تو یہ بیٹھک اللہ کی طرف سے اس کے لیے باعث حسرت ونقصان ہوگی اور جو کسی جگہ لیٹے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو یہ لیٹنا اس کے لیے اللہ کی طرف سے باعث حسرت ونقصان ہوگا"۔(سنن ابی داؤد)

21- حدیث:

ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو کوئی جماعت کسی بھی مجلس میں جمع ہوئی اور اللہ کا ذکر کئے بغیر وہاں سے منتشر ہوگئی تو ان کی یہ مجلس قیامت کے دن ان کے لیے بڑی حسرت اور افسوس کا باعث ہوگی"۔(السلسلۃ الصحیحۃ)

22- حدیث:

ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ سے دریافت کیا گیا "روز قیامت کون لوگ اللہ کے ہاں فضیلت ورفعت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں گے "؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں۔'' عرض کیا گیا " اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ! اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے سے بھی افضل"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''اگر چہ وہ کفار ومشرکین سے اس قدر تلوار کے ساتھ لڑائی کرے کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون سے رنگین ہوجائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا اس سے درجہ میں افضل ہے۔''(مشکوۃ المصابیح)

حافظ ابن حجرؒ نے منبہات میں لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ سے قرآن پاک کے ارشاد **وکان تحته کنز لهما** (سورہ الکہف، آیت نمبر 82) کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر سات سطریں لکھیں ہوئیں تھیں جن کا ترجمہ یہ ہے۔

1۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو موت کو جانتا ہے پھر بھی ہنسے۔

2۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ دنیا آخر ایک دن ختم ہونے والی ہے پھر بھی اس میں رغبت کرے۔

3۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ ہر چیز مقدر سے ہے پھر بھی کسی چیز کے جاتے رہنے پر افسوس کرے۔

4۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو آخرت میں حساب کا یقین ہو پھر بھی مال جمع کرے۔

5۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو جہنم کی آگ کا علم ہو پھر بھی گناہ کرے۔

6۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہو اور پھر کسی اور چیز کا ذکر کرے۔

7۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو جنت کی خبر ہو پھر بھی دنیا کی کسی چیز سے راحت پائے۔

بعض نسخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ

مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو شیطان کو دشمن سمجھے پھر بھی اس کی اطاعت کرے۔ حافظؒ ابن حجر نے حضرت جابرؓ سے حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد بھی نقل کیا ہے ''حضرت جبرائیلؑ مجھے اللہ کے ذکر کی تاکید اس قدر کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ بغیر ذکر کے کوئی چیز نفع نہ دے گی۔''(فضائل اعمال-مولانا محمد زکریا)

حافظ ابن قیمؒ ایک مشہور محدث ہیں انہوں نے ایک رسالہ عربی میں ''الوابل الصیب'' کے نام سے ذکر کے فضائل میں تصنیف کیا ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ذکر میں 100 سے زیادہ فائدے ہیں ان میں سے نمبروار 79 فائدے انہوں نے ذکر فرمائے ہیں جن کو مختصراً اس جگہ ترتیب وار نقل کیا جاتا ہے اور چونکہ بہت سے فائدے ان میں سے ایسے ہیں جن میں کئی کئی فائدے شامل ہیں اس لحاظ سے یہ 100 سے زیادہ پر مشتمل ہیں۔

1۔ ذکر شیطان کو دفع کرتا ہے اور اس کی قوت کو توڑتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔

3۔ ذکر دل سے فکر وغم کو دور کرتا ہے۔

4۔ دل میں فرحت اور سرور پیدا کرتا ہے, بدن اور دل کو قوت بخشتا ہے۔

5۔ چہرے اور دل کو روشن کرتا ہے

6۔ رزق کو کھینچتا ہے۔

7۔ ذکر کرنے والے کو ہیبت اور حلاوت کا لباس پہناتا ہے، یعنی اس کو دیکھنے سے رعب پڑتا ہے اور دیکھنے والے کو حلاوت نصیب ہوتی ہے۔

8۔ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے۔

9۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دروازہ ہے۔

10۔ ذکر سے مراقبہ نصیب ہوتا ہے جو انسان کو مرتبہ احسان تک پہنچا دیتا ہے۔

11۔ ذکر اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔

12۔ اللہ تعالیٰ کا قرب پیدا کرتا ہے

13۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دروازہ کھولتا ہے۔

14۔ اللہ کے ساتھ حضوری پیدا کرتا ہے۔

15۔ دل کو زندہ کرتا ہے۔

16۔ دل اور روح کی غذا ہے۔

17۔ دل کو زنگ سے صاف کرتا ہے۔

18۔ غفلت سے بچاتا ہے۔

19۔ لغزشوں اور خطاؤں کو دور کرتا ہے۔

20۔ وحشت کو دور کرتا ہے۔

21۔ جو ذکار بندہ کرتا ہے وہ عرش کے چاروں طرف بندے کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

22۔ جو شخص راحت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت میں اس کو یاد کرتا ہے۔

23۔ اللہ کے عذاب سے نجات کا ذریعہ ہے

24۔ سکینہ (تسکین اور رحمت اترنے کا سبب ہے) نازل ہونے کا سبب ہے۔

25۔ ذکر کی وجہ سے زبان جھوٹ، غیبت، بدگوئی وغیرہ سے محفوظ رہتی ہے۔

26۔ ذکر کی مجلس فرشتوں کی مجلس کہلاتی ہے۔

27۔ ذاکر قیامت کے دن حسرت سے محفوظ رہے گا۔

28۔ ذکر کے ساتھ تنہائی کا رونا بھی میسر ہو تو قیامت کے دن کی سختی سے محفوظ رہے گا۔

29۔ ذکر کرنے والے کو دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ ملتا ہے۔

30۔ باوجود سہل عبادت ہونے کے تمام عبادات سے افضل ہے۔

31۔ اللہ کا ذکر جنت کے پودے ہیں۔

32۔ دوامِ ذکر کی بدولت اپنے نفس کو بھولنے کی وجہ سے اسے نصیب ہوتا ہے۔

33۔ ذکر کا نور دنیا اور قبر میں ساتھ رہتا ہے۔

34۔ ذکر اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔

35۔ آدمی کے دل میں ایک گوشہ ہے جو سوائے ذکر کے کسی چیز سے پر نہیں ہوتا۔

36۔ ذکر تصوف کا اصل واصول ہے۔

37۔ ذکر شیطان کو بھگاتا ہے

38۔ ذکر آدمی کے دل کو نیند سے جگاتا ہے

39۔ ذکر ایک درخت ہے جس پر معرفت کے پھول لگتے ہیں

40۔ ذکر آدمی کو ہر وقت غفلت سے چوکنا رکھتا ہے

41۔ ذکر ذکر کرنے والے کو بغیر مال کے غنی کر دیتا ہے

42۔ ذکر اس پاک ذات کے قریب کر دیتا ہے جس کا ذکر کر رہا ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ معیت نصیب ہو جاتی ہے

43۔ ذکر غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ہے

44۔ ذکر جہاد کرنے والوں کے برابر ہے

45۔ ذکر کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک پرہیزگاروں میں زیادہ معزز ہیں

46۔ دل کی سختی ذکر سے دور ہوتی ہے۔

47۔ ذکر دل کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔

48۔ ذکر شکر کی جڑ ہے جو اللہ کا ذکر نہیں کرتا وہ شکر بھی ادا نہیں کرتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ''حضرت موسیٰ ؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا "باری تعالیٰ! مجھے کوئی طریقہ بتائیے کہ میں آپ کا شکر ادا کروں"؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "جتنا تم میرا ذکر کرو گے اتنا شکر ادا ہوگا"۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ نے کہا "الٰہی تیری شان کے مطابق شکر کس طرح ادا کروں"؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تمہاری زبان ہر وقت ذکر کے ساتھ تر و تازہ رہے"۔

49۔ ذکر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوستی کی جڑ ہے اور ذکر سے غفلت اس کے ساتھ دشمنی کی جڑ ہے۔

50۔ اللہ کے ذکر کے برابر کوئی چیز نعمتوں کو کھینچنے والی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کو ہٹانے والی نہیں ہے۔

51۔ ذکر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا ہوتی ہے۔

52۔ جو شخص یہ چاہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے جنت کے باغوں میں رہے وہ ذکر کی مجالس میں بیٹھا کرے۔

53۔ اللہ تعالیٰ ذکر کرنے والے پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتے ہیں

54۔ ذکر کرنے والا جنت میں ہنستا ہوا جائے گا۔

55۔ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے ذکر کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں۔

56۔ تمام اعمال میں وہی عمل افضل ہے جس میں ذکر کثرت سے کیا جائے۔ روزوں میں وہ روزہ افضل ہے جس میں ذکر کثرت سے ہو، حج میں وہ حج افضل ہے جس میں ذکر کثرت سے ہو، اس طرح اور اعمال جہاد وغیرہ کا حکم ہے۔

57۔ ذکر نفلی عبادت کے قائم مقام ہے

58۔ ذکر سے ہر عبادت محبوب بن جاتی ہے

59۔ ذکر ہر مشکل اور مشقت کو آسان کرتا ہے

60۔ ذکر دل سے خوف و ہراس دور کرتا ہے

61۔ ذکر انسان میں ایک خاص قوت پیدا کرتا ہے

62۔ ذکر کرنے والے کی اللہ تعالیٰ تصدیق کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب بندہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے سچ کہا میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں ہی سب سے بڑا ہوں

63۔ ذکر سے جنت میں گھر تعمیر ہوتے ہیں۔ جب بندہ ذکر سے رک جاتا ہے تو فرشتے تعمیر سے رک جاتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ فلاح تعمیر تم نے کیوں روک دی تو وہ کہتے ہیں کہ اس تعمیر کا خرچا آنا بند ہو گیا ہے، سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم جو شخص 7 مرتبہ پڑھتا ہے تو اس کے لیے جنت میں ایک گنبد تیار ہو جاتا ہے۔

64۔ ذکر جہنم کے لیے آڑ ہے۔ ذکر کی کثرت جتنی زیادہ ہوگی آڑ اتنی ہی پختہ ہوگی۔

65۔ ذکر کرنے والے کے لیے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔

66۔ جس پہاڑ یا میدان یا سبزے کے پاس اللہ کا ذکر کیا جائے وہ فخر کرتے ہیں اور روز محشر ہمارے گواہ ہوں گے۔

67۔ ذکر انسان کو نفاق سے بری کرتا ہے۔

68۔ ذکر عبادت میں لذت پیدا کرتا ہے۔ مالک بن دینارؒ کا کہنا ہے کہ ذکر سے زیادہ کسی عبادت میں لذت نہیں ہے۔

69۔ ذکر کرنے والوں کا چہرہ روز محشر چمکتا ہوگا

70۔ ذکر کرنے سے انسان ہر قسم کی لغویات سے محفوظ رہتا ہے

71۔ ذکر انسان کو شیطان سے بچائے رکھتا ہے

72۔ ذکر کرنے والے کے چہرے پر دنیا میں رونق ہوتی ہے اور آخرت میں نور ہوگا

73۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے حج، عمرہ، جہاد، وغیرہ ہر عبادت کا بدل ذکر کو قرار دیا ہے۔

74۔ ذکر ہر مصیبت کو زائل کرتا ہے

75۔ ذکر پر مرمٹنے والے روز محشر ہلکے پھلکے ہوں گے

76۔ ذکر کرنے والا نیک بخت ہوتا ہے

78۔ حافظ ابن تیمؒ کہتے ہیں کہ اللہ کا ذکر دل کے لیے ایسا ہے جیسے مچھلی کے لیے پانی۔ خوب غور کر لیں کہ بغیر پانی کے مچھلی کا کیا حال ہوتا ہے؟

79۔ ذکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کا سبب ہے۔

کلمہ طیبہ افضل الذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا ذکر، شکر اور فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

****

قرب الٰہی

اللہ سے محبت، اللہ کی محبت اور اس کی قربت اس سے بڑھ کر ہمیں زندگی میں اور کیا چاہیے؟ یہ بہت بلند مقام ہے اور یہ دولت بے حد قیمتی ہے اور اس محبت و قربت کی طلب اور کوشش ہر مسلمان کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں ضروری ہے۔

قرب الٰہی کی منزل کو پا لینا ناممکن نہیں، دشوار بھی نہیں بس محنت طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس منزل کو پا لینے کے آسان ترین راستوں کی طرف ہماری راہنمائی فرمادی ہے جس میں نہ محنت نہ مشقت نہ ریاضت نہ مجاہدہ یہ ''ذکر اللہ ہے'' اس کے بعد بہت سے راستے ہیں

سورۃ بقرہ، آیت نمبر 165 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: ''مومن سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتا ہے''۔

اور پھر سورۃ العلق، آیت نمبر 19 میں اللہ تعالیٰ اپنے قریب آنے کا راستہ بھی بتاتا ہے:

ترجمہ: ''سجدہ کرو اور اپنے رب کے قریب ہو جاؤ''۔

جب قرب الٰہی ہر ایک لئے ضروری ہو تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کا حصول ہر ایک کے بس میں ہو اس کا راستہ آسان ہو کہ یہ دین آسان ہے۔ اس کے حصول کا آسان راستہ، اتباع رسول خاتم النبیین ﷺ ہے۔ قرآن پاک ہمارے پاس علمی شکل میں اور تفسیر قرآن عملی شکل میں موجود ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول کے پیچھے پیچھے چلنا جو آپ خاتم النبیین ﷺ نے کیا ہے جس طرح کیا ہے اسی طرح اُسی درجے میں ادا کرنا۔ اس طرح کرنے اور اپنی زندگی کو سنت رسول خاتم النبیین ﷺ کے طریقے پر گزارنے کی کوشش میں لگے رہنا یہ ہے قرب الٰہی کا آسان راستہ۔ قرآن پاک سورہ آل عمران، آیت نمبر 31 میں فرمان الٰہی ہے:

ترجمہ: ''اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری راہ پر چلو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا''۔

اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ اپنی رسالت کی پوری زندگی میں جو کام کرنے میں لگے رہے وہ ہے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا، اور ان کو اللہ کی طرف بلانا۔ عوام الناس کو اللہ کی طرف اور اس کی راہ میں جدوجہد کے لئے پکارنا اور جمع کرنا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنا یہ رسول خاتم النبیین ﷺ کی راہ ہے۔ یہی قرب الٰہی کے حصول کا سبب ہے یعنی راستہ ہے۔ اس کام کو نہ ترک کیا جا سکتا ہے نہ موخر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے غفلت برتی جاتی ہے۔

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں

اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ راہ رسول خاتم النبیین ﷺ پر چلنے والا مخلوق خدا کی طرف توجہ اور ان کی مشغولیت میں خود اپنی ذات کی طرف توجہ اور اس کام کے لئے زادراہ جمع کرنے سے غافل نہ ہو اور دوسروں کو پکارنے میں خود اپنے نفس کو پکارنا نہ بھول جائے۔

عام مخلوق خدا کی ہدایت بڑی بھاری ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ ایک پرخار راہ ہے اس ہدایت کو ''قول ثقیل'' کہا گیا ہے اور اس کام کو ایک کمر توڑ دینے والا بھاری بوجھ۔

مخلوق کی ہدایت کا کام اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو سونپا تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ آخری نبی ہیں۔ کسی نبی کی امت کو (یہ لوگوں کی ہدایت کا کام) یہ کام نہیں سونپا گیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی آمد پر تکمیل نبوت ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ کام امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت کے سپرد کر دیا۔ اتنی بڑی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ نے جب یہ کام نبی خاتم النبیین ﷺ کی امت کو سونپا تو ضروری ہوا کہ اس امت میں یہ بوجھ اٹھانے کی ہمت بھی ہو گی اور صلاحیت بھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آخری آیت میں فرمایا ہے کہ:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنی اس کو اس بوجھ کے اٹھانے کی طاقت دی ہے''۔

اب اس کام (کار رسالت خاتم النبیین ﷺ) کو صحیح طور سے کرنے کے لئے زادِ راہ کیا ہے؟ سب سے بڑھ کر جس کے بغیر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا وہ ہے سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہنا۔ اس کا مطلب گوشہ نشین ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ''دنیا میں رہ اور دنیا میں نہ رہ'' یعنی دنیا کو بقدر ضرورت ہاتھ میں رکھ اور

صرف اللہ کا ہو جا یعنی ''حنیفیت'' اور ہر کام صرف اللہ کے لئے کرنا یعنی اخلاص جس درجہ میں ہو اور جس قدر بھی بس میں ہو؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم حنیف (یک سو) اور مخلص کے بلند سے بلند مقام کی آرزو کو اپنا مطلوب بنالیں اور رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کی طرح دعوت کے کام کے ساتھ ساتھ ان اعمال کو بھی بجالائیں جو اس مقام کے حصول کا ذریعہ ہوں۔

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

دیکھئے دین کا خلاصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ (سورۃ البینہ، آیت نمبر 5)

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ

ترجمہ: ''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ اللہ کی بندگی کریں اور اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہو جائیں''۔

تو اس کے ساتھ ہی نماز اور زکواۃ کی ہدایت بھی کی گئی اور آخیر میں خشیت الٰہی کی بھی پہلی وحی میں انسانوں کو پیغام الٰہی پہنچانے کی ہدایت دے دی گئی کہ: (سورۃ العلق، آیت نمبر 1)

ترجمہ: ''پڑھو (لوگوں کو سنانے کے لئے) اپنے رب کے نام سے''۔

تو اس کے ساتھ ساتھ ہدایت بھی دی گئی: (سورۃ العلق، آیت نمبر 19)

ترجمہ: ''سجدہ کرو اور اپنے رب کا قرب حاصل کرو''۔

بالکل آغاز ہی میں جب یہ وحی آئی کہ: (سورۃ مدثر، آیت نمبر 2)

ترجمہ: ''اٹھو اور خبردار کردو''۔

تو اس کے فوراً بعد ہی یہ وحی بھی آئی: (سورۃ المزمل، آیت نمبر 8-2)

ترجمہ: ''رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ اپنے رب کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو''۔

جب کہا گیا کہ: (سورہ والضحیٰ، آیت نمبر 11)

ترجمہ: ''اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو''۔

تو ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا: (الم نشرح آیت نمبر 7 اور 8)

ترجمہ: " جب تم فارغ ہو تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کمر باندھ لو اور اپنے رب ہی سے لو لگاؤ''۔

ہر وہ کوشش جو کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کے لئے کی جائے جہاد ہے۔

ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے''۔ (سورۃ الحج، آیت نمبر 78)

کا حکم دیا تو ساتھ ہی معنوی و روحانی ساز و سامان کا بیان بھی کر دیا کہ:

ترجمہ: ''پس نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو''۔ (سورۃ الحج، آیت نمبر 78)

جب کامیابی و فتح ہوئی اور ''یدخلون فی دین اللہ افواجا'' (سورہ النصر، آیت نمبر 2) کے الفاظ میں عوامی بہاؤ اور رجوع کا مژدہ سورۃ النصر میں سنایا تو ساتھ ہی پر زور تاکید فرمائی کہ کثرت کے ساتھ اپنے رب کی حمد کرو اور کیونکہ عوامی بہاؤ کے ساتھ لغزشوں کا امکان زیادہ ہے اس لئے استغفار کا اہتمام کرو۔

دعوت و جہاد کی راہ اس زادِ راہ کے بغیر طے نہیں ہو سکتی جس کو اللہ تعالیٰ نے اتنی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کو ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ دین اسلام کے جھنڈے تلے آجائیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ دن رات دعوت کا کام کرتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا روبار، حکومت صلح و جنگ، تعلیم و تزکیہ اور عام انسانی روابط اور تعلقات جیسے کاموں میں مشغول رہتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ راتوں کو اللہ کی عبادت کے لئے کھڑے رہتے توبہ و استغفار کرتے، ذکر الٰہی میں مشغول رہتے اور دن رات پوری یکسوئی اور قلب کے پورے انہماک کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہا کرتے تھے۔

بے شک آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرح کوئی نہیں ہوسکتا۔لیکن جو بھی کسی نہ کسی درجہ میں دعوت عام اور ہر وہ کوشش جو کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کے لئے کی جائے۔ وہی کام کرنا چاہتا ہو جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے واسطے سے امت مسلمہ کے سپرد کیا ہے۔ وہ بھی آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرح ان تمام ہدایت الٰہی کا مخاطب ہے اور آپ خاتم النبیین ﷺ سے کہیں زیادہ اس زادِراہ اور ساز وسامان کا محتاج ہے۔اس کو ہر وقت ہدایت قرآنی اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے اسوہ حسنیٰ کی کوشش میں لگا رہنا چاہئے کہ اس کے بغیر اس پر خطر راہ پر نہ چل سکے گا اور نہ قائم رہ سکے گا۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کر دے

یہ ضرور ہے کہ ہر شخص بقدر استطاعت ہی سعی کرے گا اور سعی بھی بقدر توفیق الٰہی کرسکتا ہے۔لیکن ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ توجہ الٰہی اور قرب الٰہی کے مقامات کے لئے مطلوب اعمال کچھ اتنے مشکل ہیں کہ صرف خواص ہی ان کو کر سکتے ہیں اور یہ کہ یہ مقام صرف انہیں کا نصیب ہیں۔ یاد رکھیں کہ ان میں سے کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی درجہ میں ایک عام انسان کے لئے کرنا ممکن نہ ہو یا کوئی مشکل ہو۔حصول جنت اور قرب الٰہی کے راستے کو آسان راستہ کہا گیا اور ہمیں ''الدین یسر'' (آسان دین) کی بشارت دی گئی ہے۔

قرب الٰہی کی جستجو یا ان اعمال کو کرنا یا کرنے کی کوشش کرتے رہنا ہر لمحہ کا کام ہے لیکن بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جب ان کا حصول نسبتاً زیادہ آسان ہو جاتا ہے اور ان کے نتائج میں کئی گنا اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہر شب و روز میں ایسے کئی لمحات ہیں اسی طرح رمضان المبارک کا مہینہ بھی ایسا ہی وقت ہے یہ بات کہ ہر رات میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور اپنا دست کرم پھیلاتا ہے۔رات کے لمحات کی قدر و قیمت اور نتیجہ خیزی ظاہر کرتی ہے اور یہ کہ رمضان المبارک میں شیطان کو باندھ دیا جاتا ہے۔ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر اور نوافل کا فرض کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ رمضان کی قدر و قیمت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔رات ہر روز آتی ہے اور رمضان ہر سال ہم ان قیمتی اوقات سے جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھائیں۔

اس ختم ہونے والی زندگی میں جو لمحہ بھی میسر ہو اسی لمحے سے ان اعمال کو کرنے کا عزم کر لینا چاہیے۔ہم مسلمان ہیں تو یہ راہ ہم چھوڑ نہیں سکتے۔اس لئے کہ یہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کی راہ ہے اور خیر کی راہ پر خود چلنا بھی فرض ہے اور دوسرے مسلمانوں کو اس راہ پر چلانا بھی فرض ہے اور قرب الٰہی کے لئے عبادات اور دوسرے عمل کرتے ہوئے یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ سب سے زیادہ کارگر نسخہ ''دعوت الی الخیر'' کا ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان اعمال میں کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہے جس کو کرنے کے لئے زندگی کے عام معمولات کو ترک کرنا پڑے یا ان میں خلل پڑے یا مشغول ترین زندگی میں اس کی گنجائش ہی نہ نکل سکے۔اصل چیز توجہ الی اللہ اور اصل نسخہ عام معمولات ہی کو قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنا لینا ہے۔اضافی اعمال تو بہت قلیل اور بہت کم وقت طلب ہیں جو دقت اور محنت طلب ہیں۔ جیسے قیام الیل ان کو بھی سہولت کے ساتھ کرنے کے راستے بتا دیئے ہیں۔

آسان عملی طریقے

1۔ نماز میں خشوع کی تدبیر: نماز کے معنی یاد کر لئے جائیں اور توجہ معنی پر رکھی جائے۔

2۔ **قیام الیل:** اگر آخیر رات میں نماز پڑھنا مشکل ہو تو سونے سے پہلے 8 رکعت پڑھ لیں یا یہ بھی مشکل ہو تو نماز عشاء کے ساتھ دو یا چار یا چھ جتنے آسانی سے پڑھ سکیں پڑھ لیں۔

3۔ **تہجد:** فجر کی نماز سے آدھ گھنٹے پہلے اٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

4۔ ہر وقت ذکر: اٹھتے بیٹھتے، لیٹے اور کروٹ بدلتے ہر وقت اللہ کا نام لیں۔

5۔ **ذکر کا متعین وظیفہ:** صبح شام کی تسبیحات ہیں

سب سے پہلے فجر کی نماز کے بعد (1) تیسرا کلمہ (2) پہلا کلمہ (3) استغفار (4) درود شریف (5) سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم (6) لاحول ولاقوۃ الا باللہ یہ کل چھ تسبیحات ہیں یہ ظہر تک مکمل کر لیں اور یہی ظہر کے بعد سے عشاء کی نماز تک مکمل کر لیں۔اضافہ ان ہی تسبیحات میں سے پہلے کلمہ اور درود شریف میں کرتے جائیں جتنا بھی ہو سکے۔

6۔ موت کی یاد: موت اور موت کے بعد اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے دن کو بھی قرآن پاک کثرت سے یاد کراتا ہے اور یاد رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ کام بھی اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے کرنا چاہیے۔ لیکن چند لمحات منضبط طریقے سے موت اور موت کے بعد اللہ تعالیٰ سے ملاقات تک کے سفر کو یاد رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح کہ ہمارے دل کو آگ سے بچنے کی لگن ہو۔ خوف اندیشہ، بے چینی اور اضطراب سے دل بھرا ہوا ہو اور پھر ہم کہیں۔

اللھم اجرنی من النار تو الفاظ کا اثر ہوگا۔

دل میں آگ لگی ہوئی ہوگی تو الفاظ تو دل سے نکلیں گے۔

1۔ تلاوت قرآن پاک، قرآن پاک کا پڑھنا نفلی عبادت سہی لیکن یہ قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔ جتنی بھی تلاوت کی جائے کم ہے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ''جب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اللہ سے باتیں کروں تو میں نماز پڑھنے لگتا ہوں اور جب میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے باتیں کرے تو میں قرآن پڑھنے لگتا ہوں''۔

تو قرآن پاک کا پڑھنا اللہ سے باتیں کرنا ہے۔ بشرطیکہ اس کے معانی آتے ہوں۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: ''جو دائمی فرض ادا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کا وقتی فرض بھی قبول نہیں فرماتے''۔ (ترمذی)

دائمی فرض توحید پر ایمان ہے مندرجہ بالا تمام امور بجالانے کے بعد اللہ تعالیٰ بندے کو کچھ راز عطا کر دیتا ہے۔ یہ راز چار قسم کے ہوتے ہیں۔

1۔ الہامی راز 2۔ معرفتی راز 3۔ توحیدی راز 4۔ نوری راز

ان چاروں قسموں والا فنا فی اللہ، مشاہدہ ذات اور قرب حضوری میں ہوتا ہے۔

1۔ راز الہامی کا مقام دل ہے اس پر ایک آواز قلب سے معلوم ہوتی ہے۔

2۔ راز معرفتی کا مقام ہے سر دماغ ہے اس کو آواز حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے نور سے آتی ہے جس شخص نے حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی رفاقت اختیار کی اللہ کو پا لیا۔

3۔ راز توحیدی کا مقام وجود کا ہر ایک ذرہ ہے اس کی آواز لامکاں اور قرب الٰہی سے آتی ہے۔

4۔ راز نوری کو حق اور حضور حق سے آواز آتی ہے اور اس قسم کے راز کو جمعیت کل کہتے ہیں۔

جب یہ تمام راز اکھٹے ہو جائیں تو جمعیت اور فنا فی اللہ اور غرق حضور خاتم النبیین ﷺ حاصل ہو جاتے ہیں اور اسے آواز واجب الوجود سے آتی ہے۔ اس کو فنا فی اللہ کہتے ہیں ایسے شخص کی آنکھ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں واضح روشن رہتی ہے اور وہ ہمیشہ دیدار الٰہی کرتا رہتا ہے۔ اسے قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے اور جو شخص اس مقام پر پہنچتا ہے تو دونوں جہاں اس کے فرمانبردار اور غلام بن جاتے ہیں۔

جب سے آباد تیرا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے آباد میرے آئینے میں
حسن کامل ہے تیرا، عشق ہے کامل میرا
قافلہ ہو گیا آسودہ منزل میرا

****

توفیق الٰہی

توفیق ایک انعام ایک عطیہ ہے جو بندے کے لیے نیکی کی راہ کھول دیتی ہے۔

پارہ چار سورہ آل عمران، آیت نمبر 101

ترجمہ: ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے تو ضرور راہ راست دکھایا گیا''۔

مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی گارنٹی ہے کہ جو شخص نیک نیتی اور یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرے تو یقیناً اسے راہ راست پر ثابت قدمی سے گامزن رہنے کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

پارہ پانچ میں سورہ النساء، آیت نمبر 137

ترجمہ ''بلاشبہ جو مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے۔ پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشے گا اور نہ ان کو راہ ہدایت دکھلائے گا''

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ ایمان لا کر اس پر قائم رہیں تب بھی مقبول نہیں۔ بلکہ اس نفی کا مقصد یہ ہے کہ بار بار کفر اختیار کرنے سے اور اس پر اصرار کرنے سے عادتاً قلب مسخ ہو جاتا ہے جس کے بعد اکثر ایمان کی توفیق نہیں ہوتی اور ہدایت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

پارہ چھ سورہ مائدہ، آیت نمبر 16

ترجمہ: ''اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو کہ رضائے حق کے طالب ہوتے ہیں۔ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہ دیتے ہیں''۔

یہاں پر توفیق کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان رضائے الٰہی کا طالب ہو اگر اس کی نیت اور عمل رضائے حق کے حصول کے لیے مخصوص ہوں تو اسے تاریکی سے نکل کر نور کی طرف آنے اور راہ راست پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا ہوتی ہے۔''

پارہ چھ سورہ مائدہ، آیت نمبر 71

ترجمہ: ''اور یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی تو وہ اندھے اور بہرے بن گئے''۔

اس میں یہ دلیل ہے کہ اگر انسان بار بار گناہوں میں مبتلا ہو کر توبہ کرنے کی بجائے اسی خام خیالی میں مبتلا رہے کہ ان بداعمالیوں کی اسے سزا نہ ملے گی تو اس سے نیکی کرنے کی استعداد ختم اور توفیق بند ہو جاتی ہے۔

پارہ نمبر 10 سورہ انفال، آیت نمبر 53

ترجمہ ''یہ بات اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال نہیں بدل ڈالتے''

یعنی اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ہاں بندے اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں تو حالات بدل جاتے ہیں۔

پارہ بارہ سورہ ہود، آیت نمبر 114

ترجمہ: '' اور آپ (خاتم النبیین ﷺ) نماز کی پابندی رکھیے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں بے شک نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو یہ بات ایک نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لیے''۔

اس میں یہ اصول ہے کہ اطاعت کے انوار سے گناہوں کی ظلمت دور ہو جاتی ہے اور اطاعت کا غلبہ جس قدر بڑھے گا گناہ گاری کا رجحان اس قدر کمزور ہوگا۔ اس سے بھی توفیق کی راہ کشادہ ہوتی ہے۔

پارہ نمبر 21 سورہ العنکبوت، آیت نمبر 69

ترجمہ: ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھائیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے

ساتھ ہے‘‘

اس سے ثابت ہوا کہ اگر خلوص دل سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشقت برداشت کی جائے تو راہ راست کے مشاہدے کی توفیق عطا ہونا، ایک یقینی امر ہے۔

پارہ 25 سورہ شوریٰ، آیت نمبر 13

ترجمہ: ’’اللہ ہی اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔‘‘

اس میں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی شرط ہے۔ جونہی یہ شرط پوری ہو جائے اسے اللہ تعالیٰ کے قرب کی جانب ترقی حاصل کرنے کی توفیق عطا ہو جاتی ہے‘‘

پارہ نمبر 28 سورہ طلاق، آیت نمبر 3-2

ترجمہ ’’اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے کہ (پہنچا تا ہے) جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہے‘‘

اللہ کا خوف خشوع کا باعث ہوتا ہے کہ خشوع سے عبادت آسان ہو جاتی ہے اور پھر رسوخ کا درجہ پا کر ایسے اعمال صالح کی توفیق نصیب ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ اس کی نجات کی راہ نکال دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انفرادی سطح پر توفیق الٰہی ایک عظیم نعمت ہے اگر کوئی گناہ کرتا رہے تو بہ نہ کرے اطاعت سے رک جائے تو اس سے انوار و برکات منقطع ہو جاتے ہیں اور توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام آیات پر مجموعی طور پر غور کرنے سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ توفیق کا دارومدار انسان کے اعمال پر ہے۔ ان اعمال کا مختصر ذکر مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے وہ یہ کہ ’’اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں پہل کرنا ہر انسان کا اپنا بنیادی فرض ہے۔ اگر نیت میں خلوص اور ثبات ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت خود آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیتی ہے۔ ہر اطاعت کے اپنے اپنے انوار و برکات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اطاعت سے دوسری اطاعت کا سلسلہ چلا کرتا ہے۔ اور اس میں ایسا سامان جمع ہونے لگتا ہے جس کو توفیق کہتے ہیں۔ عبادت اور اطاعت سے جس طرح توفیق شروع ہوتی ہے، نافرمانی اور گناہوں سے اسی طرح بند بھی ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اس حدیث قدسی سے اچھی طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔

’’کہ جب بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی (طرف متوجہ ہوتا ہوں) ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آجاتا ہوں‘‘۔ (صحیح بخاری)

اب جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی عبادت میں پہل کرنا انسان کا بنیادی فرض ہے۔ تو بنیادی بات مندرجہ بالا حدیث قدسی کی رو سے بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت بڑھنا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا اعمال ہیں جن کو کرنے سے بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت بڑھ سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فرائض کی پابندی سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتا ہے اور نوافل کی زیادتی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اب فرائض میں سب سے زیادہ زور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے نماز پر دیا ہے۔ سورہ ھود آیت نمبر 114 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ترجمہ: ’’اور آپ (خاتم النبیین ﷺ) نماز کی پابندی رکھیے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں بے شک نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو یہ ایک نصیحت ہے، نصیحت ماننے والوں کے لیے‘‘۔

اگر انسان پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرے، چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرے، جھوٹ نہ بولے، دھوکا اور غیبت سے بچے، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت کرتا رہے تو بندہ اللہ کی طرف ایک بالشت بڑھ جائے گا اور فوراً ہی اللہ اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھ جائے گا یہ توفیق ہوگی۔ اب معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت بڑھ گئے ہیں اور اس کے جواب میں باری تعالیٰ ایک ہاتھ بڑھ گیا ہے؟ (یہاں بڑھ جانے سے مراد متوجہ ہونا ہے) ایسا بندہ جس کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے اپنے موجودہ اعمال، نماز، ذکر، تلاوت وغیرہ کو ناکافی محسوس کرتا ہے، کیونکہ مندرجہ بالا توفیق کی وجہ سے اس کے دل کی آنکھوں پر سے معاصی کی جو کالک لگی ہوئی تھی وہ چھٹ گئی۔ تو اب ایسے بندے کو اپنے اعمال کم اور اللہ تعالیٰ کی عنایات اور نوازشات زیادہ اچھی طرح نظر آنے لگیں گی اور پھر اس توفیق (اللہ تعالیٰ کا بڑھنا

) کی وجہ سے اس کو یہ سوچ سوچ کر خوف کی لہریں ابھرنے لگتی ہیں کہ میں نے کتنا وقت ضائع کر دیا۔ مجھے کچھ کر لینا چاہیے، وقت کم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب چونکہ ایسے بندے کو اپنی عبادات کم لگنے لگیں گی تو اب وہ اور زیادہ اہتمام عبادت الٰہی کا کرے گا۔ تہجد، اشراق، چاشت وغیرہ پر توجہ دے گا اور وہ یاد الٰہی میں ان عبادات کو کر کے ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرے گا۔ کچھ عرصہ اگر وہ اسی حال میں رہتا ہے تو یہ بندے کا اللہ کی طرف ایک ہاتھ بڑھنا ہے۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور جیسے ہی اسے یہ توفیق نصیب ہوتی ہے۔ بندے کو پھر اپنی عبادت کم اور عنایت الٰہی زیادہ محسوس ہوتی ہیں اور اس کی بے چینی اور بے قراری بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنی عبادت میں اور زیادتی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بہت ہی بہتر طریقہ سے انجام دینے کی بھرپور کوشش بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ خوف الٰہی سے کانپتا بھی رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

اب بندے کی طرف سے ان اعمال کی بجا آوری اور ان میں زیادتی کا سبب توفیق الٰہی ہے جس نے اس کے دل کی آنکھوں کو روشن کیا کہ اب پہلے سے اور بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نظر آنے لگیں۔ اب بندے کو پھر اپنے اعمال کم اور رب کی عنایات، نعمتیں اور نوازشات زیادہ محسوس ہونے لگیں گی اور یہ احساس توفیق اللہ کا بندے کی طرف بڑھنے کی نشانی ہے۔ ایسا انسان اب پہلے سے زیادہ اعمال کرنا چاہتا ہے۔ اب دین سیکھنے کی تمنا اسے تنگ کرنے لگتی ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر 70 مرتبہ شفقت کی نگاہ ڈالتا ہے تب اس کے قدم دین سیکھنے کے لیے نکلتے ہیں'' اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اسے اپنے ایک ایسے چاہنے والے سے ملا دیتا ہے جو اس کی ذات کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ملا دے (متعارف کروا دے)

اس طرح ایک انسان جتنا زیادہ اپنے اوپر انعامات کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کو اس کی نوازشات کو محسوس کرے گا۔ اتنا ہی شکرانہ ادا کرے گا اور زیادہ سے زیادہ اعمال بجا لائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات، اور نوازشات اور احسانات کا نظر آنا اور محسوس ہونا ہی توفیق الٰہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف بڑھ جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان اپنی کی ہوئی عبادت اور اطاعت کو کم اور رب کی عنایات اور احسانات کو زیادہ محسوس کرے تو جان لے کہ رب اس کی طرف متوجہ ہے یعنی توفیق الٰہی ہو رہی ہے اور اگر اپنی عبادات کو اور اعمال کو زیادہ اور رب کی نوازشات کو کم محسوس کرے تو جان لے کہ اب معاصی کی کثرت نے دل پر پردہ ڈال دیا ہے جس سے اُس ذات کے احسانات نظر آنا بند ہو گئے ہیں اس طرح ناشکری کے رجحانات بڑھ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ توفیق سلب ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں انسان کا توبہ کرنا بہت کام آتا ہے اگر بندہ توبہ کرتا ہے اور کرتا رہتا ہے تو توفیق الٰہی متوجہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شیطان ہماری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا ہے اور کوئی کسر انسان کو بہکانے کی نہیں چھوڑتا۔ اس لیے توبہ کا دروازہ کھٹکھٹائیں جو کہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے اعمال پر نظر رکھے غلطی اور غفلت پر توبہ کرے لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ عوام کی توبہ گناہ پر اور خواص کی توبہ غفلت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا خوف ہی انسان کے اندر خشوع پیدا کرتا ہے اور خشوع کے بعد عبادت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور پھر انسان کو اعمال صالح کرنے کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے اس کے بعد انسان اپنے انہی اعمال صالح کی وجہ سے نجات کی راہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطاعت جس قدر زیادہ ہوگی اتنی ہی ہمارے باطن کی صفائی ہوگی اور نور پیدا ہوتا جائے گا۔ کیونکہ گناہوں کی ظلمت کا اندھیرا چھٹ چکا ہے اب اطاعت کا نور ظاہر ہوگا۔ اطاعت کا مطلب اللہ تعالیٰ کی ہر طرح سے فرمانبرداری اور یہ فرمانبرداری اعمال صالح کی توفیق سے حاصل ہوئی۔ اب جب نور پیدا ہوا تو نجات کی راہ روشن ہوگئی اور بندے نے ذات باری تعالیٰ تک رسائی پائی، یہی اطاعت کا جذبہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے، گناہ کے رجحانات کم ہوتے جاتے ہیں اور توفیق کی راہ کھلتی چلی جاتی ہے۔ فرمان الٰہی ہے۔ (سورہ العنکبوت آیت نمبر 69)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ہماری خاطر مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنی طرف آنے کے راستے ضرور دکھائیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے "۔

فرض عبادت سے نوافل اور پھر مجاہدہ اور ریاضات توفیق الٰہی ہی سے یہ تمام راہیں ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب انسان فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق ہوئی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

ترجمہ: ''جو شخص رجوع کرے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف آنے کی رسائی دے دیتا ہے اور اللہ ہی اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے''

جیسا کہ سورہ آل عمران آیت نمبر 101 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ترجمہ: ''جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑ لیتا ہے وہ ضرور راہ راست کی ہدایت (توفیق) پاتا ہے''

یہ اللہ تعالی کا بہت ہی بڑا کرم ہے کہ وہ ندامت کے دو آنسوؤں پر 70 برس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ہمیں بار بار معاف کرتا ہے اور کرتا ہی رہتا ہے لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ معافی کی درخواست کرنے والے کو کبھی بھی رد نہیں کرتا یہ اس کی شان کریمی کے خلاف ہے۔ تو اس عطائے درگزر سے ہمیں ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، دیکھئے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟

ایک شخص جو توفیق الٰہی سے گناہوں سے ڈر کر توبہ بھی کرتا رہتا ہے اور گناہوں کے نزدیک نہیں جاتا۔ کیا اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو بار بار گناہ کرتا اور معافی چاہتا رہتا ہے؟ گناہ سے انسان کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے اور توبہ کرنے سے مٹا دیا جاتا ہے پھر گناہ کرنے سے یہ نقطہ پھر لگ جاتا ہے اور توبہ کرنے سے مٹا دیا جاتا ہے۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ ایک اس شخص کا دل ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں اور ایک یہ بار بار صاف ہونے والا دل۔ کیا دونوں دل اپنی چمک دمک میں برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں، کبھی نہیں تو جو مرتبہ گناہ سے بچنے والے، گناہ نہ کرنے والے کا ہوگا وہ اس شخص کا نہ ہوگا جو بار بار توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے بار بار معاف فرما دیتا ہے۔ یہ تو اس کی شان کریمی ہے کہ دعا مانگنے والے ہاتھ وہ کبھی بھی خالی نہیں لوٹاتا۔ توبہ کرنے والوں کی توبہ وہ ضرور قبول کرتا ہے۔ لیکن کوشش یہ کرنی چاہیے کہ گناہ سے بچا ہی جائے اور گناہ ہونے ہی نہ پائے اور پھر بھی اللہ سے ڈر کر توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ اب اگر کوئی شخص اس زعم میں رہے کہ اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ وہ معاف کر ہی دے گا اور پھر اس خام خیالی میں رہے کہ شفاعت تو ہو ہی جائے گی یا پھر اس کی بداعمالیوں کی اسے سزا نہ ملے گی تو ایسے بندے سے آخیر کار نیکی کرنے اور توبہ کرنے کی توفیق سلب کر دی جائے گی کیونکہ دینے والا، واپس بھی لے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش نظر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں سے ہم کلام ہونے کی قدرت رکھتے تھے، پرندوں نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو زبان دان اپنا محرم راز پایا تو انہوں نے اپنی چوں چوں ترک کی اور پیغمبر خدا کی صحبت اختیار کر لی، حضرت سلیمانؑ کے دربار میں چرند پرند کیا ہر قسم کے جاندار جن وانس ہر وقت موجود رہتے اور حضرت سلیمانؑ کے ساتھ دانائی اور حکمت کی باتیں کیا کرتے۔ ایک دن دربار لگا ہوا تھا تجربے اور دانائی کی نہریں رواں دواں تھیں۔ تمام پرندے باری باری اپنی اپنی صفات اور اپنا اپنا ہنر بیان کر رہے تھے کہ آخیر میں ہدہد کی باری آئی، اس نے کہا ''اے علم وحکمت کے بادشاہ مجھ میں ایک خوبی ہے اور وہ یہ کہ میں اڑتے ہوئے بلندی سے زیر زمین پانی کا اندازہ لگا لیتا ہوں اور یہ بھی کہ پانی کتنی گہرائی میں ہے؟، پانی کی خاصیت کیا ہے؟، میٹھا ہے یا نمکین، یہ زمین سے نکل رہا ہے یا پتھر سے چشمہ ہے، یا نہر کا پانی'' حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی اس خوبی کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آئندہ سے بے آب وگیاہ صحراؤں میں سفر کے دوران تو ہمارے ہراول دستہ کے ساتھ رہ تا کہ پانی کا کھوج لگاتا رہے۔ کوے نے جب یہ سنا کہ ہدہد کو ہراول دستے میں شامل ہونے کا اعزاز مل گیا تو مارے حسد کے انگاروں میں لوٹنے لگا۔ فوراً ہی بولا "اے بادشاہ یہ ہدہد نے آپ سے جھوٹ بولا ہے، اس نے یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے؟ اس سے پوچھیئے کہ تیری نظر ایسی ہی تیز ہے کہ تو پاتال میں چھپے ہوئے پانی کو دیکھ لیتا ہے تو پھر تجھے زمین پر بچھایا ہوا وہ جال کیوں نظر نہیں آتا جو شکاری تجھے پھانسنے کے لیے زمین پر لگاتا ہے؟ ایسا ہنر تیرے پاس ہے تو تو جال میں گرفتار کیوں ہو جاتا ہے"؟ کوے کی بات سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے کہا کہ ''اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت پیش کرو'' ہدہد نے بے خوف ہو کر جواب دیا، "اے بادشاہ میرا یہ دعویٰ ٹھیک نہ ہو تو یہ گردن حاضر ہے، یہ صفت مجھے قدرت نے عطا کی ہے، جب قدرت ہی یہ صفت سلب کر لے جب فرمان قضا وقدر جاری ہو جائے اور آخری وقت آ جائے تو نگاہ کی یہ خوبی کیا کام آئے گی؟ ایسے موقع پر عقل کام نہیں کرتی، چاند سیاہ ہو جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے "۔ یعنی اس باری تعالیٰ کے آگے کسی کی نہیں چلتی وہ اپنی مصلحت کے مطابق تدبیروں کو توڑ دیتا ہے۔ تو توفیق دینے والا توفیق سلب بھی کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے۔ (آمین)

****

یادِ الٰہی

اِس دنیا میں ہر چیز کا ایک بدن اور ایک اِس کی روح ہے، یہ ظاہری بدن جو ہمیں دیا گیا ہے یہ انسان نہیں ہے، یہ انسان کی محض ایک صورت اور علامت ہے۔انسانیت اِس جسّے کے اندر چھپی ہوئی ہے۔جِسے روح یا حقیقت کہتے ہیں۔اصل میں ہماری انسانیت وہی ہے اور اُس کا نام زندگی ہے، اگر وہ انسان کے جسم سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں، بدن گلنا، سڑنا اور پھٹنا شروع ہو جائے گا اور اِس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا، مٹی مٹی ہو جائے گی اور پانی پانی ہو جائے گا۔

گویا روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں رہ جاتی، یہی حال اِس پوری کائنات کا ہے، یہ کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے، جب روح نکال لی جائے گی تو ساری کائنات کا خیمہ آ پڑے گا۔درہم برہم ہو جائے گا اور ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔یہ روح کیا چیز ہے؟

انسانی روح کے بارے میں قرآن پاک سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 85 میں ارشاد کیا گیا ہے:

ترجمہ:"اے پیغمبر یہ لوگ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دیجیے کہ روح اللہ کا ایک امر ہے(اللہ کا ایک حکم)"

یہ حکم اور لطیفہ خداوندی ہے۔اِس سے یہ کثیف جسم انسانی سنبھلا ہوا ہے۔اِس طرح پوری کائنات کی روح بھی درحقیقت ایک لطیفہ ربّانی ہے اور اِس کا نام "ذکر اللہ یادِ خُداوندی" ہے۔گویا یادِ خُداوندی یا یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔جب اِس سے ذکرِ خُداوندی یا یادِ خُداوندی ختم ہو جائے گا، جبھی یہ خیمہ آ پڑے گا۔

نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہوگی۔جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے"۔(صحیح مسلم)

قیامت کے نزدیک لوگ نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے اور نہ بُرائی کو بُرائی، سڑکوں پر اِس طرح بدکاری ہوگی جیسے جانور پھرتے ہیں، نہ حیا ہوگی نہ غیرت، جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے، اُس وقت قیامت قائم ہو جائے گی۔تو قیامت اس عالم کے ذرّہ ذرّہ کے بکھیر دینے کا نام ہے، جب ذِکر اللہ نہ رہا تو کائنات نہ رہے گی۔اِس سے معلوم ہوا کہ اِس کائنات کی روح ذکرِ خُداوندی ہے۔تو ذکرِ خُداوندی ہم سے اور آپ سے ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس عالم کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے، جب یہ ختم ہو جائیں گے تو کائنات بھی ختم ہو جائے گی۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے

شریعتِ اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ خُداوندی میں مصروف ہے۔ہر وقت یادِ حق کرتا رہتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اِس ذرّے کے مٹنے اور فنا ہونے کا وقت ہوتا ہے۔جسم روح کا لباس ہے، ایک وقت وہ ہوتا ہے کہ نیا اور خوبصورت ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ پرانا ہوتا چلا جاتا ہے۔کبھی کہیں سے سینا اور رفو کرنا پڑ جاتا ہے، رفتہ رفتہ یہ لباس پرانا ہوتا چلا جاتا ہے۔پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ روح کے لیے یہ لباس پہننے کے قابل نہیں رہتا اور پھر روح اِس لباس کو اُتار پھینکتی ہے، اگر روح نیک ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً ہی نوری لباس پہنا دیا جاتا ہے۔میت جو مرنے کے بعد باقی رہ جاتی ہے وہ تو روح کے میلے کپڑے ہوتے ہیں، اِس لیے اِن روح کے میلے کپڑوں کے پاس بیٹھ کر رونا بالکل فضول ہوتا ہے۔ہاں اگر کچھ نوری کلام پڑھا جائے تو نوری کلام، نور کے لباس، اور نوری بدن (روح) کے پاس پہنچ کر اُس کو اور منور کر دیتا ہے۔"ذکر اللہ" نوری کلام ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو بھی اپنے کلام میں "ذکر" فرمایا ہے۔یعنی اِس موقعہ پر تلاوت کر کے نوری کلام روح تک پہنچایا جائے تو فائدہ ہوگا۔

ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے، جب ذکر ختم ہو جاتا ہے تو ٹہنیاں خشک ہو جاتی ہیں، پتے جھڑ جاتے ہیں، ذرّہ ذرّہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے۔کائنات کا کوئی ذرّہ نہیں جو اللہ کے ذکر میں (مصروف نہ ہو) مشغول نہ ہو، مگر ہم اُن کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، ہماری زبان اور ہے اور کائنات کے ذرّوں کی زبان اور، پرندوں کی زبان اور۔

اہلِ باطن کو کبھی کبھی علم دے دیا جاتا ہے، وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سُنتے ہیں اور سمجھتے ہیں، انبیاء کرامؑ کو بطور معجزے کے یہ علم دیا گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھ لیا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کا معقولہ قرآن پاک میں نقل ہے۔ "اے لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سمجھائی گئی ہیں" حضرت سلیمان علیہ السلام یہ بتا دیا کرتے تھے کہ دو کوّے کیا بات کر رہے ہیں، دو چڑیاں کیا بات کر رہی ہیں۔اور چیونٹیوں کے لشکر کو جس چیونٹی نے مخاطب کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر سے بچنے کے لیے کہا تھا، اُس کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔"اے چیونٹیو تم جلدی جلدی اپنے گھروں

میں داخل ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر یہاں سے گزرے اور تم سب کو روند ڈالے"۔

احادیث مبارکہ میں کچھ جانوروں کی مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں، اور ان کی تسبیح بھی ذکر کی گئی ہے۔ کہ تیتر یہ کہتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ تیتر کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ تیتر کی تسبیح ہے" جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"۔ کچھ تیتر پکارتے ہیں "سچ سبحان تیری قدرت" (صبح کا نظارہ) بلبل کہتا ہے "صبح شام اللہ کی حمد کرو"۔ ایک جانور کی تسبیح ہے "ادے کا بدلہ"۔ بعض کی یہ تسبیح بھی بیان کی گئی ہے "پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے زینت بخشی" گویا مختلف قسم کی نصیحتیں اور عبرتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں، پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "میں تو نصیحت کرتا رہا، لیکن انسان میری زبان ہی نہیں پہچان سکے، یعنی وہ اوصاف ہی پیدا نہ کر سکے کہ مجھے سمجھ سکتے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے جانوروں کی گفتگو

جناب رسول پاک خاتم النبیین ﷺ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ نہ صرف جانوروں کی زبان سمجھتے تھے بلکہ بعض اوقات اِن کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آ کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "اِس کے مالک کو بلاؤ" اُونٹ کا مالک بلایا گیا، آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہ شکایت کر رہا ہے کہ تم اِس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اِس پر لاد دیتے ہو "؟ مالک نے اِقرار کیا اور کہا "یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ بے شک مَیں ایسا ہی کرتا ہوں، مَیں مجرم ہوں"، آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "آئندہ ایسا مت کرنا" اُونٹ خوش ہو گیا اور اپنے مالک کے ساتھ واپس چلا گیا۔ تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے اُونٹ کی زبان کو سمجھا اور اُس کی دادرسی کی اور اُس کے حق میں فیصلہ دیا۔ (دلائل النبوت)

غرض نبی کریم خاتم النبیین ﷺ جانوروں کی بولیوں پر مطلع تھے۔ انبیاء علیہ السلام کو بطور معجزے کے جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا حتیٰ کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوعِ انسانی کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے

حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اِنسانوں کی زبان کا علم دیا گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (سورہ البقرہ، آیت نمبر 31)

ترجمہ: "اور آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے گئے"

اِس کی تفسیر یہ بھی ہے کہ آدم علیہ السلام کو تمام لغات سِکھا دی گئیں، جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جانے والی تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب یہ نسلیں تمام دنیا میں منتشر ہوئیں تو کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں، تو ایک ایک قبیلہ ایک ایک لغت کا ماہر ہو گیا۔ باقی زبانیں آہستہ آہستہ بھول گئیں۔ یعنی دوسری زبانوں کو سمجھنا چھوڑ دیا، پھر سمجھنے سے محروم ہو گئے۔ اِس طرح زبانیں الگ الگ ہو گئیں، اِس کو بھی حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی بتایا ہے۔ اُس کی قدرت کی نشانیوں میں سے، اِنسان کا اپنا بنایا جانا، آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور نوع انسانی کی زبانوں اور رنگوں کا اختلاف، یعنی بنی آدم اِس میں مختلف ہیں، حالانکہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔

لیکن ایک دوسرے کی صورت نہیں ملتی، رنگ نہیں ملتا، زبان نہیں ملتی، ایک پنجابی بولتا ہے، ایک پشتو، ایک ہندی بولتا ہے تو ایک بنگالی اور ایک انگریزی، دنیا کے جتنے جاندار ہیں۔ ہر قسم کی ایک زبان ہے۔ مثلاً طوطے کو لے لیجیے، طوطے نے ٹیں ٹیں ہی کرنی ہے۔ چاہے وہ طوطا ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا ہو، افغانستان کا ہو یا ترکستان کا ہو۔ مور ایک بولی بولے گا، چاہے ایشیا کا ہو یا یورپ کا یا افریقہ کا ہو، کبوتر ایک طرح بولے گا چاہے پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا کہیں اور کا۔

لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، ترکی کی اور زبان، پاکستانی کی اور زبان، یورپین کی اور زبان ایشین اور افریقہ کی اور زبان۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں کہ ایک ہی جنس کے انسان ہیں۔ لیکن زبان الگ الگ ہے اور کوئی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا ہے۔ بحر حال ہر چیز اپنی اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے ہیں، غرض" کنکریاں تسبیح کرتی ہیں"، "سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے"، "چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے"۔ "ہری ٹہنیاں تسبیح کرتی ہیں"، اگر نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں ذکر کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہے تو اِنسان، حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اِنسان کو ہونا چاہیے تھا۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو دی ہیں ساری کائنات میں وہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے کسی اور کو عطا نہیں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف

المخلوقات بنایا اور تمام جہان کو اِس کی خدمت میں لگا دیا۔

(1) ساری کائنات انسان کی غذا ہے

ہر جانور کا لباس اِس کی کھال ہے، انسان کو الگ لباس دیا، رنگ برنگ کا لباس، رنگ برنگ کے کپڑے، ہر نوع کی غذا ایک ہے کوئی نوع گھاس کھاتی ہے، کوئی دانہ کھاتی ہے کوئی پتے کھاتی ہے تو کوئی مٹی کھاتی ہے تو کوئی گوشت کھاتی ہے اور کوئی کیڑے مکوڑے کھاتی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا ہے۔ ہر چیز اِس کی غذا ہے۔ گوشت یہ کھائے، چونا یہ کھائے، سونا یہ کھائے اور چاندی یہ کھائے، غرض جمادیات، نباتات اور حیوانات ساری چیزیں انسان کی غذائیں ہیں۔ چاندی اور تانبے کے ورق نگل جائے گا۔ سونے اور چاندی کے کشتے کھا جائے گا۔ دنیا بھر کی ہر چیز اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہے۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا ہے اور پوری کائنات انسان کی غذا ہے۔

(2) ساری کائنات انسان کی سواری ہے

ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ انسان کو سواریوں پر چلایا گیا، حیوانات اِس کی سواریاں ہیں، نباتات اِس کی سواریاں، درختوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے اوپر بسیرا کر لیتا ہے۔ جمادیات انسان کی سواریاں، یہ تمام جہاز اور ریل گاڑیاں وغیرہ اور حیوانات اِس کی سواریاں ہیں۔ گویا اُونٹ، بیل، خچر، گدھا، یہ سب انسان کی سواریاں ہیں۔ تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار، جمادیات کے سروں پر یہ سوار اور نباتات کے سروں پر یہ سوار، سمندروں میں یہ سواری کرے، زمین کی پشت پر یہ سواری کرے اور ہواؤں کے دوش پر یہ سواری کرے۔ تو ہر جاندار اپنے پیروں پر چلنے پر مجبور ہے، اِنسان کو اپنا مقرّب اور محبوب بنایا اور ساری کائنات اِس کی سواری بنا دی گی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے- درختوں کی چھال سے انسان لباس بنائے، روئی سے یہ لباس بنائے، جانوروں کی کھال سے انسان لباس بنائے۔ لوہے اور لکڑی سے یہ لباس بنائے۔ غرض ساری کائنات اِس کا لباس، ساری کائنات اِس کی سواری، اللہ تعالیٰ کا اِتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت میں لگا دی۔ کہ کھانے کو بیٹھے تو جو چیز چاہے کھائے گا، بکرے کا گوشت، مرغی کا گوشت، مچھلی کا گوشت۔ لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ اس کو لباس بنانے دو، سواری پر سوار ہو تو سواری بھی سر تسلیم خم کر دے کہ اِس کو سوار ہونے دو، تو ساری کائنات انسان کی خدمت پر لگا دی۔ تو انسان کی خدمت ساری کائنات کرتی ہے تو سب سے زیادہ ذاکر بھی انسان کو ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہر مخلوق سے زیادہ غافل ہے تو انسان غافل ہے، انعامات کا تقاضہ کیا ہے؟ پتھروں کی شان دیکھیے کہ اللہ کے خوف سے

1۔ اِن میں سے نہریں اور چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔
2۔ پتھر رو پڑتے ہیں، اِن سے پانی بہہ نکلتا ہے۔
3۔ گویا خوفِ الٰہی سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں
4۔ اوپر سے نیچے گر پڑتے ہیں (خشیت الٰہی سے) (سورہ البقرہ، آیت نمبر 74)

یہ ان کی تواضع اِنکساری اور خوفِ خُدا کی بات ہے۔

لیکن اگر مغروری اور کبر بھرا ہوا ہے تو اِنسان میں بھرا ہوا ہے۔ نہ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا ہے نہ یہ گڑگڑاتا اور نہ یہ اللہ کے حضور گرتا ہے تو سب سے زیادہ غافل اِنسان ہے۔ حالانکہ اِس پر جس قدر انعامات کی بارش اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہیے تھا۔ (اللہ کو یاد رکھنا چاہیے تھا)

حقیقتِ زندگی

اِس لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے۔ تو ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے کہ جیسے مردوں میں زندہ بیٹھا ہو۔ اگر ایک پورا مجمع غافلوں کا ہو وہاں ایک اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے والا موجود ہو۔ وہ ایسا ہے کہ مردوں کے مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہو۔ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ **بدن کی زندگی، زندگی نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی ذکر ہے-**

مجھے ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام ہے دل کی زندگی کا، اور دل کی زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہوتی ہے، ابدی اور لافانی زندگی، بدن کی زندگی روٹی اور ٹکڑے سے ہوتی ہے، عارضی اور فانی زندگی، یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں ذرا دیر ہوئی مرجھا جائے گی۔ تو انسان اگر ذکر کرنے والا ہے تو سارے ذاکروں (یعنی تمام جانداروں) سے بڑھ جائے گا، کیونکہ اِس کا ذکر جامع ہوگا، جو باقی انواع کو میسر نہیں ہے، تسبیح قرآن، نماز، اور دُرود شریف وغیرہ اور اگر غافل بنے گا تو سب سے بدتر ہو جائے گا۔ حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذاکر ہوتا، لیکن یہ دنیا کی ذلت میں لگ گیا اور غافل ہو گیا تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے، غذائے روحانی، ذِکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کی حقیقی غذا

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ انبیا اور اولیاء اللہ کی غذا قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ، یہ قوت ان میں یادِ خُداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اُمت کو منع کیا کہ صوم وصام مت رکھو، یعنی سحری کرو اور افطار کرو اور پھر سحری کرو اور روزہ رکھو، یعنی لگا تار بغیر افطار کئے روزہ نہ رکھا کرو لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ خود صوم وصام رکھتے تھے بغیر کچھ کھائے، پندرہ پندرہ دن آپ خاتم النبیین ﷺ کا مسلسل روزہ ہوتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہمیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے اور خود آپ خاتم النبیین ﷺ صوم وصام رکھتے ہیں"، اس پر آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا! "تُم میں میرے جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے"۔ (صحیح بخاری)

یہ کھلانا اور پلانا کیسا؟، یہ اُس کے ذکر کی طاقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ کلامِ خُداوندی میں اللہ تعالیٰ کے ذکر میں بھرپور انرجی اور طاقت ہے۔ تو کھلانا اور پلانا، پلاؤ زردہ کا نہیں تھا بلکہ ذکر اللہ کی توانائی تھی۔ جو روح میں اُتر جاتی ہے اور بندہ توانا رہتا ہے۔ اِس لیے کہ اگر روح زندہ رہے تو بندہ خود بخود زندہ رہتا ہے

تو اللہ کا ذکر جب رگ و پے میں بس جائے تو غذا کی حاجت نہیں رہتی، زندگی کا دارومدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔ تو ذکرِ حق سے آدمی زندہ رہتا ہے، تو اصل زندگی، اصل حیات اور بقا یادِ حق کا نام ہے۔

ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ

پھر ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانونِ مکافات ہے، یہ قانون دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی "یعنی بدلے کا قانون" یا ردوبدل کا قانون یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، یعنی جیسا انسان خود کرے گا اللہ کی طرف سے بھی ویسا ہی معاملہ ہوگا۔ یہ دنیا کے معاملے میں بھی جیسا دوسروں کے ساتھ کرے گا ویسا اُس کے ساتھ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: (سورہ محمد، آیت نمبر 7)

ترجمہ: "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا"۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ: (سورہ البقرہ، آیت نمبر 152)

ترجمہ: "مجھے یاد کرو، مَیں تمہیں یاد کروں گا"۔

تو جیسا ذکر بندہ کرے گا ویسا ہی ذکر رَب اُس کا کریں گے، تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے تو انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔ اِدھر اِس نے ذکر کیا اُدھر اُس نے ذکر کیا تو مذکور بن گیا۔ تو اِس لیے اگر آدمی چاہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کا تذکرہ رہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ شروع کر دے، جتنا یہ یاد کرے گا اتنا ہی یاد کیا جائے گا۔ دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم، وزیر اعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں ہمارا ذکر آ جائے تو عزت اور افتخار سے ہمارا سر اونچا ہو جاتا ہے۔ اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج ہمارا تذکرہ وزیرِ اعظم یا پریزیڈنٹ کے ہاں ہوا تھا۔ تو ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے، کسی انسان کو یاد کرے تو یہ فخر کی بات ہوگی، حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اُس کے ہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ کتنے فخر کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو یاد کرے۔ اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب بندہ اُس کو یاد کرے گا۔

اس لیے فرمایا گیا "تم مجھے یاد کرو مَیں تجھے یاد کروں گا"۔ (سورہ البقرہ، آیت نمبر 152)

جو لوگ قرآن کریم کو یاد کر کے بُھلا دیتے ہیں- ان کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: (سورہ طٰہٰ، آیت نمبر 126-125)

ترجمہ: "روزِ محشر وہ بندے قیامت کے دن نابینا اُٹھائے جائیں گے، وہ کہے گا یارب مجھے اندھا کیوں اُٹھایا گیا جبکہ مَیں تو دُنیا میں دیکھنے والا تھا، جواب دیا جائے گا کہ ہم

نے اپنی آیات تیرے سینے میں ڈالیں تھیں تو نے اُنہیں بھلا دیا تھا، ہم نے تجھے بھلا دیا"۔

جو یہاں یاد رکھے گا یہ یاد وہاں کام دے گی۔ جو یہاں بھول جائے گا وہ وہاں کمپرسی کی حالت میں ہوگا۔ اِس لیے یادِ خُداوندی یا ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ یہ انسان کی بھی روح ہے۔ اگر ذکر منقطع ہوجائے تو روح پر مُردنی چھاجاتی ہے، اگر احساس ہو فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزار دھبے پڑ جائیں نظر نہیں آتے کیونکہ کپڑا پہلے ہی سیاہ یا میلا ہے تو نظر کیا آئے گا؟ اور سفید کپڑے پر ذرا بھی داغ دھبہ لگ جائے تو وہ نمایاں ہوجاتا ہے، اور محسوس ہوتا ہے۔ تو جن کے قلوب میں غفلتیں رچ بس گئیں ہیں تو ان میں اگر دس غفلتیں اور آجائیں تو احساس نہیں ہوگا کیونکہ دل پہلے ہی غفلتوں میں رنگا ہوا ہے۔ لیکن یاد کرنے والا ایک منٹ کے لیے بھی غافل ہوا تو اُسے احساس ندامت ہوجاتا ہے کہ کوئی چیز میری چھِن گئی ہے۔ تو ذکر اللہ انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کے ذرائع، یادِ حق کے طریقے

(1) صبح وشام کی تسبیحات

(2) ہر وقت کی دُعائیں

(3) سونے جاگنے کی دُعائیں

(4) سُنتوں پر عمل

(5) چلتے پھرتے ذکر

(6) ہاتھ میں تسبیح رکھنا (یہ ذکر کرنا یاد دلاتی رہتی ہے)

خلاصہ یہ کہ زندگی صرف اور صرف ذکر اللہ ہے (یادِ الٰہی ہے) جب کائنات، نباتات، جمادیات، حیوانات کی زندگی اِس سے ہے تو انسان کی زندگی اِس سے کیوں نہ ہو۔ تو انسان کو سب سے بڑا ذاکر بن کر زندہ جاوید ہوجانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے! آمین

****

دیدارالٰہی

فرمان الٰہی ہے: (سورہ لانشقاق، آیت نمبر 6)

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ

ترجمہ: ''اے انسان بے شک تجھ میں اپنے رب کو پا لینے کی کوشش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پس تو اس (اپنے رب) سے ملاقات کر سکتا ہے۔''

ترجمہ: ''اے انسان تو اپنے رب سے ملنے تک یہ کوشش اور تمام کام اور محنتیں کر کے اس سے ملاقات کرنے والا ہے''۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (سورہ الفرقان، آیت نمبر 20)

اَتَصْبِرُوْنَ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا

ترجمہ: ''آیا تم صبر کئے بیٹھے ہو؟ (اور اپنے اللہ کو پا لینے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟) حالانکہ تمہارا رب تمہاری طرف دیکھ رہا ہے''۔

قرآن پاک میں (سورۃ الذاریات آیت 50)

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ

ترجمہ: ''پس دوڑو اللہ کی طرف''

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: (سورہ العنکبوت، آیت نمبر 69)

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

ترجمہ: ''جو لوگ ہمارے قرب اور وصال کے لیے تگ و دو کرتے ہیں ہم انہیں اپنی طرف آنے کے راستے دکھا دیتے ہیں''۔

مزید فرمان الٰہی ہے: (سورۃ الانعام، آیت نمبر 31)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ

''بے شک وہ لوگ خسارے کا شکار ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لقا (دیدار، ملاقات) کا انکار کیا''۔

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو دیدار الٰہی کے بارے میں فرماتے ہیں ''واضح ہو کہ اللہ کا دیدار قرآن اور حدیث کی رو سے تین طریق پر ہے۔

1۔ اللہ کا دیدار خواب میں روا ہے اسے نوری خواب کہتے ہیں۔

2۔ اللہ کا دیدار مراقبے میں جائز ہے۔ وہ مراقبہ جو موت کی طرح حضور مولیٰ میں پہنچا دے۔

3۔ کھلی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا روا ہے کہ دیکھنے والے کا جسم اس جہان میں ہو اور جان لاہوت و لامکاں میں ہو۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے یہ تمام مراتب مرشد کامل سے حاصل ہوتے ہیں۔ رسالہ روحی شریف میں درج ہے۔

ترجمہ: ''اور جس ایک تجلی سے موسیٰؑ سراسیمہ ہو گئے اور کوہ طور پھٹ گیا۔ ہر لحہ اور ہر پل میں جذبات انوار ذات کی ویسی ہی تجلیات ستر ہزار باران فقرا پر وارد ہوتی رہتی ہیں مگر وہ نہ دم مارتے ہیں نہ آہ بھرتے ہیں بلکہ مزید تجلیات کا تقاضہ کرتے رہتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال کے ''مقام خودی (مقام فقر) پر پہنچ کر ذات الٰہیہ کو بے حجاب دیکھنے کا نام زندگی ہے''۔

آپ نے (علامہ اقبال نے) ایک جگہ فرمایا:

تو ہے میرے کمالات ہنر سے
نہ ہو ناامید اپنے نقش گر سے
میرے دیدار کی ہے ایک ہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

یہ وہ کھلے حقائق ہیں جو دیدار الٰہی پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ دیدار الٰہی کی نعمت سے سرفراز ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا بے حد ضروری ہے۔

1۔ طلب الٰہی کے علاوہ ہر قسم کی طلب کو ترک کرنا

2۔ دیدار الٰہی سے مشرف مرشد کامل مکمل و اکمل کی محبت

3۔ شریعت مطہرہ کی مکمل پیروی میں دائم، تصور اسم اللہ ذات کی پابندی اس طرح کہ تصور اسم اللہ ذات میں طالب کا وجود گم ہو کر رہ جائے۔

بقول حضرت سلطان باہوؒ کہ

ترجمہ: ''اسم اللہ ذات اور طالب کا جسم جب یک جان ہو جائیں تو طالب کے وجود میں جو راز پنہاں (ذات الٰہی کا نور) ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے''۔

حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے وجود میں اللہ تعالیٰ اس طرح پوشیدہ ہے کہ جس طرح پستے کے اندر مغز چھپا ہوا ہے۔ اب ہم دیدار الٰہی کو سمجھنے کے لیے سیدنا غوث الاعظم حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کا فرمان نقل کرتے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے جب اپنے ظہور (ظاہر ہونے کا) کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے سرور دو عالم حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی روح اقدس کو اپنے نور جمال سے پیدا فرمایا۔ پھر روح محمد خاتم النبیین ﷺ سے تمام ارواح (ارواح انسانی) کو عالم لاہوت (انور ذات الٰہی کا عالم) میں احسن و حقیقی صورت میں پیدا فرما کر لاہوت کو ارواح کا اصلی وطن بنایا تا کہ مشاہدہ جمال ذات کے ذریعہ ارواح اس کی محبت میں قرار و سکون حاصل کر سکیں۔ اپنے اصل وطن لاہوت میں انسان کا نام روح قدسی ہے۔ یہاں اس کا وجود خالص نور ذات سے ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اسے'' اپنی روح'' یعنی اپنا جوہر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ (اور اس میں میں نے اپنی روح پھونکی) (سورۃ الحجر، آیت نمبر 29)

انسان کی اسی صورت کو اللہ تعالیٰ نے فی احسن تقویم اور انسان کے اس روپ کے متعلق حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

خلق اللہ ادم علی صورتہ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)

اور اس کی صفت یوں بیان کی وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا (اور آدم کو کل اسماء کے نور سے مزین کیا گیا) (سورۃ البقرہ، آیت نمبر 31)

انسان کی ہی وہ صورت ہے جس میں ذات الٰہی کو بے حجاب دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چار ہزار سال تک ارواح قدسی عالم لاہوت میں مشاہدہ جمال ذات سے مشرف ہو کر عشق الٰہی میں محو رہیں۔ چار ہزار سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے امر ''کن'' فرما کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے نور سے اپنی صفاتی پہچان کے لیے کائنات کے مختلف عالم کو پیدا فرمایا چونکہ تخلیق کائنات کا تمام مرحلہ حضرت انسان کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوا اس لیے سلطان باہوؒ نے اس منظر کو یاد کرتے ہوئے فرمایا:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے ''امر کن'' فرما کر کائنات تخلیق فرمائی تو ہم بھی اس وقت اللہ تعالیٰ کے قرب (عالم لاہوت) میں موجود تھے۔''

اس کے لیے پیر مہر علی شاہ نے فرمایا ترجمہ: ''کن فیکون'' کا مرحلہ تو کل کی بات ہے ہم تو اس سے بہت پہلے عشق الٰہی کا شکار ہو چکے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات معرفت (پہچان کروانے کے لیے) کے تین جہان پیدا فرمائے۔

1۔ <u>عالم ناسوت</u>: یہ جہان اجسام کا جہان ہے جس میں ہم تم رہتے ہیں۔

2۔ <u>عالم ملکوت</u>: یہ جہان، عالم جبروت سے نیچے ہے جہاں ملائکہ محو کار ہیں۔

3۔ <u>عالم جبروت</u>: جبر و قدر کا جہان، حضرت جبرائیلؑ کا مقام۔ اس کی انتہائی حد سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اس میں جنت الفردوس ہے۔ لوح محفوظ ہے، یہ جہان انوار ذات الٰہی کے جہاں عالم لاہوت سے نیچے ہے۔ مگر انوار صفات الٰہی کا یہ سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ جب یہ تینوں جہاں اللہ تعالیٰ نے خلق خدا کے لیے پیدا فرما دیئے۔ تو انسان کو انوار صفات الٰہیہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے نیچے اتارا گیا۔

(1) سب سے پہلے انسان (روح قدسی) کو نور جبروت کا لباس (جبروتی) پہنا کر عالم جبروت میں بھیجا گیا۔ اگر اسے نور جبروت کا لباس نہ پہنایا جاتا تو انسان کے انوار سے عالم جبروت جل اٹھتا اور یہ باقی نہ رہ پاتا۔ عالم جبروت میں انسان کا نام "روح سلطانی" مشہور ہوا۔ اس روپ میں اسے جہان بینی و جہاں بانی کی تعلیم سے سنوارا گیا۔ پھر اسے عالم جبروت سے نچلے جہانِ عالم ملکوت میں نور ملکوت کا لباس پہنا کر بھیجا گیا۔ یہاں یہ روح روحانی یا "روح سیرانی" کے نام سے موسوم ہوا اور اسے آداب بندگی کی تعلیم سے سنوارا گیا۔ اس کے بعد اسے کائنات کے سب سے نچلے طبقے عالم ناسوت میں یہ کہہ کر بھیجا گیا۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (سورہ التین، آیت نمبر 5)

پھر اسے کائنات کے سب سے نچلے طبقے میں بھیج دیا گیا۔ یہاں اسے نور ملک کا لباس (گوشت پوست اور ہڈیوں کا جسم) یہاں اس کا نام "روح جسمانی" رکھا گیا۔ اب چونکہ اپنے اصل وطن عالم لاہوت میں تو انسان خالص نوری حالت میں تھا اس کی خوراک بھی نور تھی۔ یعنی انوار ذات الٰہی ہی اس کی خوراک تھی لیکن جب عالم خلق میں بھیجا گیا تو ہر طبقے میں اس کے جسم کے مطابق اس کی روزی کا حساب رکھا گیا۔

عالم جبروت میں جنت الفردوس کی نعمتیں اس کے جبروتی جسم کا رزق بنیں۔ عالم ملکوت میں جنت النعیم کی نعمتیں اس کے ملکوتی جسم کا رزق بنیں اور عالم ملک میں جنت الماویٰ کی نعمتیں اس کے مَلکی جسم کا رزق بنیں اور عالم اجسام میں یعنی عالمِ ناسوت میں دنیا کی نعمتیں اس کے سفلی ناسوتی جسم کا رزق بنیں۔ اب انسان کا اصل ہدف یہ ہے کہ سب سے پہلے علم شریعت اور اعمال شریعت کے ذریعے جنت الماویٰ میں پہنچ کر عالم ملک میں موجود انوار صفات الٰہی کی معرفت حاصل کرے اور جب یہ حاصل ہو جائے تو اسے چھوڑ دے اور آگے بڑھ جائے اور پھر۔

(2)۔ علم طریقت اور اعمال طریقت کے ذریعے عالم ملکوت میں جنت النعیم تک پہنچے اور وہاں انوار صفات الٰہی کے اعلیٰ درجات سے بہرور ہو اور پھر اسے بھی چھوڑ دے اور پھر۔

(3)۔ علم معرفت اور اعمال معرفت اختیار کر کے عالم جبروت میں جنت الفردوس میں پہنچے اور انوار صفات الٰہی کے اعلیٰ ترین درجات کو پالے اور پھر اسے بھی چھوڑ دے۔

(4)۔ اور خلق کے دائرے سے نکل کر علم حقیقت اور اعمال حقیقت کے ذریعے عالم لاہوت میں پہنچ کر اپنے اصلی ٹھکانے پر انوار ذات الٰہی سے بے حجاب مستفیض ہو۔

عالم ناسوت سے لے کر عالم جبروت تک۔ جسم اور بشریت اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں لیکن عالم جبروت سے آگے عالم لاہوت میں خلق کی کوئی شے داخل نہیں ہو سکتی کہ انوار ذات الٰہی اسے جلا ڈالتے ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے بشریت کو فنا کرنا پڑتا ہے۔ بشریت کو فنا کرنے کے عمل کو "موتو قبل ان تموتوا" کہا گیا ہے۔ یعنی موت سے پہلے موت۔ جب تک بشریت کو فنا نہیں کریں گے نفس اور شیطان سے چھٹکارا ناممکن ہے لیکن جب انسان عالم جبروت کے سرحدی مقام سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بڑھتا ہے تو شیطان و نفس اس کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ عالم لاہوت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں انسان مخلص بن جاتا ہے۔ اسی مقام لاہوت کے باسیوں کے متعلق تو شیطان نے کہا تھا کہ "اے رب مجھے تیری عزت کی قسم میں ان لوگوں کو ضرور اغوا کروں گا مگر تیرے مخلص بندے میری پہنچ سے باہر ہوں گے"

سید غوث الاعظمؒ نے فرمایا "اللہ کی معرفت دو قسم کی ہے۔

1۔ معرفت صفات الٰہیہ اور

2۔ معرفت ذات الٰہیہ

معرفت صفات الٰہیہ

معرفت صفات دونوں جہان میں اس جسم کا حصہ ہے اور یہ درجات ہیں۔

پہلا درجہ: جنت الماویٰ ہے جو عالم ملک میں واقع ہے۔ اور اس کا حصول علم شریعت اور اعمال شریعت کے بغیر ناممکن ہے۔

دوسرا درجہ: جنت النعیم ہے اور عالم ملکوت میں ہے اس تک انسانی رسائی علم طریقت اور اعمال طریقت کے بغیر ناممکن ہے۔

تیسرا درجہ: جنت الفردوس ہے جو عالم جبروت میں ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے علم معرفت اور اعمال معرفت لازمی ہیں۔

معرفت ذات الٰہیہ

معرفت الٰہی آخرت میں روح قدسی کا حصہ ہے یعنی اس کے لیے مرنے سے پہلے مرنا ضروری ہے یعنی عالم جبروت سے آگے بڑھ کر عالم لاہوت میں پہنچنا ضروری ہے جہاں جنت قرب ہے۔ جس میں حور و قصور اور لذات بدن قطعاً نہیں ہیں۔ وہاں صرف انوار ذات الٰہی کے جلوے ہیں جن میں انسان سکون و قرار پکڑتا ہے اور ہر دو جہاں کی آرزوں سے نجات پا جاتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے عمل حقیقت اور اعمال حقیقت اختیار کرنا ضروری ہے۔ عالم لاہوت سے نیچے کسی بھی مقام پر رک جانا انسان کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔ جنت الماویٰ یا جنت النعیم یا جنت الفردوس کے رزق پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا انسان کی ناکامی ہے۔ جب تک انسان عالم لاہوت میں انوار ذات سے بہرور نہیں ہوتا اس وقت تک وہ ناکام ہے۔

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

سیدنا غوث حمدانی عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ معرفت الٰہی دل کی آنکھ کھلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دل کی بھی دو آنکھیں ہیں۔

1- عین صغریٰ 2- عین کبریٰ

1- عین صغریٰ

جب عین صغریٰ کھلتی ہے تو انسان کو معرفت صفات الٰہی نصیب ہوتی ہے۔

2- عین کبریٰ

جب عین کبریٰ کھلتی ہے تو انسان کو معرفت ذات الٰہی نصیب ہوتی ہے۔

اکثر لوگوں کو قرآن مجید کے اس بیان نے الجھا کر رکھ دیا جس میں موسیٰ علیہ السلام طلب مولا میں مشتاقِ دیدار ہو کر دیدار الٰہی کی التجا کرتے ہیں۔ اس واقعے سے یہ قطعی نتیجہ اخذ کر بیٹھتے ہیں کہ جب ایک نبی دیدار الٰہی سے معذور ہے تو ہم تم اس قابل کہاں؟ حالانکہ معاملہ صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے ذریعے طالب مولا کے ایک مقام کو واضع فرمایا ہے کہ طالب پر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں وہ اپنی منزل کو بہت قریب محسوس کرتے ہوئے عجلت پسندی پر اتر آتا ہے جس کی وجہ سے اسے ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔ موسیٰؑ کو معرفت صفات الٰہی کے انتہائی مقام پر جب آگے بڑھنے کی طلب ستاتی ہے تو وہ فوری طور پر انوار ذات الٰہی سے مستفیض ہونے کی طلب میں بے قرار ہو کر التجائے دیدار کرنے لگتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ابھی ٹھہرو، عجلت مت کرو۔ یہاں موسیٰؑ کی ذات کو بطور طالب مولا استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت حال اس سے مختلف ہے۔

قرآن مجید میں ایسے کئی مقامات آئے ہیں جہاں مختلف انبیاء کرام نے طالب مولا کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کر کے طالبان مولا کو رموز معرفت سکھلائے ہیں۔ ایسے واقعات محض طالبان مولا کی تربیت کی خاطر قرآن مجید میں وارد کئے گئے ہیں۔ ورنہ **تمام انبیاء کرام حق الیقین کے مرتبہ پر فائز تھے اور ہیں اور حق الیقین بے حجاب دیدار الٰہی کا مرتبہ ہے۔** قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کچھ واقعات مدرج ہیں جو انہیں راہ سلوک میں پیش آئے۔ اگر ان کا ظاہری الفاظ والا مطلب لیا جائے تو انسان کفر کی حالت میں چلا جاتا ہے۔ مثلاً باطنی مشاہدہ کی اہمیت اہل ایمان پر واضح کرنے کے لیے حضرت ابراہیم خاتم النبیین ﷺ کا ایک واقعہ یوں بیان کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرتے ہیں۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط

''اے میرے رب مجھے دکھا تو سہی کہ تو مردوں کو زندہ کیونکر کرے گا؟ (سورۃ البقرہ آیت نمبر 260)

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ''کیا تیرا اس بات پر ایمان نہیں ہے'' حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا ''بلیٰ'' ''اے میرے مالک کیوں نہیں'' میرا ایمان تو ہے وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ''لیکن میں اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں'' (سورہ البقرہ، آیت نمبر 260)

یہاں بھی طالب مولا کو سکھایا جا رہا ہے کہ ایمان کا دارومدار دل کی تصدیق پر ہے اور دل اس وقت تک تصدیق نہیں کرتا جب تک مشاہدہ نہ کرے، مشاہدے کے بغیر دل معترض رہتا ہے اور شیطان مختلف وساوس کے ذریعے ایمان کو ضعف پہنچاتا رہتا ہے لیکن مشاہدہ کر لینے کے بعد شیطان کے بہکاوے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والا ہے۔ اول یہ کہ وہ ستارے کو دیکھ کر اپنا رب مان لیتے ہیں پھر اس کے ڈوب جانے پر اپنا نظریہ بدل لیتے ہیں۔ پھر چاند اور سورج کو دیکھ کر بھی پکار اٹھتے ہیں کہ یہ میرا رب ہے لیکن ان کے ڈوبنے پر اس اعتقاد سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ظاہر بین حضرات یہاں بھی تذبذب کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور مختلف عقلی توجہات پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی طالب مولا کو راہ سلوک میں جن تجلیات سے واسطہ پڑتا ہے ان کا بیان ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو طالب راہ سلوک کے طالب علم کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مقام ملک یا مقام ناسوت میں طالب پر تجلی نفس اس طرح وارد ہوتی ہے کہ اسے انوار الٰہی نظر آنے لگتے ہیں۔ جو روشن چمکدار ستارے کی مانند نظر آتے ہیں اور طالب مولیٰ سمجھتا ہے کہ یہی انوار ذات الٰہی ہیں اور پکار اٹھتا ہے کہ میں نے رب کو پا لیا

لیکن کچھ عرصے کے بعد طالب جب ترقی کر کے آگے بڑھتا ہے تو تجلی نفس پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور وہ معدوم ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو طالب جان لیتا ہے کہ وہ تجلی نور ذات کی تجلی نہ تھی۔ جسے وہ خواہ مخواہ تجلی نور ذات سمجھتا رہا۔

اس کے بعد سالک جب عالم ملکوت میں پہنچتا ہے تو اس پر تجلی قلب اس طرح وارد ہوتی ہے کہ اسے انوار اسماء حسنیٰ چاند کی طرح روشن نظر آتے ہیں تو یہ خوش ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ ''اب میں نے انوار ذات کو پا لیا ہے'' لیکن جب عالم ملکوت سے آگے بڑھ کر عالم جبروت کی طرف پرواز کرتا ہے تو یہ تجلی قلب بھی غائب ہو جاتی اور طالب پھر اس سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے اور جب عالم جبروت میں تجلی روح اس پر وارد ہوتی ہے جس سے انوار صفات الٰہی نظر آتے ہیں جو سورج کی طرح روشن اور واضح ہوتے ہیں تو وہ اس تجلی کو تجلی ذات سمجھ کر اپنے اطمینان کا اظہار کر دیتا ہے کہ یہ میرے رب کے جلوے ہیں لیکن جب طالب اس سے بھی آگے عالم لاہوت میں پہنچتا ہے تو اس پر اصلی انوار ذات کی تجلیات کا نزول ہوتا ہے جو بے کیف و بے جہت و بے چون و بے چگون ہوتی ہیں اور وہ نہ تو معدوم ہوتی ہیں اور نہ زائل ہوتی ہیں تو طالب جان لیتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی اور ذاتی تجلیات ہیں اور انہی اصل و حقیقی تجلیات ذات میں وہ اصلی توحید کے مرتبے پر فائز ہو کر خالص موحد بنتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ ''اب میں اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں اور باقی تمام انوار کے شرک سے چھٹکارہ پا چکا ہوں''۔

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (سورۃ الانعام، آیت نمبر 79)

ترجمہ: ''میں نے اپنا رخ اپنے رب حقیقی کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا یکسو ہو کر اور اب میں غیر معبودوں میں پھنسنے والا نہیں''۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

نگاہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

لہٰذا اس قسم کے بیانات جو قرآن حکیم میں مدرج ہیں تو ان کا مقصد صرف طالبان مولا کی تربیت اور راہنمائی ہوتا ہے نہ کہ انبیاء کرام کی معذوری و بے خبری سے عوام الناس کو آگاہ کرنا ہوتا ہے (نعوذ باللہ)

اللہ تعالیٰ ہم سب کے حجابات دور فرمائے اور ہم سب کو اپنے انوار ذات سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وما توفیقی الا باللہ

****

مظہر ذات الٰہی (کائنات)

یہ کائنات جہاں آئینہ جمال ہے وہاں یہی کائنات مظہر ذات الٰہی اور مظہر صفات انسانیہ بھی ہے۔ کائنات میں رونما ہونے والا ہر واقعہ، ہر عمل اور ہر کرشمہ انسان کی داخلی اور ذاتی کائنات میں منعکس ہوتا ہے۔

اس کائنات کے سیاروں اور ستاروں کی چال اور رفتار سے لے کر ایک معمولی سی حقیر چیونٹی تک ہر شے اپنے اندر ایک عجب پیغام رکھتی ہے۔ اللہ نے اپنی ذات کی پہچان کے لئے غور و تدبر کے لیے کہا ہے۔ انسان اپنے اندر اس کائنات پر غور کرے تو بہت کچھ نظر آجاتا ہے۔ ہاں تدبر والا ذہن اور بینا آنکھوں کی ضرورت ہے۔ یہ کائنات مرقع نور ہے۔ اس پر لکھنے والوں کے قلم ہمیشہ خشک ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے مشاہدات ختم ہی نہیں ہوتے۔ یہ غیر محدود مشاہدات ہیں، کہکشاؤں کے عظیم اور وسیع سلسلے، شمس و قمر کے جلوے، چمکنے والے ستاروں کی یہ حسین کائنات اتنی منور ہے کہ یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس کو تخلیق کرنے والا خود ہی تو اس کائنات کا نور ہے۔ وہ ہی تو زمین اور آسمان کا نور ہے۔ اس کے پرتو (عکس) سے یہ زمین منور ہے اتنی روشن، کائنات ایک روشن دلیل ہے اپنے نوارنی خالق کی۔

اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ہاں اگر حاصل تمنا سے زیادہ ہو تو سکون کا باعث بن جاتا ہے ایسے انسان ہمیشہ ہی مطمئن رہتے ہیں۔ انسان کماتا ہے تاکہ زندہ رہے۔ اور زندہ رہتا ہے کہ کماتا رہے۔ ہم اس جہاں میں کیسے گزارا کر رہے ہیں؟ ہم نے شاید سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ اتنی بڑی کائنات اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بنائی ہے ضرور بنائی ہے لیکن ذرا سوچ تو سہی کہ اس باری تعالیٰ نے ہمیں اپنے لئے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غور کرنے کے لئے کہا ہے، سوچنے کے لئے کہا ہے لیکن ہم نے تو شاید سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اچھا کیا ہے بہت اچھا کیا ہے۔ سوچنا بہت بڑی بیماری ہے۔ ایسی بیماری جس کا علاج نہیں ہے، سوچنے والے کو کبھی رات کو سورج نظر آتا ہے کبھی دن کو تارے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر شے کو ایک زاویے سے دیکھتا ہے۔ سوچنے والا الفاظ کے معنی ہی نہیں معنی کے چہرے بھی دیکھ لیتا ہے۔ اور پھر ان چہروں سے محو کلام ہوتا ہے۔ ''چہرے کے معنی'' اور ''معنی کے چہرے'' عجب بات ہے۔ اس لیے کہ سوچنے والوں کی دنیا، دنیا والوں کی سوچ سے الگ ہوتی ہے۔ ہم نے اچھا کیا کہ ہم سوچتے ہی نہیں ہو۔ ہم سوچ سے نکل گئے۔ اب ہم عمل ہی عمل ہیں۔ بے وجہ اور بے نتیجہ عمل۔ ہم مصروف ہیں اور شاید ہم مصروف ہی رہنے کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ مصروف، مشین کی طرح۔ دریا کی طرح، چیونٹی کی طرح گردش املاک اور گردش حالات کی طرح۔ ہم سوچ میں وقت ضائع نہیں کرتے کیونکہ ہمارا وقت بیش قیمت ہے۔ ہمیں حرکت دینے والی طاقت کے لئے کام ضرورت ہے اور ضرورت کا پجاری کثرت پرست ہوتا ہے اور کثرت پرست کو سوچ، تدبر اور تفکر مل ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ ایسا انسان وہی کچھ حاصل کر سکتا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ دنیا کی ضرورتیں جس کے لئے وہ محنت کر رہا ہے۔

اگر ذوق نظر میسر ہو تو انسان دیکھے گا کہ یہ کائنات ایک عجب تماشا ہے۔ کرنوں میں آفتاب ہیں، قطروں میں بحر ہیں، دریا شباب میں ہیں، ذروں میں دشت ہیں، ہاں کائنات کی وسعتوں کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا جائے بلا مبالغہ ہوگا۔ ہم ایک سورج سے وابستہ ہیں۔ اور اس کائنات میں ایسے کروڑوں سورج موجود ہیں۔ ایسے سیارے اور ستارے دریافت ہو چکے ہیں جن کا زمین سے فاصلہ ہزاروں لاکھوں ''نوری سال'' ہے۔ یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلنے والی روشنی ایک ستارے سے زمین پر آنے میں لاکھوں سال لیتی ہے۔ اللہ اللہ یہ وسعت۔ انسان سوچ کر ہی سہم جاتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں زمین کی کیا حیثیت، اور زمین میں ایک ملک کی کیا اہمیت؟ اور ملک میں ایک شہر اور شہر میں ایک مکان۔ اور اس مکان میں ایک انسان۔ پھر اس انسان میں ایک چھوٹا سا دماغ۔ کیا جسارت کرے گا اس وسیع کائنات کے عظیم خالق کے بارے میں لب کشائی کرنے کی۔ مقام تحیر اور مقام سکوت ہے۔ کہاں ہم اور کہاں ہمارا تدبر اور تفکر؟ کہاں میں اور کہاں دیر و حرم کا کشمکش نقشہ؟

اسی کائنات میں ایسے علاقے ہیں جہاں اتنی سردی ہے کہ بس انسان ذکر کرے تو خیال منجمد ہو جائے، اور کہیں اتنی حدت ہے کہ سورج ہی پناہ مانگے۔ یہ کائنات عجب ہے۔ تخلیق اپنے خالق کی مظہر ہے۔ **جس خالق نے اس کائنات کو تخلیق کیا اس کو حیران کن مظہر بنایا۔ اسی خالق نے انسان کو بڑے دعوے اور وثوق سے اشرف المخلوقات پیدا فرمایا، یہ ایک عظیم احسان ہے۔ عظیم محسن کا۔ انسان کو بینائی عطا فرمانے والا، اپنے بے مثال حسن کے پرتو میں اس کائنات کی ہمہ رنگ نیرنگیوں اور رنگینیوں میں جلوہ گر** ہے۔ انسان کی پہچان کے لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کو آسمان اور زمین کے حوالے سے ظاہر فرمایا۔ انسان اپنی ہستی کا سفر زمین پر ہی شروع کرتا ہے اور یہ سفر زمین پر ہی ختم بھی ہوتا ہے۔ انسان کے گرد پھیلی ہوئی زندگی اس کے علم کے وسیع ابواب میں اسے علم الاسماء عطا فرمایا گیا۔ وہ اسما سے اشیا کو پہچانتا ہے۔ پھر اشیاء سے مفاہم تلاش کرتا ہے اور پھر اسے ہر طرف پھیلے ہوئے سلسلے، اپنی صلاحیتوں اور صفات کے استعارے نظر آتے ہیں۔ انسان کی کائنات حسین و جمیل علامتوں کی کائنات ہے یہ وہ راز ہے جو انسان کو جاننے والا بناتا ہے۔ انسان ظاہر سے باطن اور باطن سے ظاہر کا سفر طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ وجوہ سے نتائج اور نتائج سے وجوہ تلاش کرتا ہے۔

وہ ہر شے کے اندر پنہاں اس جوہر کو ڈھونڈتا ہے جو اس شے کی پہچان ہے۔ اس شے کا راز ہے، اور یہ راز اور یہ جوہر اور یہ صفت انسان کی اپنی کسی صفت کا مظہر ہوتی ہے۔

پہاڑوں کو انسانوں نے اپنے عزم کا مظہر کہا۔ نہ بدلنے والا اٹل ارادہ۔ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

ترجمہ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے وہ پتھر ہوں، حالانکہ میں نے پتھروں سے بھی نہریں جاری کی ہیں''۔ (سورہ البقرہ، آیت نمبر 74)

گویا پتھر سے دریا کا نکلنا ایسے ہے جیسے سخت دل انسان کا دل بھر آنا۔ یا کسی سخت دل کی آنکھ سے آنسو کا بہنا۔ دریا کو زندگی کا دریا کہا گیا ہے۔ جو موت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ہر دریا آخر کار تاریک سمندر میں گر جاتا ہے۔ اور لوگ تنکوں کی طرح اس دریا میں بہتے ہی چلے جاتے ہیں۔

''سمندر'' کو ہستی کا آغاز و انجام کہا گیا ہے۔ انسان بادلوں کی طرح سمندر سے آتا ہے اور واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔ یہی اس کا گھر ہے۔ سمندر یا قلزم سے بڑے معنی وابستہ ہیں۔ سمندر روح ہے۔ یہ نصف شب کو جاگتا ہے۔ طوفان میں ہو تو کناروں کو اُڑا دے، پُرسکون ہو تب بھی گہرائی کے خوف سے پُرخوف ہو۔ سمندر مُردار کو باہر نکال پھینکتا ہے۔ اِس کے باطن میں خزانے ہیں۔ موتیوں کے، زندگی کے اور اس کے اندر انسان کے لئے بڑے علوم ہیں۔ جب تک سمندر زندہ ہے، زندگی ختم نہیں ہو سکتی، سمندر گہرا ہے، کڑوا ہے۔ **ناقابل تسخیر وسعت کو سمندر کہا گیا ہے۔ فیاض اور علم کے پیکر کو بھی سمندر کہتے ہیں۔**

دیکھتے ہیں کہ انسان نے اپنے گرد رہنے والے جانداروں سے کیا حاصل کیا؟۔ انہیں کیسے کیسے معنی دیے؟ ان سے کیا کیا سبق، کیا کیا عبرت اور کیا کیا نتائج نکالے؟، پرندوں کی دنیا میں شاہین کو لیجئے۔ مردِ مومن ہی شاہین ہے پرندوں کی دنیا کا درویش ہے آشیانہ نہیں بناتا ہے۔ بلند پرواز ہے، بلند نگاہ ہے۔ پہاڑوں کی چٹانوں پر رہتا ہے، قصرِ سلطانی سے گریز کرتا ہے۔ اس میں ایک مردِ حُر کی صفات عالیہ ہیں۔ ایک آزاد قوم کے لئے شاہین ایک بہت بڑا استعارہ ہے۔ سورج کو نگاہ میں نہیں لاتا۔ مر جائے تب بھی زمین پر نہیں گرتا۔ اس کی نگاہ آسمانوں پر رہتی ہے۔ اس کا رزق صالح اور پاکیزہ ہے۔ یعنی یہ زندہ کبوتر شکار کرتا ہے۔ شاہین مانگ کر نہیں کھاتا کسی کا نہیں کھاتا۔ کسی کا بچا ہوا نہیں کھاتا۔ مردار نہیں کھاتا غیرت والا ہے، متوکل ہے، قوی ہے، جھپٹتا ہے، پلٹتا ہے، خون گرم رکھتا ہے، نگاہ تیز رکھتا ہے، درویشی میں بادشاہی کرتا ہے۔ اور بادشاہی میں درویشی کرتا ہے۔ اقبال کا شاہین ہی اقبال کا مردِ مومن ہے۔ اقبال نے جوانوں میں عقابی روح کے بیدار ہونے کی دعا کی ہے۔ عقابی روح کا کام ہے آسمانوں کی طرف پرواز کرنا اور پھر شہباز لامکاں، شہباز طریقت، شہباز خطابت اور پھر ہمارے شاہین، یعنی ہماری ایئر فورس۔ ایک پرندے نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا۔ یہی خودی ہے۔

خودی کیا ہے؟ بقول اقبال ''خودی ایک پراسرار طاقت ہے جو پہلے ضمیرِ وجود میں جنم لیتی ہے اور پھر ساون کی گھٹا کی طرح حیات پر چھا جاتی ہے۔ اس سے دیدہ دل میں نور آتا ہے اور محویت اور مستی کی دولت ملتی ہے۔ صاحب خودی کی توجہ من کی طرف ہو جاتی ہے۔ وہ خلوت پسند بن جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسی فضاؤں میں پہنچ جاتا ہے جہاں دوش و فردا کی پابندی نہ ہو۔ خودی کی ناؤ امواج حوادث کے تھپیڑے سہتے اور تلاش مطلب کی راہیں بدلتے ہوئے مسلسل سرگرم سفر رہتی ہے اور ہر منزل کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ خودی دل کی گہرایوں سے وہ قوت حاصل کرتی ہے کہ سمندروں کو ایک ڈانٹ سے خشک اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

دو نیم　ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے　رائی

خودی ہر مقام پر اپنا رنگ بدلتی ہے۔ یہ ازل سے ظہور کامل کے لئے بے تاب تھی اس نے ہزار مناظر تلاش کئے، کوہساروں میں عظمت، سمندروں میں جلال، مہ و انجم میں نور اور رگِ تاک میں سرور بن کر سمائی لیکن مطمئن نہ ہوئی۔ بالآخر جب پیکر آدم میں جلوہ گر ہوئی تو کائنات میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ عرش کے باسیوں نے پروردگیان لامکاں کو آواز دی۔ ''ہوشیار ہو جاؤ کائنات میں ایک صاحب نظر پیدا ہو گیا ہے، جس کی نگاہ تماشا بین سے اب تم نہاں نہیں رہ سکتے اور خودی (زندگی) نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے کہ اسے عیاں ہونے کا ایک راستہ مل گیا۔ **خودی ایک سنگم ہے جہاں سے کئی راہیں نکلتی ہیں، ایک راہ سیاست کی ہے، ایک دنیا کی، ایک علم و حکمت کی، ایک دنیائے دل کی۔ ہر جاندار اور بے جان چیز کی خودی مختلف مراحل سے گزر کر کامل بنتی ہے۔**

ہلال کا کمال یہ ہے کہ وہ بدر منیر بن جائے۔ کلی کا کمال یہ ہے کہ وہ پھول بن کر فضائے چمن میں لہلہائے۔ ذرے کا کمال یہ ہے کہ وہ طواف کرتے کرتے خورشید تک پہنچ جائے اور قطرے کا کمال یہ ہے کہ وہ گوہر بن جائے۔ یعنی جب تک کوئی شے تکمیل کے تمام مراحل، تمام منازل طے نہ کر لے اس کی خودی نہاں (چھپی) رہتی ہے۔ انسان رب کائنات کی بہترین تخلیق ہے۔ اس لیے کہ انسان کی مختصر سی ہستی میں لامحدود امکانات مضمر ہیں۔ یہ علم کی کمند پھینک کر تماشائے صفات باری تعالیٰ کے

ساتھ ساتھ مشاہدہ ذات بھی کرسکتا ہے۔طُور پر برق تجلی کا رقص دیکھنے والا ایک انسان ہی تھا۔حضور خداوندی میں:

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی (سورۃ النجم، آیت نمبر 17)

ترجمہ:"اس (خاتم النبیین ﷺ) کی آنکھ نے نہ غلطی کی اور نہ بھٹکی۔"

مَاکَذَبَ الْفُوَادُمَارَایٰ (سورۃ النجم، آیت نمبر 11)

ترجمہ:''اس (خاتم النبیین ﷺ) کے دل نے اُس کے مشاہدے کی تصدیق کی''۔

یہ سند ایک بشر کو ہی ملی تھی۔

صفات اس آنکھ کا کام ہے جس میں علم سے نور پیدا ہوتا ہے اور مشاہدہ ذات، اس آنکھ کا جو صرف عشق سے کھلتی ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ایسی ذات سے عشق ہوسکتا ہے؟ جو نہ صرف آنکھوں سے پنہاں ہے بلکہ قوت متخیلہ بھی اس کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتی؟ ہاں ممکن ہے۔کیا ہم تاج محل کو دیکھ کر معمار کی تعریف نہیں کرتے؟ کیا ہم ایک عمدہ غزل پڑھ کر شاعر کو داد نہیں دیتے؟ کیا ہم ایک دل کش ریکارڈ سن کر واہ واہ نہیں کرتے۔کیا ہم غالب، رومی، حافظ، سینا، اور رازی جیسے باکمال افراد سے بن دیکھے محبت نہیں کرتے؟ کیا ہم شام صحرا کے سکوت میں غروب آفتاب کا مست ساز منظر اور ریت کے ٹیلے پر آہو کا بے پرواخرام دیکھ کر وجد میں نہیں آجاتے؟ جب بہار کی رنگینیوں سے دامن کوہسار، ارم بن جائے، جب نیلی نیلی فضاؤں میں اودی، اودی گھٹائیں لہرانے لگتی ہیں تو ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں، واہ، واہ، سبحانہ اللہ اِسی کا نام تسبیح ہے۔**اس تسبیح میں گہرائی آجائے تو عبادت بن جاتی ہے اور جب عبادت میں گہرائی آجائے یہی عبادت بالآخر عشق میں تبدیل ہوجاتی ہے۔**

خودی کو دو ہی چیزیں محکم بناتی ہیں علم اور عشق۔خودی نہ جسم کا نام ہے نہ روح کا بلکہ یہ ایک قوت ہے۔جو ضمیر ہستی میں نہاں ہے۔جو غور وفکر، آہ سحر گاہی اور گریہ نیم شبی سے عیاں ہوتی ہے۔تو یہی شاہین بھوک سے مرجاتا ہے لیکن مردار نہیں کھاتا۔یہ شاہین صفات مومن کا مظہر ہے اور خودی کا نگہبان ہے۔تو انسان کی خود شناسی نے پرندوں کو بڑی آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔اب شاہین کے بعد ہم گدھ یا کرگس کو دیکھتے ہیں۔آج کے ادب میں گدھ ایک عظیم استعارہ اور علامت بن کے ظاہر ہوا ہے۔

ایک ڈرامہ میں ایک منظر دکھایا گیا ایک امیر آدمی مر رہا ہے اور اس کے رشتہ دار اس کے پاس خاموش بیٹھے ہیں۔کٹ کر کے دوسرا منظر پیش کیا گیا۔ایک ویرانے میں ایک گھوڑا مر رہا ہے۔اس پر گدھ منڈلا رہے ہیں۔اب گدھ کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔گدھ کی بلند پروازی مردار کی تلاش میں ہے۔جن درختوں پر دن کے وقت چمگادڑ الٹے لٹکتے ہیں انہی درختوں پر رات کو گدھوں کا بسیرا ہوتا ہے۔یہ تعلق اور یہ تقرب بھی بڑا بامعنی ہے۔گدھ کی مردار خوری فضا کو آلودگی اور تعفن سے بھی بچاتی ہے۔بہر حال انسانوں کی دنیا میں کرگس (گدھ) صفت لوگ موجود رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کا کرگسی عمل بھی جاری رہتا ہے۔

کبوتر اور فاختہ امن کے نشانات ہیں یہ صلح اور امن کے استعارے ہیں۔طوطا ایک ایسا پرندہ ہے جس پر بڑے بڑے ادیبوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔مولانا روم نے طوطے کی ایک کہانی لکھی ہے کہ'' ایک سوداگر کے پاس ایک بولنے والا طوطا تھا جو اس نے پنجرے میں بند کر کے رکھا ہوا تھا۔سوداگر ایک مرتبہ سفر پر جانے لگا تو اس نے طوطے سے کہا"اے طوطے تیری کوئی خواہش ہے تو بتا میں سفر پر جارہا ہوں"۔طوطے نے کہا"ہاں جنگل میں رہنے والے میرے بھائیوں تک یہ پیغام پہنچانا کہ''آزاد فضاؤں میں رہنے والو اپنے غریب قیدی کا سلام قبول کرو'' سوداگر نے یہ پیغام ایک گروطوطے کو دیا۔گروطوطا یہ سن کر مرگیا اور اس کے ساتھ ہی تمام طوطے گر کر مر گئے۔سوداگر بہت اداس ہوا اور واپس آکر یہ واقعہ اپنے طوطے کو سنایا۔یہ سننا تھا کہ طوطا بھی فوراً پنجرے میں گرا اور مرگیا۔سوداگر نے اسے پنجرے سے نکال کر پھینک دیا۔وہ طوطا اڑا اور دیوار پر بیٹھ کر بولا۔**اے سوداگر میرے گرو نے میری فریاد پر مجھے رہائی کا یہی طریقہ بتایا ہے کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ۔آزاد ہوجاؤ گے۔''پس یہ وہ راز ہے جو مرشد اپنے مرید کو دیتا ہے۔**بہر حال طوطا علم کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ایک معمولی سا''کوا'' بھی لٹریچر کا حصہ بن گیا ہے''کاں'' بنیرے پر بولتا ہے تو پھر پردیسی گھر آجاتے ہیں۔قمری، تیتر اور چکور آواز حق کے استعارے ہیں۔ اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے۔لوگ ان آوازوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔مور نفس کا وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے رنگ پر ہی مست ہوجاتا ہے۔ظاہر پرست انسان مور ہے۔انا کا مارا ہوا اسی طرح جانوروں کو لیں۔''شیر'' اللہ کا شیر یعنی اسد اللہ۔ایک مقام ہے، ایک صفت ہے، ایک انداز ہے، شیر ربّانی ایک لقب ہے، ایک روحانی مقام ہے، ایک صفت ہے، ایک انداز ہے، شیر خواب میں نظر آئے تو روحانی فیض کی دلیل ہے۔(جبکہ نفس میں وہ صفات بھی ہوں) شیر بے باکی اور جرات کا مظہر

ہے۔ جہاں شیر دلیر ہے۔ وہاں گیدڑ بزدل، لومڑی مکار، سانپ چھپا دشمن ہے۔ وفا کے باب میں کتے اور گھوڑے کا ذکر آتا ہے۔ ایک کتا اگر دوسرے کتے کا بیری نہ ہوتا تو کبھی نجس نہ ہوتا۔ گھوڑے کو لٹریچر میں بڑا حصہ ملا ہے۔ **مولانا غالب نے اپنے دو اشعار میں گھوڑے کو زندگی اور موت سے تعبیر کیا ہے۔ زندگی کا سرکش گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ انسان سوار تو ہے لیکن بے بسی کا یہ عالم ہے کہ نہ ہاتھ باگ پر ہے اور نہ پاؤں رکاب میں۔**

غرض یہ ہے کہ ہر جانور، ہر پرندہ، ہر شے انسان کے لیے معنی رکھتی ہے۔ انسان غور کرے تو یہ کائنات علم کے وسیع خزانوں سے مالا مال ہے۔ اس کو اپنا پرتو اور اپنے خالق کا جلوہ اسی کائنات میں نظر آئے گا۔ یوسفؑ کے خواب میں آنے والے گیارہ ستارے، چاند اور سورج ان کے اپنے بھائی اور ماں باپ تھے۔ سبحان اللہ۔ یہ علم اس نے خود عطا کیا ہے۔ جس نے انسان کو شاہکار تخلیق بنایا۔ انسان کو شرف بخشنے والے نے انسان کو علم عطا کیا۔ کائنات کا علم، کائنات کی اشیاء کا علم، کائنات کی زندگی اور کائنات کے حسن کا علم۔ یہ کائنات ایک آئینہ ہے۔ اس میں ہر طرف انسان کی اپنی صفات پھیلی ہوئی ہیں۔ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ یہی کائنات انسان کا باطن ہے۔ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ سب حقیقت ہی حقیقت ہے۔ معنی در معنی، استعارہ در استعارہ، علامت در علامت۔

انسان کی کائنات حسن، حسن کائنات کا خوبصورت عکس ہے۔ ''چاند'' محبوب ہے اور چاندنی محبوب کی یاد۔ چاند دور ہو تو چاندنی پاس ہوتی ہے۔ چاند پاس ہو تو چاندنی ختم ہو جاتی ہے۔ پھول دل میں بسنے والا دوست ہے اور کانٹا آنکھوں میں کھٹکنے والا رقیب۔ غرض یہ کہ لامحدود جلوہ۔ کائنات میں موجود ہے۔ انسان کی تلاش کے لیے اور تلاش ذات کے لیے اسی کائنات میں ایک مخفی اور حسین کائنات موجود ہے۔ معنی کی کائنات جلوؤں کی کائنات انسان غور تو کرے۔

عیاں تھا جس کی نگاہوں پہ عالم اسرار
اسے خبر نہ ہوئی کیا ہوا پس دیوار؟
میں کتنی صدیوں سے اس انتظار میں گم ہوں
الٰہی اب تو مسیحا کو آسماں سے اتار

ہم نے تفکر و تدبر چھوڑ دیا ہے۔ ہم اپنے علم پر نازاں ہیں۔ ہم اپنی آواز پر مسحور ہیں۔ اپنے افکار پر مست ہیں، اپنے لیے جو پسند کرتے ہیں دوسروں کے لیے وہ پسند نہیں کرتے۔ **خوش نصیب ہیں کائنات پر تفکر کرنے والے۔ خوش نصیبی کسی شے کا نام نہیں ہے۔ خوش نصیبی ایک متوازن زندگی کا نام ہے۔ نہ زندگی سے فرار نہ بندگی سے فرار۔ خوش نصیب انسان حق کے قریب رہتا ہے۔**

مالک کا حکم نہ مانیں تو بڑے حکم ماننے پڑتے ہیں۔ اس کی اطاعت نہ کرنے سے بڑی بڑی اطاعتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اس کو سجدہ نہ کر کے ہم اپنی آرزوں کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں ایک ذات کی غلامی سے ہزار غلاموں سے نجات مل جاتی ہے۔ انسان اگر غور کرے تو فنا کے دیس میں بقا کا مسافر ہے۔ اس کا دل جلوۂ پرنور سے معمور ہے۔ وہ اپنے آپ پر راضی، اپنی زندگی پر راضی، اپنے حال پر راضی، اپنے حالات پر راضی، اپنے خیالات پر راضی، اپنے اللہ سے راضی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی۔ سلام ہو غور فکر کرنے والوں کو، سلام ہو کائنات پر نظر کرنے والوں کو۔ سلام ہو خوش نصیبوں کی خدمت میں۔

انسان سوچے تو سہی، غور تو کرے، یہ دریا رواں کیسے ہیں؟ چشمے کیسے ابل پڑتے ہیں؟ سمندر ساکن کیوں ہیں؟ آنکھ بنانے والا خود کتنا بصیر ہوگا؟ کان بنانے والا خود کیسی سماعت رکھتا ہوگا؟۔ میں حیران ہوں کہ کسی درخت کا کوئی پتہ کسی پتے سے نہیں ملتا۔ ہاتھی کو پیدا فرمانے والا، چیونٹی کو کیسے تخلیق کرتا ہے؟ دماغ بنانے والا کیا عقل رکھتا ہوگا؟ ایک لامحدود عقل جس کا تصور بھی محال ہے؟

اے خداوند جہاں ! اے خالق لیل و نہار
ہو نہیں سکتی تیری حمد و ثنا ہے بے شمار
تو نے بخشی ہے فلک کے چاند تاروں کو چمک
تیری قدرت سے گل و غنچہ پہ آتا ہے نکھار
تو دو عالم کا حقیقی مالک و مختار ہے
ذرے ذرے پر تیرا چلتا ہے حکم و اقتدار

فضلِ الٰہی

علم کا مطلب جاننا۔ہم معلوم کوعلم کہتے ہیں۔جتنا معلوم زیادہ ہوتا جائے گا اتنا ہی احساس لاعلمی زیادہ ہوگا۔اس لئے جاننے والے اکثر یہی کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔کائنات میں اتنے علوم ہیں کہ ان کی اقسام گنوانا دشوار اور ناممکن ہے۔کچھ چیزوں کے بارے میں کچھ جاننا ممکن ہے،بہت سی چیزوں کے بارے میں کچھ کچھ جاننا ممکن ہے،سب چیزوں کے بارے میں سب کچھ جاننا ناممکن ہے۔علم لائبریریوں سے دست بردار ہونے کا نام ہے۔لائبریریاں بلاشبہ معلومات کا خزانہ ہیں،کتابوں کا مطالعہ ایک اعلیٰ مصروفیت ہے۔لیکن کتاب زندگی نہیں ہے۔زندگی تو آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔زندگی سانس کی نازک ڈور ہے۔پل پل کٹتی جارہی ہے، زندگی اپنے گردوپیش کی حرکات واعمال کا نام ہے۔سکالرز زندگی کے میدان میں کمزور رہ جاتا ہے۔علم کتاب کا نام نہیں ہے۔کتاب حقیقت کا عکس تو ہے،حقیقت کا مشاہدہ کتاب سے باہر ہے۔

نظارہ اور مشاہدہ علم کا نہیں نظر کا محتاج ہوتا ہے۔بلکہ انداز نظر کا محتاج ہے۔زاویہ نظر بدل جائے تو منظر اور پس منظر سب بدل جاتے ہیں۔لیکن کتاب نہیں بدلتی۔کتاب کا نہ بدلنا اس کا حسن ہے اور زندگی کا بدلتے رہنا اس کا جمال ہے۔کتاب زندگی کے خدوخال واضح کرتی ہے۔مقدس کتابیں نازل فرمانے والے نے یہ زندگی نازل فرمائی ہے۔حسن بھی نازل فرمایا،بینائی بھی عطا فرمائی،نظاروں کی راعنائی بھی عطا فرمائی۔**کتاب قانون ہے پہچان کا،لیکن پہچان کتاب کی نہیں کتاب بھیجنے والے کی درکار ہے۔**کتاب فطرت کا مطالعہ ہے۔

علم نصیب سے ملتا ہے،یہ فضل الٰہی ہے۔یہ غوروفکر سے ملتا ہے۔ہمیں بچپن سے تعلیم دی جاتی ہے کہ محنت کرو،بڑے آدمی بنو گے اس تعلیم کی وجہ سے انسان کوشش کرتا ہے،اپنے قد سے بڑا ہونے کی،اور اس آرزو میں لوگ ہلاک ہوتے ہیں،کوشش اور مجاہدہ بہت کچھ دے سکتا ہے لیکن ایک گدھے کو کوئی مجاہدہ بھی گھوڑا نہیں بنا سکتا۔

یہ زندگی اپنی حدود میں مقید ہے،ہر انسان اپنے دائرہ عمل میں رہن رکھ دیا گیا ہے،انسان پابند ہے،آرزو پابند ہے،اس لئے محدود انسان کا لامحدود خواہشات کے لئے عمل کہیں نہ کہیں راستے میں دم توڑ دیتا ہے اور انسان عمل کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں کرسکتا۔غور کرنے والی بات ہے کہ ہم ایک نئے دور میں پیدا ہوئے ہیں اور اگر ہمارا عمل تقلید کے علاوہ نہ ہو تو ہم پرانے دور کے نتائج کیسے حاصل کرسکتے ہیں؟اور پرانے دور کے نتائج کے حصول کی آرزو وہی کوتاہی فکر ہے اگر فکریں صحیح نہ ہوئیں تو عمل کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟۔جہاں اللہ کریم کا حکم ہے کہ انسان اپنی سعی سے ہی کچھ حاصل کرتا ہے،وہاں اس کے احکام کے اور رخ بھی ہیں،عمل کا جذبہ بھی اس کی عطا ہے۔اور پھر عمل کے راہ میں کتنے حادثات آتے ہیں،کتنے ہی واقعات ہیں،ہمارا عمل درست بھی ہو تو ممکن ہے کہ کسی اور کج رو کا عمل ہمارے عمل کے نتیجے کو ختم کردے،ہم تنہا زندگی بسر نہیں کر رہے،ہمارے ساتھ ایک زمانہ چل رہا ہے،ہر آدمی عمل کر رہا ہے،ہمارے عمل کی راہ میں دوسروں کے اعمال حائل ہوتے ہیں،اور پھر نتیجہ وہی رہتا ہے کہ ہم نتیجے سے محروم ہو جاتے ہیں۔**فطرت کو منظور نہیں کہ سب لوگ سقراط ہی بنتے جائیں اس لیے عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے۔جسے نصیب یا تقدیر کہتے ہیں،**ایک جیسا عمل کرنے والے الگ الگ نصیب لے کر آتے ہیں،یہاں بے عملی مقصود نہیں۔صرف یہ وضاحت مراد ہے کہ اپنی حدود کو پہچانے بغیر عمل میں داخل ہونا ہلاکت کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔

انسان ہزار محنت کرے وجدان (تیسری آنکھ) کے بغیر شاعر نہیں ہوسکتا اور جس کو وجدان عطا ہوا وہ محنت کے بغیر ہی شاعر ہے۔سورج کے پاس علم نہیں روشنی نصیب ہے،علم تو غوروفکر سے ملتا ہے،تعلق سے ملتا ہے،اور تقرب سے ملتا ہے،ہر کتاب کا علم فیض نظر تک نہیں پہنچا سکتا۔**یہ کمال صرف اور صرف کتاب الٰہی کو حاصل ہے کہ اس میں ایک معمولی سا کھلنے والا پھول بھی علم دے سکتا ہے۔**شب تاریک کی گہرائیوں میں آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو علم کے خزانے عطا کرتا ہے،اللہ تعالیٰ کا فضل ہی شرح صدر عطا فرماتا ہے۔ہر عارف عالم ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر عالم عارف بھی ہو۔بغیر تذکیہ نفس کے کتاب کا علم خطرے سے خالی نہیں،علم کوشش سے نہیں مقدر سے ملتا ہے۔علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کوئی عطا کرنے والا نہ ہو۔علم نگاہ سے ملتا ہے،علم عطا سے ملتا ہے۔ اس کا مدفن کتاب ہے۔تعلیم بھی علم نہیں۔تعلیم کا تعلق ڈگریوں سے ہے۔علم ڈگریوں اور یونیورسٹیوں سے بے نیاز ہے۔تعلیم ضروری ہے نوکری کے لئے۔نوکری ضروری ہے معاش کے لئے،رزق کے لئے،سماجی مرتبے حاصل کرنے کے لئے۔لیکن علم نوکری نہیں،علم حکومت نہیں،علم روٹی نہیں،علم حکومت نہیں،علم **پہچان ہے،علم عرفان ہے،ضرورت کا علم اور چیز ہے،اور علم کی ضرورت اور چیز۔**

آج کی تعلیم،آج ہی نتیجہ دے رہی ہے،طالب علموں کے حالات تعلیم کے ناقص ہونے کا ثبوت ہیں۔آج کا طالب علم،علم سے بیزار ہے۔کہاں گئے وہ استاد جو طالب علموں کو فیض نگاہ سے آداب فرزندی سکھایا کرتے تھے۔آج کے طالب علم سے آج کی تعلیم نے علم کی محبت چھین لی ہے۔ابھی وقت ہے بدعلمی سے بے

علمی ہی بہتر ہے۔ **پیغمبروں کے پاس تعلیم نہیں ہوتی، علم ہوتا ہے بلکہ مکمل علم ہوتا ہے۔ زمانے کے معلم کتب سے نہیں رحمان سے علم حاصل کرتے ہیں۔** آج ہمیں اُسی علم کی ضرورت ہے۔ وہی ہماری اساس ہے اور وہی ہماری عاقبت۔ ہمیں زندگی کا علم چاہیے اور مابعد کا علم بھی چاہیے کہ **چند روزہ زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور پھر اسے چھوڑنا بھی ہے، سمیٹنا بھی ہے، جانا بھی ہے۔**

آج کے تعلیمی ادارے محمد بن قاسم جیسے لوگ پیدا نہیں کر رہے۔ یہی تعلیم کا المیہ ہے کہ آج کی تعلیم صرف اور صرف، تلاش روزگار کے لئے ہے۔ تقرب پروردگار کے لیے نہیں۔ ہمارا عمل گناہ اور ثواب مرتب کرتا ہے، ہمارا عمل ہمیں آسانیاں بھی عطا کرتا ہے اور دشواریاں بھی، گلاب، گلاب ہے، عمل کرے یا نہ کرے، کانٹا کانٹا رہے گا چاہے جتنی محنت کرے۔ عظیم انسان فطرت کا عمل ہیں ان کا اپنا عمل انہیں عظیم نہیں بناتا۔ پیغمبر بننے کا کوئی عمل نہیں، یہ منصب عطا ہے، امام عمل سے نہیں نصیب سے ہے، ارشادِ ربانی ہے ''ہم جسے چاہتے ہیں مملکت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں معزول و محروم کر دیتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمل بہانہ ہے، مقدر اٹل ہے۔ عقل اور نصیب نہ ہوں تو عمل جہالت ہے۔

ریت میں ہل چلایا جائے، بیج بویا جائے اور اسے پانی کے بجائے چاہے خون دل سے کیوں نہ سینچا جائے وہاں کچھ نہ اُگے گا۔ عمل ہے لیکن نتیجہ نہیں ہے۔ عمل سے زندگی میں جنت اور جہنم حاصل ہونے کا دعویٰ ہے لیکن ہر عمل زندگی حاصل نہیں کرتا۔ ہم نبی خاتم النبیین ﷺ امیؐ کی امت میں سے ہیں، ہمیں بے جہت اور بے سمت تعلیم کہاں لے جائے گی؟ صرف مغربی تعلیم اسلامی نتائج کیسے پیدا کرے گی؟ اور اسلام کی تعلیم بھی اسلام نہیں۔ اسلام عمل ہے۔ اسلام بتانے والی بات نہیں، کرنے والا کام ہے۔ **بہر حال علم اس کی عطا ہے، جس نے زندگی عطا فرمائی۔ عطا کو حاصل کرنے کے لئے دعا کے علاوہ کوئی عمل نہیں۔** معلومات اور انفارمیشن کا علم آزمائش میں پورا نہیں اترے گا۔ کشتی کے مسافروں کو ''صرف ونحو'' کی ضرورت نہیں انہیں تیرنا بھی آنا چاہیے۔

علم کو نور بھی کہا گیا ہے اور علم کو حجاب اکبر بھی کہا گیا ہے۔ علم نور اس لیے ہے کہ علم پہچان کا ذریعہ ہے، آگہی اور ادراک کا باعث ہے۔ اسما و اشیا کا شعور ہے۔ ہمیں علم کی پہچان نہیں، مالک کی پہچان درکار ہے، خالق کو جاننا ہے۔ اپنے رزاق سے باخبر ہونا ہے۔ کائنات کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونا ہے۔ حیات و مرگ کے رموز دریافت کرنے ہیں، وہ علم جو ہمیں چیزوں سے آگاہ کرے نورانی ہے۔ نورانی علم صرف یہ نہیں بتاتا کہ سبزہ کہاں سے آتا ہے؟ بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون پالتا ہے؟ نورانی علم نشان منزل کا علم ہے۔ تزکیہ و حکمت کا علم ہے، الجھنوں سے نجات کا علم ہے۔ کیف وجدان کا علم ہے سراسر رحمان کا علم ہے۔ جس علم سے غرور پیدا ہوا سے حجاب کہا گیا ہے۔ جو علم نگاہ سے محروم ہو وہ حجاب ہے، جو تعلق سے گریزاں ہو وہ علم حجاب ہے، جو اپنی انا کے خول سے باہر نہ نکلے وہ علم حجاب ہے۔ ابوجہل کے پاس علم تھا لیکن انا کا خول بے نگاہی کا سبب تھا۔ علم ہو اور نگاہ نہ ہو تو علم حجاب ہے، اگر نظر نہ ہو تو علم جہالت سے بدتر ہے۔

انسان معلوم پر نازاں ہوتا ہے اور اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ ہمہ وقت نامعلوم کی زد میں ہے، وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کی دولت بڑھ رہی ہے اور بھول جاتا ہے کہ اس کی عمر گھٹتی جا رہی ہے، ایسے علم سے تو بہتر جو صاحب علم کو نفع نہ دے۔ سال ہا سال کی عبادت ابلیس کو کیا دے سکی؟ **ظلمات سے نور میں داخل ہونے کا عمل خالق کے پاس ہے، ہمارا اپنا عمل ہمیں معزز نہیں کرتا** اس کا فضل ہمیں عزت بخشتا ہے۔ نیکی کا غرور محرومیوں کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ زندگی کی اساس عمل نہیں فضل ہے۔ ہم لوگ فوری نتائج پر غور کرتے ہیں اور انتہائی نتائج سے بے خبر رہتے ہیں۔ **اصل عمل اس کے فضل کے حصول کا نام ہے** اور اس کا فضل کسی فارمولے سے حاصل نہیں ہوتا۔ نیت کی اصلاح ہو تو عمل میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے، اور عمل کا خلوص ہی اصل مطلوب ہے، ہمارا نظام حیات، نظام تعلیم، اور نظام فکر، ہمیں صرف عمل میں مصروف رکھتا ہے، عاقبت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ نتیجے عارضی ہیں، مرتبے آسائشیں، شہرتیں اور اختیارات گمراہی کے مقامات بھی ہو سکتے ہیں۔

اُس عمل کو تلاش کیا جائے جو ہمیں بھی پسند ہو اور ہمارے مالک کو بھی، ورنہ نتیجہ ہلاکت اور گمراہی ہے۔ **اِحسن عمل اصلاح باطن کے ساتھ حُسن حیات کا حصول ہے۔** زندگی میں راہیں بدلنے کا وقت نہیں۔ پہلے ہی سے صحیح راستے کا انتخاب کیا جائے اور اس پر صحت عمل سے گامزن ہو کر اُس کے فضل کا آسرا تلاش کیا جائے۔ یہی منشا ہے اس حکم کا کہ ''اے انسان تو محنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اپنے رب کے راستوں کی طرف محنت کر'' کہیں ایسا نہ ہو کہ ناعاقبت اندیشی میں ہم غلط راستے (ظلمت کے راستے) کی طرف نکل جائیں۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ علم اگر خود آگہی کے قریب کرے تو نور ہے ورنہ حجاب ہے، زیادہ جاننے کا غرور اگر نہ جاننے کی عاجزی میں بدل جائے تو حجاب اٹھ جاتا ہے۔ فنا کا علم حجاب ہے، بقا کا علم نور ہے، اگر علم کا مدعا صرف خوشنودی اہل خانہ اور خوشنودی خلق ہے تو حجاب ہے **اور اگر علم کا منشا رضائے حق ہے تو نور ہے۔ بلکہ نورٌ علیٰ نور'' ہے۔ نور**

علم ہی یہ سیکھاتا ہے کہ نجات عمل پر نہیں فضل سے منسلک ہے۔

تمثیل: بچے کے ہاتھ نے اپنی ماں کے پلو کو تھام رکھا تھا۔ چھوٹا سا ہاتھ، کمزور سا ہاتھ، معصوم سا ہاتھ، یہ بچہ سال بھر کا بھی نہیں ہوگا، باپ آگے بیٹھا موٹر بائیک چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ماں اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی، اس نے ایک ہاتھ سے موٹر بائیک کی سیٹ کو اور دوسرے سے بچے کو پکڑ رکھا تھا، اس پورے منظر میں جو بات قابل غور ہے وہ ہے وہ چھوٹا سا ہاتھ جس نے ماں کے پلو کو پکڑ رکھا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اس بچے کی ماں اپنے ہاتھ کی گرفت برقرار نہ رکھ سکے تو کیا یہ چھوٹا سا ہاتھ، یہ معصوم سی مٹھی، اتنی طاقتور ہے کہ خود کو گرنے سے روک سکے؟ ایسا ناممکن تھا۔ ہم گرمی کے روزوں کی مشقت اور اس کی سختی کے بارے میں پریشان ہوتے رہتے ہیں، مگر اس منظر کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ **جہنم کے گڑھے میں گرنے سے اگر کوئی ہمیں بچا سکتا ہے تو وہ ہمارے نماز، روزے کا عمل نہیں وہ ہماری کمزور عبادت کا ہاتھ نہیں بلکہ پروردگار کے فضل کا ہاتھ ہوگا۔** جنت کی منزل تک ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی، اگر مالک دو جہاں کا شفقت بھرا ہاتھ ہمیں سنبھالے ہوئے نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ساری محنت، علم، ہمارا سارا عمل، ہماری ساری مذہبیت اور ہماری ساری عبادت بھی دراصل خدا کی دی ہوئی توفیق کی مرہون منت ہیں۔ مالک نے ہماری ساری دین داری کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ سورۃ محمد آیت نمبر 37 ترجمہ: ''اگر وہ تم سے تمہارا مال مانگے اور زور دے کر مانگے تو تم اس سے بخیلی کرنے لگو گے اور وہ تمہارے کینے ظاہر کر دے گا''۔

باری تعالیٰ ہم دنیاداروں نے اپنی تئیں جو عبادات کیں ہیں اور جو مشقت اٹھائی ہے اس سے تیرا قرب مطلوب تھا، مالک لیکن یہ مشقت اس بچے کے کمزور ہاتھ سے زیادہ نہیں، جس نے اپنی ماں کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ ماں کے ہاتھ کو بچے کا سہارا بنانے والے اپنے طاقت ور ہاتھ کو آگے بڑھا دے، وگرنہ دنیا کی کوئی طاقت ان بندوں کو جہنم سے نجات اور جنت کی کامیابی کا حقدار نہیں بنا سکتی۔ ہمارے علم کے ساتھ ایک سوچ، مثبت سوچ کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تمثیل: دو تہائی شب گزر چکی ہے، ایک شخص تہجد کی نماز پڑھ رہا ہے، نماز کے بیچ میں اسے خیال آتا ہے کہ ماں کو دیکھ لوں ٹھنڈ بڑھ رہی ہے، ماں کی چادر اٹھاتے ہوئے ماں کی آنکھ کھل جاتی ہیں۔ ''ماں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے'' ہاں بیٹے رات دوائی نہیں کھائی تھی۔ اس لیے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ بیٹا بڑے ہی شفقت سے ماں کو دوائی کھلاتا ہے اور ماں کے پاؤں دبانے بیٹھ جاتا ہے۔ ماں کی آنکھ لگ جاتی ہے تو بیٹا اٹھتا ہے۔ احتیاط سے اٹھنے میں اپنا ہی نیا چشمہ اپنے پیر کے نیچے آ کر ٹوٹ جاتا ہے۔ دل نے کہا یہ تو بہت برا ہوا، تو تو اعلیٰ ترین عبادت تہجد میں مشغول تھا، پھر ماں کی خدمت وہ بھی ان کے تکلیف کے لمحات میں، لیکن آپ کو اس کا کچھ اچھا بدلہ نہیں ملا، لمحہ بھر یہ خیال آیا، لیکن پھر دل ہی دل میں یہ احساس آیا کہ چشمے'' کا ٹوٹ جانا نقصان نہیں بلکہ یہ تو انعام ہے، نقد انعام۔ بظاہر تیرا چشمہ ٹوٹا ہے لیکن اس کے بدلے میں تجھے وہ نظر عطا کر دی گئی ہے جو شب کی سیاہی میں تجھے جنت کا نظارا کرائے گی''۔ صرف یہی نہیں ہر حادثہ ایک نیا پیغام لے کر آتا ہے، اگر سوچ مثبت ہو تو لیکن اس وقت اگر انسان منفی انداز فکر کا شکار ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے بدظن ہو جائے تو اپنی ساری محنت ضائع کر بیٹھتا ہے اور دنیا اور آخرت کی نہ جانے کتنی بھلائیوں سے محروم ہو جاتا ہے، اس لیے دنیا میں جتنا اہم علم اور عمل ہے اس سے کہیں زیادہ ہمارے سوچنے کا انداز ہے۔ زندگی کا ہر اطمینان اور ہر خوشی مثبت انداز فکر میں پوشیدہ ہے۔ جس شخص کے پاس مثبت سوچ کا سرمایا نہیں اس کا کوئی عمل اسے خوشی اور کامیابی نہیں دے سکتا۔ ہر انسان مصروف عمل ہے۔ عمل ہی شاید زندگی ہے، حکم ہے کہ انسان کو محنت کرنے والا بنایا گیا ہے۔ سرگرم عمل رہنے والا انسان اپنے عمل سے اپنی زندگی بہتر بنانے کا خواہاں رہتا ہے۔ ایک عمل کرنے والا انسان کامیابی کی خاطر عمل کرتا ہے۔ دنیا میں مختلف قسم کے عمل ہیں اس لیے مختلف قسم کی کامیابیاں ہیں۔ برے مقاصد کے لیے عمل اگر کامیاب بھی ہو جائے تو بھی ناکام ہے اس کے برعکس اچھے مقاصد کے لئے عمل اگر ناکام بھی ہو جائے تو بھی کامیاب ہے، کامیابی کا حصول اتنا اہم نہیں جتنا عمل کا انتخاب ہے۔ بہترین عمل رضائے الٰہی کا حصول ہے اور یہ فضل الٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔

****

خشیت الٰہی

خشیت الٰہی جزایمان ہے اور ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔خوف الٰہی کا ثمرہ دوسری نیکیوں سے زیادہ ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: (سورہ رحمن، آیت نمبر 46)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ

ترجمہ: ''اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں''۔

خوف ایک تازیانہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو علم وعمل کی طرف ہانکتا ہے تاکہ ان دونوں سے وہ مرتبہ قرب الٰہی کو پا سکے۔

حکمت کی اصل خوف الٰہی ہے-

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں "جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو یہ خوف اس کو ہر طرح کی بہتری سوجھا دیتا ہے"۔

حضرت شبلیؒ کا قول ہے "جب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں تو میرے سامنے ایک دروازہ علم وحکمت کا ایسا کھل جاتا ہے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا"۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا قول ہے کہ ''جب مومن کوئی خطا کرتا ہے تو اس کے پیچھے دو نیکیاں ہوتی ہیں۔اول عذاب کا خوف دوئم معاف ہونے کی امید پھر وہ برائی ان دونوں نیکیوں خوف اور امید کے درمیان آجاتی ہے۔جیسے دو شیروں کے درمیان لومڑی۔''

یعنی انسان (مومن) جب خطا کرتا ہے تو خوف سے کانپنے لگتا ہے اور پھر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اچھی امید کے ساتھ توبہ کرتا ہے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کبھی کسی کے توبہ کے لیے پھیلائے ہوئے ہاتھ خالی نہیں لوٹاتا اور اس طرح خطا کہاں باقی رہی؟

ایک حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

''قسم ہے اپنی عزت اور اپنے جلال کی میں کبھی اپنے بندوں پر دو خوف جمع نہیں کروں گا۔نہ دو اَمن جمع کروں گا۔پس اگر دنیا میں مجھ سے کوئی خوف کرے گا تو قیامت میں اسے بے خوفی دوں گا''۔(ابن حبان، ترغیب)

ایک نوجوان پر نیا نیا روحانیت کا بھوت سوار ہوا۔اور فکر لاحق ہوئی کہ کسی بزرگ کو دیکھوں تو ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جاؤں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ ''اس راہ میں بغیر مرشد کے سفر ناممکن ہے'' اسے ایک بزرگ کا معلوم ہوا کہ وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔معرفت کے پیکر ہیں روحانیت کے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اس نوجوان نے دل میں خیال کیا کہ ان کے پاس جانا چاہیے۔بحر حال وہ نوجوان ان بزرگ کے گھر پہنچ گیا اندر کچھ شور سا سنائی دیا۔نوجوان نے دروازے میں سے اندر نگاہ کی تو دیکھا کہ تمام ٹھاٹھ دنیاداری کے موجود ہیں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔،اپنے مسائل بھی دریافت کرتے ہیں، ہنستے بولتے اور ایک دوسرے سے مزاح بھی کر رہے ہیں اور وہ بزرگ بھی سب کے درمیان سب کے جوابات بھی دیتے ہیں اور لوگوں کے مزاح میں بھی شریک ہیں۔اس نے دروازہ کھولا اور اندر دیکھا بزرگ کی نگاہ اس پر پڑی۔اس نوجوان کے دل میں خیال آیا "یہ تو خود دنیادار ہیں یہ مجھے کیا سکھائیں گے"؟ بزرگ کو اس نوجوان کے دل کا وسوسہ منکشف ہو گیا۔اب چونکہ نوجوان کی نگاہ بزرگ پر پڑ چکی تھی۔اس نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔بزرگ نے جواب دیا "نہیں ابھی باہر کھڑے ہو جاؤ۔جب میں بلاؤں گا اس وقت اندر آنا"۔بزرگ کے پاس لوگ آتے اور جاتے رہے۔بزرگ وقت پر نماز کے لیے اٹھتے اور نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے۔اس دوران ملازم نے اور باہر سے آنے والے لوگوں نے کئی مرتبہ بزرگ سے کہا "حضرت ایک نوجوان کافی دیر سے کھڑا آپ کے بلانے کا منتظر ہے"۔بزرگ نے فرمایا ''کھڑا رہنے دو''۔عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد بزرگ نے نوجوان کو بلایا۔آنے کا مقصد معلوم کیا اور فرمایا "ابھی میرے ساتھ میرے گھر چلو۔صبح اس موضوع پر بات کریں گے"۔اپنے گھر لا کر بزرگ نے نوجوان کی خوب خاطر مدارت کی اور صبح دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے خدا حافظ کہا، دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد بزرگ نے نوجوان کو بلایا اور کہا "یہ ایک کٹورا دودھ کا ہے۔یہ دودھ سے لبریز ہے اس کو اپنے ہاتھ پر رکھو اور بستی میں آج ناچ ورنگ اور مختلف تماشوں کا دن ہے، میلہ ہے تم اس کٹورے کو ہاتھ میں رکھنا اور دیکھنا دودھ گرنے نہ پائے۔اور یہ دو سپاہی تمہارے ساتھ جائیں گے اگر دودھ پیالے سے گرے گا تو یہ تمہارے سر کو اڑا دیں گے۔یہ کہتے ہوئے بزرگ نے دودھ کا پیالہ نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا اور سپاہیوں کو ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔اس کے ساتھ ہی نوجوان کو بھی جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو ناچ رنگ خوب دیکھنا اور یہ خیال بھی رکھنا کہ دودھ پیالے سے نہ چھلکنے پائے"۔نوجوان نے بڑی احتیاط سے پیالے کو پکڑا اور ڈرتے ڈرتے دودھ کی طرف نظر جما کر بزرگ کی چوکھٹ سے باہر قدم رکھا۔اب سپاہی ساتھ ساتھ تھے اور نوجوان پوری

طرح دودھ کی طرف متوجہ۔ پوری بستی کا چکر لگانے کے بعد بزرگ کے پاس آئے تو بزرگ نے پوچھا" کیوں نوجوان؟ آج بستی میں جو میلہ ہے اس کو کیسا پایا؟ کیا رنگ ڈھنگ تھا"؟ نوجوان نے جواب دیا" حضرت میں نے کہاں میلے کا رنگ ڈھنگ دیکھا ہے؟ میری نگاہ اور توجہ تو بس دودھ پر تھی اور ہر دم یہی خوف تھا کہ اب دودھ چھلکا اور اب سپاہیوں نے میرا سر تن سے جدا کیا"۔ بزرگ نے جوان سے کہا" یہی حال ہمارا ہے۔ جس طرح تمہارا یہ ایک دن گزرا ہے ہمارے ماہ وسال ایسے ہی گزرتے ہیں۔ یہ دنیا کے نظارے ہماری نظر میں کچھ نہیں ہیں۔ تم نے ہماری ظاہری حالت سے ہمارے بارے میں کیا قیاس کیا تھا یہ تم جانتے ہو؟ لیکن ہمارا بھی یہی حال ہے کہ تن کٹورا (پیالہ) من دودھ اور سپاہی ملک الموت ہے۔ ہر دم یہی خوف لگا رہتا ہے کہ ایسے نہ ہو کہ دودھ گر جائے (یعنی دل یاد الٰہی سے چوک جائے) اور اس حالت میں (سپاہی) ملک الموت آ پہنچے اور مجھے موت آ جائے''۔ تب نوجوان نے اپنے خیال میں آنے والے اندیشے پر بزرگ سے معافی چاہی اور بزرگ کی شاگردی اختیار فرمائی۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک سورہ بقرہ، آیت نمبر 40 میں فرماتا ہے۔

ترجمہ:''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو''۔

سورہ الحج، آیت نمبر 4 میں فرمان الٰہی ہے۔

ترجمہ: ''اے لوگو ڈرو اپنے رب کی ناراضگی سے۔ بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے۔ جس روز تم اس (کی ہولناکیوں کو) دیکھو گے تو غافل ہو جائے گی اس روز ہر دودھ پلانے والی ماں اپنے لخت جگر سے اور گرا دے گی ہر حاملہ اپنے حمل کو اور تجھے نظر آئیں گے لوگ جیسے نشے میں مست ہیں۔ حالانکہ وہ نشہ میں مست نہیں ہوں گے بلکہ عذاب الٰہی بڑا سخت ہوگا"۔ (یہ اس کی ہیبت سے حواس باختہ ہوں گے) سورہ الطور، آیت نمبر 28-25 اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

ترجمہ:" (وہ لوگ) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے ہم بھی اس سے پہلے اپنے اہل خانہ میں (اپنے انجام کے بارے میں ڈرتے رہتے تھے)۔ سہمے رہتے تھے۔ سو بڑا احسان فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر کہ بچا لیا ہمیں گرم لُو کے عذاب سے۔ بے شک ہم پہلے بھی (دنیا میں) اس سے (اللہ سے) دعا کیا کرتے تھے یقیناً وہ بہت احسان کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

حدیث: حضرت انسؓ سے مروی ہے حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور میں نے ایسا خطبہ کبھی نہیں سنا تھا۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''اگر تمہیں وہ معلوم ہو جائے جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو اور زیادہ رو صحابہ کرامؓ نے اپنے چہروں کو ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگے"۔ (بخاری و مسلم)

ہم لوگ خوف خدا سے کیسے بچ سکتے ہیں جبکہ ہمارے پاس قیامت کے دہشت ناک مناظر کی تصویر موجود ہے۔

حضرت مقدادؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''قیامت کے دن سورج مخلوقات کے اتنے قریب آ جائے گا۔ حتیٰ کہ ان سے صرف میل کی مسافت پر رہ جائے گا''۔ (صحیح مسلم)

نیلم بن عامرؒ حضرت مقدادؓ سے روایت کرنے والے راوی کہتے ہیں کہ''خدا کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ میل سے کیا مراد ہے۔ زمین کی ایک میل کی مسافت مراد ہے یا میل سے مراد وہ سلائی ہے جس سے آنکھوں میں سرمالگایا جاتا ہے۔ اس دن لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو ٹخنوں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو گھٹنوں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو کمر تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور بعض ایسے ہوں گے جن کو پسینے کی لگام دے دی جائے گی۔ جن کا پسینہ کان کی لو تک جائے گا۔ وہ اس خیال سے کہ یہ پسینہ منہ میں نہ چلا جائے بار بار اپنا منہ اوپر کو اٹھائیں گے۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ بعض کے منہ میں پسینے کی لگام ہوگی۔ یہ بات حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے ہاتھ کو منہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمائی"۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" قیامت کے دن لوگ پسینے میں شرابور ہوں گے۔ حتیٰ کہ ان کا پسینہ ستر ہاتھ تک زمین میں سرایت کر جائے گا اور انہیں پسینے نے لگام ڈال رکھی ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا"۔ (بخاری و مسلم)

صوفیاء کرام کے ہاں خوف خدا اور روحانی امراض کے لیے نسخہ کیمیا کیا ہے۔؟

حضرت شبلیؒ نے ایک حکیم سے کہا''مجھے گناہوں کا مرض ہو گیا ہے، اگر اس کی دوا آپ کے پاس ہے تو مہربانی کر کے عنایت فرمائیں''۔ یہاں یہ باتیں ہو رہیں

ہیں اور سامنے میدان میں ایک شخص تنکے چننے میں مصروف تھا اس کے کان میں حضرت شبلیؒ کے الفاظ پہنچے تو اس نے حضرت شبلیؒ کو مخاطب کر کے فرمایا ''شبلی ادھر آئیں میں اس کی دوا بتاتا ہوں۔ حیا کے پھول، صبر و شکر کے پھل، عجز و نیاز کی جڑ، سچائی کے درخت کے پتے، ادب کی چھال، حسن اخلاق کے بیج یہ لے کر ریاضت کے ہاون دستے میں کوٹنا شروع کر اور پھر ان سب کو دل کی دیگچی میں رکھ کر چولھے پر چڑھا۔ اور پھر جب یہ پک کر تیار ہو جائے تو صفائے قلب کی صافی میں چھان، اور شرین زبان کی شکر ملا کر محبت کی تیز آنچ دے، جب پک کر بالکل تیار ہو جائے تو اس کو ''خوف خدا'' کی ہوا سے ٹھنڈا کر کے استعمال کر''۔ حضرت شبلیؒ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ دیوانہ غائب ہو چکا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا معمول تھا کہ روزانہ رات کو علما کے مجمع کو بلاتے جو موت کا، قیامت کا، اور آخرت کا ذکر کرتے اور ایسا روتے جیسا کہ جنازہ سامنے رکھا ہو۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ '' آدمی مسکین پر اگر کوئی آفت، کوئی مصیبت، کوئی حادثہ کوئی رنج کوئی تکلیف، کوئی مشقت کوئی خوف کبھی بھی نہ آئے۔ تب بھی موت کی سختی نزاع کے وقت کی سختی، قبر کی حالت، روز محشر کی حاضری کا خوف ہی اس کی دنیا کی تمام لذتوں کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ اس کا وقت معلوم نہیں کہ کب آ جائے؟۔ رسی کسی اور کے ہاتھ میں ہے معلوم نہیں کب کھینچ لی جائے''؟۔

حضرت سلمانؓ کا جب انتقال کا وقت قریب ہوا تو وہ رونے لگے۔ کسی نے کہا '' رونے کی کیا بات ہے تم جا کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے ملو گے۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا وصال اس حالت میں ہوا کہ وہ تم سے راضی تھے'' فرمانے لگے میں "موت کے ڈر سے نہیں، نزاع کے وقت کے خوف سے نہیں رو رہا ہوں۔ نہ مجھے دنیا کے چھوٹنے کا غم ہے، لیکن ایک بات کا خوف میرے دل میں ہر وقت رہا اور اب بھی یہی خوف کھا رہا ہوں کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ہم سے ایک عہد لیا تھا کہ دنیا میں اس طرح رہنا جیسے ایک مسافر میں اس عہد کو پورا نہ کر سکا''۔ لیکن وصال کے بعد جب ان کے گھر کا سامان دیکھا تو کل سامان کی قیمت 10 درہم سے کچھ زائد تھی۔ یہ تھی وہ متاع جس کی زیادتی پر ساری عمر خوف کھاتے رہے اور موت کے وقت بھی خوف کھا رہے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ارشاد فرمائیں گے کہ '' کوئی شخص ایسا نہیں رہے گا جس کا حساب میں نہ کروں گا اور اس کے عمل کی تفتیش میں نہ بجالاؤں گا۔ بجز اہل ورع (پرہیزگار، خوف خدا رکھنے والے) کہ ان سے مجھ کو شرم آتی ہے اور ان کی قدر اس بات سے زیادہ ہے کہ ان کو میں حساب لینے کے لیے کھڑا کر دوں''۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے اس کی محبت پختہ ہو جاتی ہے اور عقل درست ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی ان ہی کا قول ہے کہ '' خوف الٰہی امید کی نسبت زیادہ ہونا چاہیے''۔

ابوالحسنؒ نابینا کہا کرتے تھے '' سعادت کی پہچان یہ ہے کہ بدبختی کا خوف آدمی کو ہر وقت رہے۔ اس لیے کہ خوف بندے اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ایک باگ ہے۔ جب یہ جاتی رہتی ہے تو بندہ تباہ ہو جاتا ہے''۔

کسی نے حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے پوچھا "سب سے زیادہ قیامت میں بے خوف کون ہوگا"؟ فرمایا "جو دنیا میں سب سے زیادہ خوف کرنے والا ہوگا''۔

حضرت حسنؒ سے بعض لوگوں نے کہا کہ '' ہم کیا علاج کریں کہ ہم ایسے لوگوں میں بیٹھتے ہیں جو ہم کو اتنا ڈراتے ہیں گویا کہ ہمارے دل اڑنے لگتے ہیں''۔ آپؒ نے فرمایا "اس بات کو خوب جان لو کہ ایسے لوگوں میں بیٹھنا جو تم کو ڈرائیں۔ یہاں تک کہ تم کو امن میں پہنچا دیں اس سے بہتر ہے کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھو کہ وہ تم کو بے خوف کر دیں اور پھر تم کو ایک دفعہ ہی خوف آن گھیرے''۔

حضرت ابوسلمانؒ فرماتے ہیں "جس دل سے خوف الگ ہو جاتا ہے وہ خراب ہو جاتا ہے''۔

ایک حدیث میں ہے کہ '' جب ایمان دار کے دل پر اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزہ پڑ جاتا ہے تو اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے درخت سے پتے جھڑتے ہیں''۔ (الترغیب والترھیب، بیہقی)

ایک حدیث میں ہے کہ '' خدائے تعالیٰ کے نزدیک دو قطروں سے اچھا کوئی قطرہ نہیں ایک آنسو کا قطرہ جو خدائے تعالیٰ کے خوف سے نکلے، دوسرا وہ قطرہ خون جو اللہ کی راہ میں بدن سے گرے''۔ (جامع ترمذی)

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا '' سات اشخاص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں رکھے گا جب اس کے سائے کے علاوہ کہیں سایہ نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں''۔ (بخاری شریف)

حضرت ابوسلمانؒ درانی فرماتے ہیں "جس کی آنکھ آنسوؤں سے ڈبڈبا جائے گی قیامت کے دن اس کے چہرے پر غبار اور ذلت نہیں آئے گی اور اگر اس کے آنسو بہہ نکلیں گے تو اول ہی قطرے سے بہت سے آگ کے سمندر سرد ہو جائیں گے اور اگر کوئی شخص کسی جماعت میں روئے تو اس پوری جماعت کو عذاب نہ ہوگا"۔

حضرت کعب الاحبارؒ فرماتے ہیں ''بخدا اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس طرح رونا کہ آنسو میرے رخسار پر بہہ نکلیں مجھے اس بات سے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار دینار خیرات کروں۔

حضرت حنظلہؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہم کو ایسی نصیحت کی کہ اس سے ہم سب کے دل نرم ہو گئے اور ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اپنے نفسوں کو ہم نے جان لیا۔ پھر جب میں گھر آیا تو گھر والے میرے پاس آئے اور اس دنیا کی باتیں ہم لوگوں میں جاری ہو گئیں۔ یہاں تک کہ وہ حال جو ہمارا نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے سامنے تھا اب بالکل نہ رہا۔ اور بالکل ہی دنیا کا معاملہ ہو گیا۔ پھر مجھ کو یاد آیا تو میں نے کہا "میں تو منافق ہوں، اس وجہ سے کہ جو رقعت اور خوف الٰہی مجھ پر طاری تھا اب نہیں رہا تھا"۔ خوف کے مارے میں گھر سے نکلا اور پکارا حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ مجھ کو سامنے سے ملے۔ انہوں نے کہا" نہیں حنظلہ ہرگز منافق نہیں ہوا ہے۔" میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس حالت میں کہ میں زبان سے اب بھی یہی کہتا جا رہا تھا کہ حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے مجھے دیکھا اور فرمایا" بالکل منافق نہیں ہوا ہے"۔ میں نے عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم آپ خاتم النبیین ﷺ کے پاس تھے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ایسا وعظ کیا کہ دل خوف الٰہی سے بھر گئے۔ دلوں پر رحم چھا گیا۔ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اپنے نفسوں کو ہم نے جان لیا۔ مگر جب میں گھر گیا اور دنیاوی باتیں شروع کیں تو وہ سب کیفیت ختم ہو گئی جو آپ خاتم النبیین ﷺ کے سامنے تھی"۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اے حنظلہؓ اگر تم ہمیشہ اُسی کیفیت پر رہو تو تم سے فرشتے راستوں میں اور تمہارے بستروں پر مصافحہ کرنے لگیں مگر ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے''۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ایک نوجوان کے پاس گئے اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس سے پوچھا: "اپنے (اخروی اجر وثواب اور عذاب وعقاب کے) بارے میں کیا خیال کرتے ہو؟" اس نے کہا "اے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ! میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں پرامید ہوں، لیکن اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں"۔ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: "جس آدمی کے دل میں اس قسم کے (جان کنی کے) وقت میں یہ دو چیزیں (یعنی خوف وامید) جمع ہو جاتی ہیں، تو جس چیز کی اسے امید ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ وہ عطا کر دیتا ہے اور جس چیز کا ڈر ہوتا ہے، وہ اس سے امن دلا دیتا ہے۔" (السلسلۃ الصحیحۃ)

اس بات کو حضرت عمرؓ کے قول سے واضح کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ''اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ دوزخ میں صرف ایک شخص جائے گا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا اور اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ جنت میں صرف ایک شخص جائے گا تو میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میں ہونگا''۔

تو مومن ایسا ہے گویا اس کے دو دل ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بندہ خوف زیادہ رکھے یا امید؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہی فاسد ہے اور ایسا ہے کہ کوئی پوچھے کہ روٹی بہتر ہے یا پانی؟۔ اب اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ بھوکے کو روٹی بہتر ہے اور پیاسے کو پانی۔ اور اگر کسی کو بھوک اور پیاس دونوں ہیں تو دونوں میں سے جو چیز غالب ہوگی اس کا اعتبار ہوگا۔ اگر پیاس غالب ہے تو پانی افضل ہوگا اور اگر بھوک غالب ہے تو روٹی افضل ہوگی۔ اس لیے کہ جو چیز کسی مقصود کے لیے مطلوب ہوتی ہے تو اس کی خوبی اس مقصود کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ نہ کہ خود اپنی ذات کے لحاظ سے امید اور خوف دو دوائیاں ہیں جن سے دلوں کا علاج ہوتا ہے تو ان کی خوبی اس قدر ہوگی جس قدر روگ موجود ہوگا۔ پس اگر دل پر مرض خدا سے بے خوف ہونے کا ہے (عذاب سے بے خوف ہونے کا) اور مغرور ہونے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں خوف بہتر ہے اور افضل یہی ہوگا کہ اسے خوف خدا سے ڈرایا جائے''۔ اور اگر دل پر یاس اور قنوط (ناامیدی اور بے چینی) غالب آ گیا ہو تو اس کے لیے امید دلانا افضل ہوگا۔ اس لیے کہ امید کا منبع بحر رحمت ہے۔ مگر ایک ایسا متقی شخص جس نے ظاہری اور باطنی گناہ چھوڑ دیئے ہیں۔ اس کے حق میں بہتر یہ ہے کہ خوف اور امید دونوں اعتدال کے ساتھ ہم پلو رہیں۔ اس لیے کہ ایک مشہور قول ہے کہ ''مومن وہ ہے کہ جس کے دل کا خوف اور امید اگر تولی جائے تو دونوں برابر ہوں''۔

عام آدمی کو اگر یہ گمان ہو جائے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو دوزخ میں نہیں جائیں گے تو یہ صورت اس کے لیے مغالطہ کھانے کی ہو جائے گی''۔ اس لیے حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا قول ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف خوف سے کرے گا وہ فکر کے سمندر میں ڈوب جائے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف امید سے

کرے گا تو وہ وادی مغالطہ میں سرگشتہ رہے گا اور جو شخص خوف، امید اور محبت سے عبادت کرے گا تو طریق ذکر میں مستقیم رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں چیزوں کا جمع رہنا ضروری ہے لیکن مناسب خوف کا غلبہ ہے، جب تک موت سامنے نہ آئے اور مرنے کے وقت غلبہ امید کا مناسب تر ہے، کیونکہ نزاع کی صورت میں عمل کا وقت تو گزر گیا ہے نہ اب خوف برداشت ہوسکتا ہے۔ اس سے تو کل کا مرنے والا آج مر جائے گا۔ ہاں اس وقت امید کی صورت میں دل کو تقویت ہوتی ہے اور جس ذات پاک سے امید ہوتی ہے اس کی محبت دل میں سما جاتی ہے اور آدمی کو یہ ہی مناسب بھی ہے کہ جب دنیا سے کوچ کرے تو محبت الٰہی ہی میں کرے تا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا اچھا معلوم ہو۔ کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات کو پسند فرماتا ہے اور یہ صورت امید میں بن جاتی ہے اس لیے کہ محبت امید سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ موت سے پہلے غلبہ خوف کا بہتر ہے اور موت کے وقت امید کا غلبہ بہتر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے بیٹے سے فرمایا کرتے تھے "موت کے وقت امید کی باتیں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن پیدا کرتی ہیں"۔

حضرت سفیان ثوریؒ کو نزاع کا علم ہوا تو انہیں خوف بہت زیادہ معلوم ہوا۔ انہوں نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے علما کرام کو کہا "مجھے امید دلائیں اور توقع دلائیں"۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے بیٹے کو نزاع کے وقت ارشاد فرمایا "مجھے وہ احادیث سناؤ جس میں امید اور حسن ظن کا ذکر کیا گیا ہے"۔ اور اس سے ان کا مقصد اس وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب حقیقی کی صورت میں پالینا تھا۔ اسی بنا پر حضرت داؤدؑ پر وحی آئی تھی کہ اے داؤدؑ مجھ کو میرے بندوں کے درمیان محبوب کردے۔ انہوں نے عرض کیا اے باری تعالیٰ میں تجھے تیرے بندوں کے درمیان کیسے محبوب بناؤں؟ ارشاد ہوا کہ میرے انعامات اور احسانات ان کو کھول کھول کر دکھادے (سنادے)"۔

غرض کہ سعادت اللہ تعالیٰ کی محبت میں مرنے میں ہے محبت الٰہی دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے کہ اول "معرفت" دوئم "اس دنیا سے نفرت" یہاں تک کہ یہ دنیا تجھے قید خانہ معلوم ہونے لگے جو محبوب سے ملنے سے روکتی ہے۔ بعض صلحا نے حضرت ابوسلیمان درانیؒ کو خواب میں دیکھا کہ وہ ڈرتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا آپ کا کیا حال ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ ابھی قید سے چھٹا ہوں۔ صبح کو جاگے تو لوگوں سے ابوسلیمانؒ کا حال پوچھا لوگوں نے کہا کہ گزشتہ شب ان کا انتقال ہوگیا ہے۔

بعض خائفین میں سے ایک شخص نے اپنے بھائی کو وصیت کی "جب میں مرنے لگوں تو میرے سرہانے بیٹھ جانا اور اگر دیکھو کہ میرا خاتمہ توحید پر ہوا ہے تو میرا مال لے کر بادام اور شکر خرید کر لڑکوں میں تقسیم کر دینا اور کہنا کہ ایک شخص قید سے چھوٹا ہے یہ اس کی شرینی ہے اور اگر میرا خاتمہ توحید پر نہ ہو تو لوگوں کو خبر کر دینا کہ یہ شخص توحید پر نہیں مرا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دھوکے میں آکر میرا جنازہ پڑھے اور مجھ پر "ریا" (دکھاوا) لاحق ہو۔ اگر تم سب کہہ دو گے تو جس کا دل چاہے گا آئے گا"۔ ان کے بھائی نے پوچھا "میں یہ کیسے جانوں گا کہ آپ کا خاتمہ توحید پر ہوا ہے یا نہیں"؟ انہوں نے کچھ علامات بتادیں کہ توحید کی پہچان یہ ہوگی۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے بھائی نے علامت توحید کی پائیں۔ انہوں نے وصیت کے مطابق بادام اور شکر تقسیم کردی اور بتایا "ایک شخص قید سے چھوٹا ہے یہ اس کی شرینی ہے"۔

حضرت عیسیٰؑ فرمایا کرتے تھے "اے گروہ حواریوں تم گناہوں سے ڈرتے ہو ہم پیغمبروں کی جماعت کفر سے ڈرتے ہیں"۔

انبیاء کرام کے تذکرے میں مذکور ہے کہ ایک پیغمبر نے برسوں بھوک، برہنگی، اور جوؤں کی حالت میں وقت گزارا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے بھوک اور جوؤں کی شکایت کی کہ بہت تنگ کرتی ہیں۔ وحی ہوئی کہ ہم نے تجھ کو کفر سے بچا رکھا ہے اس بات پر راضی نہیں کہ دنیا مانگتا ہے۔ انہوں نے فوراً خاک اپنے سر پر ڈالی اور کہا "الٰہی میں راضی ہوں مجھے کفر سے بچائے رکھنا"۔

اب غور کا مقام ہے کہ جب خاتمے کی برائی سے ایسے عارف بھی ڈرتے ہیں جن کے قدم راسخ اور ایمان قوی ہیں تو ضعیف بے چارے کیسے نہیں ڈریں گے؟ اور ڈرنا ہی ان کے لیے بہتر ہے۔

حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں گیا ہوں اور میں نے تین سو پیغمبروں سے ملاقات کی ہے۔ ان سب سے میں نے پوچھا کہ دنیا میں آپ سب سے زیادہ کس چیز کا خوف کیا کرتے تھے۔ ان سب ہی نے یہ جواب دیا کہ "سوء خاتمہ سے" (برے خاتمے سے)

انبیاء کرام اور فرشتوں پر خوف خداوندی کے حالات

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں "جب ہوا چلتی اور آندھی چلتی تو آنحضرت خاتم النبیین ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا تھا اور باہر اندر جاتے تھے اور یہ سب باتیں خدا کے خوف کی وجہ سے ہوتیں تھیں کہ شاید، قیامت آنے والی ہے"۔ آپ خاتم النبیین ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "میرے پاس جبرائیل

علیہ السلام کبھی نہیں آئے مگر اس صورت سے کہ خوف خدا میں کانپتے ہیں''۔(سنن ابی داؤد)

جب شیطان مردود ہوا تو حضرت جبرائیلؑ اور حضرت میکائیلؑ نے رونا شروع کر دیا ان سے پوچھا گیا" کیوں روتے ہو"؟ انہوں نے عرض کیا" الٰہی ہم تیرے داؤ سے بے خوف نہیں ہیں"۔حکم ہوا" تمہیں میرے مکر سے بے خوف ہونا بھی نہیں چاہیے تمہیں ایسے ہی رہنا چاہیے۔''

محمد بن مکدرؒ روایت کرتے ہیں" جب دوزخ پیدا ہوئی تو فرشتوں کے دل اپنی جگہ سے اڑ گئے مگر جب بنی آدم پیدا ہوئے تو دل پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئے"۔

حضرت ابودرداؓ فرماتے ہیں کہ''حضرت ابراہیمؑ جب نماز پڑھا کرتے تھے تو ان کے دل کے دھڑکنے کی آواز ایک کوس تک سنائی دیتی تھی (خوف خدا سے دل جلدی جلدی دھڑکنے لگتا تھا)"۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں" حضرت داؤد علیہ السلام اپنے گناہ کے بعد چالیس روز تک سجدے میں روئے اور سر نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں سے سبزہ جم گیا اور ان کا سر چھپ گیا"۔آواز آئی''اے داؤد اگر تو بھوکا ہے تو کھانا ملے اگر تو پیاسا ہے تو پانی ملے اگر تو ننگا ہے تو کپڑا ملے''۔آپ علیہ السلام نے ایسی دھاڑ ماری کہ آپ علیہ السلام کے خوف کی وجہ سے سامنے کی لکڑی جل گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی توبہ قبول کی اور مغفرت اتار دی عرض کیا" الٰہی میرا گناہ میرے ہاتھ پر لکھ دے۔ ان کا گناہ ان کی ہتھیلی پر لکھ دیا گیا۔ جب کھاتے پیتے یا کسی مقصد اور کام کے لیے ہاتھ بڑھاتے تو اس خطا کو دیکھ کر روتے"۔راوی کہتے ہیں" پانی کا پیالہ جب ان کے ہاتھوں میں آتا تو تہائی خالی ہوتا تھا۔ جب آپؑ اپنی خطا دیکھتے تو ہونٹوں سے ملانے تک آنسوؤں سے لبریز ہو جاتا تھا"۔اور یہ بھی آپ علیہ السلام کے احوال میں مروی ہے" آپ علیہ السلام نے کبھی اپنا سر آسمان کی طرف نہ اٹھایا اور دعا یوں عرض کیا کرتے تھے

''الٰہی جب میں اپنی خطا یاد کرتا ہوں تو زمین باوجود اپنی وسعت کے مجھ پر تنگ ہو جاتی ہے اور جب تیری رحمت کو یاد کرتا ہوں تو جان میں جان آتی ہے تو پاک ہے۔ باری تعالیٰ میں تیرے بندوں میں سے جو طبیب ہیں ان کے پاس گیا سب کے سب تیرے پاس ہی علاج بتاتے ہیں تو خرابی ہے اس کے لیے جو تیری رحمت سے آس توڑ دے''۔

حضرت فضیلؒ ارشاد فرماتے ہیں" ایک روز حضرت داؤدؑ نے اپنا گناہ یاد کیا اور پھر چیختے ہوئے اپنا ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے پہاڑوں میں چلے گئے۔ درندے آپؑ کے پاس اکٹھے ہو گئے"۔آپؑ نے ان سے فرمایا" تم چلے جاؤ مجھے تم سے کوئی کام نہیں، مجھے تو وہ ہی چاہیے جو اپنی خطا پر روئے اور جو میرے سامنے روتا ہوا آئے اور جو خطا دار نہیں اس کا خطا کار کے پاس کیا کام''؟ اور جب لوگ آپ علیہ السلام کو رونے سے منع فرماتے تو آپ علیہ السلام کہتے''مجھے رونے دو اس سے پہلے پہلے کہ رونے کا دن بھی ہاتھ سے جاتا رہے اور میں فرشتوں کے حوالے کر دیا جاؤں''۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے کہا''الٰہی میرے رونے پر رحم فرما۔فرمایا اے داؤدؑ اپنا گناہ بھول گیا ہے اور رونا یاد ہے''عرض کیا''اے میرے آقا میں اپنے گناہ کو کیسے بھولوں گا؟ میرا تو یہ حال تھا کہ میں زبور پڑھتا تھا تو پرندے میرے سر پر سایہ کرتے تھے، وحشی جانور مجھے سننے آتے تھے اور میرے گرد اکٹھے ہو جایا کرتے۔اے اللہ اب یہ کونسی وحشت ہے جو مجھ میں اور تجھ میں ہے؟''

آواز آئی''اے داؤد علیہ السلام وہ انس طاعت کا تھا، یہ وحشت گناہ کی ہے۔اے داؤد علیہ السلام آدم میری ایک مخلوق ہے جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ پھر اپنی روح اس میں پھونکی اپنے فرشتوں سے اسے سجدہ کرایا۔اپنے اکرام کی خلعت اس کو پہنائی۔اپنے وقار کا تاج اس کے سر پر رکھا اور جب تنہائی کی شکایت کی تو حوا کو بنایا۔پھر جنت میں رہنے کو جگہ دی اور جب اس نے نافرمانی کی تو ہم نے اسے اپنے پاس سے نکال دیا''۔

''اے داؤدؑ میرا قول سن اور میں سچ کہتا ہوں کہ تو نے ہماری طاعت کی تو ہم نے تیرا کہنا مانا جو مانگا سو دیا۔نافرمانی کی تو ہم نے تجھے چھوڑ دیا۔اب اگر تو ہماری طرف رجوع کرے گا تو ہم تجھے قبول کر لیں گے''۔

یحییٰ بن ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ مجھ کو یہ روایت پہنچتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب نوحہ کرنا چاہتے تھے تو سات روز پیشتر ہی کھانا پینا بند کر دیتے تھے۔ جب ایک روز رہ جاتا تو جنگل کا رخ کرتے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو فرماتے" شہروں، پہاڑوں، ٹیلوں، جنگلوں اور بت خانوں میں کہلا دو کہ لوگو اگر تمہیں حضرت داؤد علیہ السلام کا اپنے نفس پر نوحہ سننا منظور ہو تو آ جاؤ"۔جنگلوں اور ٹیلوں سے وحشی درندے، پہاڑوں سے جانور، گھونسلوں سے پرندے، اور شہروں سے مرد اور عورتیں (پردوں میں) آ جاتیں۔حضرت داؤد علیہ السلام آ کر منبر پر چڑھتے۔آپ علیہ السلام کے ارد گرد بنی اسرائیل ہوتے۔حضرت سلیمان علیہ السلام آپ علیہ السلام کے سر کے پاس کھڑے ہوتے۔اول آپؑ اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان کرتے اور لوگ رونا شروع کر دیتے آہستہ آہستہ لوگ دھاڑیں مارنے لگتے۔، پھر آپ علیہ السلام جنت اور

دوزخ کا ذکر کرتے تو زمین کے اندر رہنے والے جانور اور وحشی جانور مارے خوف کے مرجاتے پھر قیامت کی دہشت کا ذکر کرتے اور اپنے اوپر نوحہ کرتے تو ہر قسم کے جان داروں میں سے پرے کے پرے الٹ جاتے (مرجاتے) حضرت سلیمان علیہ السلام جب مردوں کی کثرت دیکھتے تو آپ علیہ السلام سے کہتے " آپ علیہ السلام نے سننے والوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور بنی اسرائیل کے بہت سے گروہ مر گئے ہیں اور زمین کے بہت سے حشرات فنا ہو گئے ہیں"۔ یہ سن کر آپ دعا مانگنا شروع کر دیتے۔ وہ دعا ہی میں ہوتے تو بنی اسرائیل کا کوئی عابد ان کو پکارتا اور کہتا ''اے داؤد جزاء کے مانگنے میں آپ علیہ السلام نے جلدی فرمائی ہے''۔

یہ سن کر آپ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ جب سلیمان علیہ السلام آپ علیہ السلام کا یہ حال دیکھتے تو ایک چار پائی لاتے اور اس پر آپ علیہ السلام کو ڈالتے پھر پکارتے اور کہتے اگر کسی کا کوئی ساتھی، دوست، آشناء داؤدؑ کے ساتھ تھا تو وہ چار پائی لے کر اسے اٹھالائے کیونکہ جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان کو جنت اور دوزخ کے بیان نے مار ڈالا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خوف خدا نے فنا کیا ہے''۔ پھر جب حضرت داؤدؑ کو آرام ہوتا تو کھڑے ہوتے اور اپنا ہاتھ سر پر رکھتے اور اپنے عبادت خانے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیتے۔ پھر کہتے ''اے داؤدؑ کے مالک کیا تو داؤد سے ناراض ہے''؟ اور اس مناجات میں رہتے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اندر آنے کی اجازت طلب کرتے اور ایک ٹکیہ جو کی لے کر اندر آتے اور عرض کرتے "بابا اس کو کھا کر جو بات کہنا چاہتے ہیں اس کو کہنے کی قوت پیدا کر لیں"۔ تو آپؑ اس میں سے کسی قدر کھا لیتے۔ پھر بنی اسرائیل نکل کر رہتے۔ (یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام آہ وزاری کے لئے جاتے تو بنی اسرائیل کے عابد بھی ضرور جاتے)

یزید رقاشیؒ راوی ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک روز چالیس ہزار آدمیوں کے ساتھ نکلے۔ آپ ان کو اپنا وعظ سناتے اور ڈراتے۔ ان میں سے تیس ہزار موقع پر ہی مر گئے اور 10 ہزار کے ساتھ واپس لوٹے تھے۔ آپ علیہ السلام کی دو لونڈیاں تھیں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جب آپ علیہ السلام پر خوف کا غلبہ ہوتا اور آپ علیہ السلام گر کر تڑپنے لگتے تو وہ دونوں سینے اور پاؤں پر بیٹھ جاتیں تھیں تا کہ آپ علیہ السلام کے جوڑ الگ نہ ہو جائیں اور آپ علیہ السلام مر نہ جائیں۔

صحابہؓ اور تابعینؒ پر خوف خدا کا غلبہ

روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک مرتبہ پرندے کو دیکھا اور فرمایا ''کاش میں ایک پرندہ ہوتا''۔

حضرت عمرؓ جب کوئی قرآنی آیت خوف کی سنتے تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

عمران بن حسینؓ فرماتے ہیں کہ ''میں اچھا سمجھتا ہوں کہ راکھ ہو جاؤں اور میرے اجزاء ہوا یا آندھی کے دن میں اڑا دیئے جائیں''

حضرت ابوعبیدہ بن جرحؒ کا قول ہے کہ ''مجھ کو اچھا معلوم ہوتا کہ میں ایک مینڈھا ہوتا لوگ مجھے ذبح کرتے۔ میرا گوشت کھاتے اور شوربہ پی جاتے''۔

حضرت امام زین العابدینؒ وضو فرماتے تو آپؒ کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا۔ گھر والوں نے پوچھا "وضو کے وقت ایسا کیوں ہوتا ہے"؟ آپؒ نے جواب دیا" تمہیں معلوم بھی ہے کہ کس کے سامنے کھڑا ہوا چاہتا ہوں؟''۔

حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں ''کسی خوبصورت مکان پر فریفتہ نہ ہو۔ جنت سے زیادہ خوبصورت کوئی جگہ نہیں مگر آدمؑ کا حال اس میں جو ہوا سو ہوا۔ اور نہ کثرت عبادت پر فریفتہ ہو۔ ابلیس کا حال بعد کثرت عبادت کے خود ظاہر ہے۔ اور نہ کثرت علم سے مغرور ہو کہ ''بلعام'' اسم اعظم جانتا تھا اس کا کیا انجام ہوا؟ اور نہ صلحا کی زیارت پر فریفتہ ہو کہ آپ خاتم النبیین ﷺ سے بڑھ کر کسی کا رتبہ نہیں مگر بعض اقارب کو آپ خاتم النبیین ﷺ کی زیارت بھی کام نہ آئی"۔

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ''، میں اپنی ناک کو دن میں کئی بار دیکھ لیتا ہوں اس خوف سے کہ کہیں میرا منہ کالا تو نہیں ہو گیا''۔

ایک دن حضرت حسن بصریؒ ایک جوان کے پاس سے گزرے کہ اپنی ہنسی میں ڈوبا ہوا تھا اور ایک مجلس میں لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آپؒ نے اس کو دیکھا اور اس سے پوچھا ''اے نوجوان کیا تو پل صراط سے گزر چکا ہے''؟ اس نے کہا ''نہیں'' آپؒ نے اس سے سوال کیا ''کیا تجھے معلوم ہے کہ تو دوزخ میں جائے گا یا جنت میں ؟'' اس نے کہا ''نہیں''۔ آپؒ نے فرمایا کہ ''پھر یہ ہنسی کیسی ہے''؟ راوی کہتے ہیں "پھر اس شخص کو کسی نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر غفلت ڈال دی ہے یہ بھی رحمت ہے تا کہ خوف خدا سے مر نہ جائیں''

حضرت عطائے سلیمیؒ بھی خائفین میں سے تھے (ڈرنے والے) اللہ تعالیٰ سے کبھی جنت کا سوال نہ کرتے۔ صرف معاف کرنے کی درخواست کرتے۔ مرض میں آپ سے لوگوں نے پوچھا" کس چیز کے لیے دل چاہتا ہے"۔ انہوں نے فرمایا" دوزخ کے خوف نے میرے دل میں کسی چیز کی خواہش کے لیے جگہ نہیں چھوڑی ہے"۔ کہتے ہیں کہ چالیس برس تک انہوں نے اپنا سر آسمان کی طرف نہیں اٹھایا تھا اور نہ ہی ہنستے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ ہر روز رات کے کسی وقت میں اپنا جسم ٹٹولہ کرے اس خوف سے کہیں

مسخ تو نہیں ہوگیا۔ جب کبھی آندھی چلتی، بجلی گرتی یا غلہ گراں ہوتا تو فرماتے ''سب کچھ میری نحوست سے ہے میں مرجاؤں گا تو لوگ راحت پائیں گے''۔

ایک مرتبہ حجاج نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے پوچھا کہ ''میں نے سنا ہے کہ آپ کبھی نہیں ہنستے؟ آپ نے فرمایا کہ ''ہنسنے کی کیا صورت رہ گئی ہے؟ دوزخ گھات میں ہے، طوق تیار کردیئے گئے ہیں اور فرشتے دوزخ میں ڈالنے کے لیے مستعد اور آمادہ کھڑے ہیں۔''

ایک شخص نے حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا ''اے ابوسعیدؒ کیا حال ہے؟ آپؒ نے مسکرا کر فرمایا "میرا حال پوچھتا ہے؟۔ یہ بتا کہ اگر کچھ لوگ کشتی میں سوار ہوکر بیچ سمندر میں پہنچ جائیں اور وہاں پہنچ کر کشتی ٹوٹ جائے اور ایک ایک آدمی ایک ایک تختے سے لگ کر رہ جائے تو ان کا حال تمہارے ذہن کے مطابق کیا ہوگا"؟ اس نے کہا "بہت سخت مصیبت ہوگی"۔ آپؒ نے فرمایا کہ ''اب تو جان لے کہ میرا حال اس سے بھی زیادہ سخت ہے''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک لونڈی ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا "امیرالمومنینؒ میں نے اس وقت (تہجد کی نماز کے بعد) ایک عجیب معاملہ دیکھا ہے"۔ آپؒ نے پوچھا" کیا معاملہ ہے"؟ اس نے کہا" میں نے دیکھا کہ دوزخ دوزخیوں کے واسطے دھڑا دھڑ جل رہی ہے۔ پل صراط کو لاکر دوزخ کی پشت پر رکھ دیا گیا ہے"۔ آپؒ نے فرمایا" پھر کیا ہوا"؟ اس نے کہا" پھر عبدالملک بن مروان کو لائے اور اس پل پر اس کو چڑھا دیا اور وہ ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ پل الٹ گیا اور وہ دوزخ میں گر گیا"۔ آپؒ نے فرمایا" پھر"؟ اس نے کہا" پھر میں نے دیکھا کہ عبدالملک کے بیٹے کو لائے اور اس کو پل پر سوار کیا وہ بھی ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ پل نے کروٹ لی اور دوزخ میں جا پڑا"۔ آپؒ نے گھبرا کر کہا" پھر"؟ اس نے کہا" پھر سلمان بن عبدالملک کو لائے اور پل پر چڑھایا وہ بھی تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ پل ترچھا ہوگیا اور وہ دوزخ میں گر گیا"۔ آپؒ نے فرمایا" پھر"؟ اس نے کہا" پھر میں نے آپؒ کو دیکھا کہ آپؒ کو لائے ہیں" اس کا یہ کہنا تھا کہ آپؒ نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ وہ لونڈی اٹھی اور آپؒ کے کان میں پکار پکار کر کہنے لگی "امیرالمومنینؒ میں نے دیکھا کہ آپؒ پل صراط سے صحیح وسالم گزر گئے ہیں۔ آپؒ نے نجات پالی ہے" ہر چند کہ وہ کان میں چیختی رہی لیکن آپؒ برابر آہ وبکا کے نعرے لگاتے رہے اور پاؤں زور زور سے زمین پر مارتے رہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں "مومن کا خوف جب تک نہیں چھوٹتا جب تک دوزخ کے پل کو پیچھے نہ چھوڑ دے"۔

حضرت عمرؓ بسا اوقات ایک تنکا ہاتھ میں لیتے اور فرماتے کاش میں ایک تنکا ہوتا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، ایک شخص آیا اور کہنے لگا ''فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ آپؓ چل کر مجھے بدلہ دلوا دیجئے''۔ آپؓ نے اس کو ایک درہ مارا کہ جب میں اپنا کام کرنے بیٹھتا ہوں تو اس وقت آجاتے ہیں اور جب لوگوں کے کام کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت نہیں آتے۔ وہ شخص چلا گیا۔ آپؓ نے آدمی بھیج کر اس کو بلوایا اور درہ اس کو دے کر فرمایا ''اپنا بدلہ لے لو''۔ اس نے عرض کیا ''میں نے اللہ کے واسطے معاف کیا''۔ آپؓ گھر تشریف لائے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد اپنے آپ کو خطاب کر کے فرمایا ''اے عمر تو کمینہ تھا اللہ نے تجھے اونچا کیا، تو گمراہ تھا اللہ نے تجھے ہدایت دی، تو ذلیل تھا اللہ نے تجھے عزت دی، پھر لوگوں کا بادشاہ بنا دیا۔ اب ایک شخص آکر کہتا ہے کہ مجھے ظلم کا بدلہ دلواؤ تو تو اس کو مارتا ہے۔ کل قیامت کے دن اپنے رب کو کیا جواب دے گا''۔ بہت دیر تک اپنے آپ کو ملامت کرتے رہے۔ (اسد الغابۃ)

حضرت عمرؓ کے غلام حضرت اسلمؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ہمراہ ہم حرہ (مدینے کے قریب ایک جگہ کا نام ہے) کی طرف جارہے تھے ایک گھر میں بچے رو رہے تھے۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اجازت لے کر اندر آئے اور پوچھا" بچے کیوں رو رہے ہیں"؟ اس عورت نے بتایا" گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے"۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا" دیگچی میں کیا ہے"؟ عورت نے کہا" پانی بھر کر بہلانے کے واسطے آگ پر رکھ دی ہے"۔ پھر اس عورت نے کہا کہ ''عمر کا اور میرا اللہ کے وہاں ہی فیصلہ ہوگا کہ میری تنگی کی اس کو فکر ہی نہیں ہے''۔ حضرت عمرؓ رونے لگے اور فرمایا" اللہ تجھ پر رحم کرے بھلا عمر کو تیرے حال کی کیا خبر"؟۔ اس نے کہا ''وہ ہمارے امیر ہیں۔ ان کو ہمارے حال کی خبر رکھنی چاہیے"۔ حضرت اسلمؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر مجھے ساتھ لے کر واپس آئے اور بیت المال سے آٹا، کھجوریں، پنیر، چربی، کچھ کپڑے اور کچھ درہم لیے۔ یہ تمام چیزیں ایک بوری میں اکٹھی کیں اور بوری کو خوب بھر لیا اور کہا کہ ''اس بوری کو میری کمر پر رکھ دے'' میں نے عرض کیا کہ ''میں لے چلوں'' آپؓ نے پھر فرمایا ''میری کمر پر رکھ دے''۔ دو تین مرتبہ جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ ''کیا قیامت میں بھی میرے بوجھ کو تو اٹھائے گا''۔ اس کو میں ہی اٹھاؤں گا''۔ اس لیے کہ قیامت میں مجھ ہی سے اس کا سوال ہوگا؟''۔ عورت نے سامان دیکھا تو خوش ہوئی اور کہا" اللہ تمہیں جزا دے تم اس کے مستحق تھے کہ عمر کے بجائے تم خلیفہ بنتے"۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''جب تم خلیفہ کے پاس جاؤ گی تو مجھے بھی وہاں ہی پاؤ گی''۔ (اشہر مشاہیر منتخب کنز العمال)۔

حضرت عمرؓ صبح کی نماز میں سورہ کہف اور سورہ طٰہٰ بڑی سورتیں پڑھتے اور اتنا روتے کہ کئی صفوں تک آواز جاتی۔ نماز میں بعض مرتبہ گر جاتے اور بیمار ہوجاتے۔

وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ظاہری بینائی جانے کے بعد میں ان کو لے کر جا رہا تھا۔ وہ مسجد حرام میں تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک مجمع میں کچھ جھگڑے کی آوازیں آ رہیں تھیں۔ فرمایا" مجھے اس مجمع کی طرف لے چلو"۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے سلام کیا۔ لوگوں نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ انہوں نے انکار کر دیا اور فرمایا ''تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی جماعت وہ لوگ ہیں جن کو اس کے خوف نے چپ کر رکھا ہے۔ حالانکہ وہ نہ عاجز ہیں، نہ گونگے بلکہ فصیح لوگ ہیں بولنے والے ہیں، سمجھدار ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کے ذکر نے ان کی عقلوں کو اڑا رکھا ہے۔ ان کے دل اس کی وجہ سے ٹوٹے رہتے ہیں اور زبانیں چپ رہتی ہیں اور جب اس حالت پر ان کو پختگی میسر ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں تم لوگ ان سے کہاں ہٹ گئے ہو؟'' وہبؒ کہتے ہیں "اس کے بعد میں نے کبھی ان میں سے دو آدمیوں کو بھی ایک جگہ جمع نہیں دیکھا"۔

حضرت ابن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ چہرے پر آنسوؤں کے ہر وقت بہنے سے دو نالیاں سی بن گئی تھیں۔

عیسیٰ بن مالک خولانی جو بڑے عابد تھے ایک راہب کا حال کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو بیت المقدس کے دروازے پر بڑے ہی غمگین حالت میں دیکھا کہ کثرت گریہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ میں نے اس کو دیکھا تو میں ڈر گیا۔ پھر میں نے ہمت کی اور کہا ''اے راہب مجھے کچھ نصیحت کر کہ تجھے یاد رکھوں'' اس نے جواب دیا۔ ''اے عزیز میں تجھ کو کیا نصیحت کروں اگر ہو سکے تو دنیا میں اس طرح رہنا، گویا درندوں اور زہریلے جانوروں نے گھیر لیا ہے اور تو ہراساں اور خائف ہے کہ ذرا سی غفلت پر درندے چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ یا چوک جائے گا تو زہریلے جانور کاٹ لیں گے۔ غرض رات دن تیرا دل خوف و ہراس میں رہے'' پھر راہب جانے لگا تو میں نے کہا کہ اور کہتے تو شاید اور زیادہ نفع دیتا۔ اس نے کہا ''پیاسے کو جتنا پانی مل جاتا ہے کافی ہوتا ہے''۔ اور یہ اس نے درست کہا اس لیے کہ صاف دل کو ادنیٰ سا خوف ہلا دیتا ہے اور کٹھن دل سخت دل واعظ اور نصیحت سے بھی نرم نہیں ہوتا اور اس نے جو مثال بیان کی کہ اس طرح رہنا جیسے وہ شخص جس کے چاروں طرف درندے اور زہریلے جانور ہوں تو اس کو ایک فرضی مثال نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ صورت واقعی ہے۔ کیونکہ اگر آدمی نور عقل سے اپنے باطن کو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ بہت قسم کے درندے اور زہریلے جانور سے پُر ہے۔ مثلاً غضب اور شہوت، کینہ اور حسد، کبر اور عجب، ریا اور منافقت جو ہمیشہ اس کو چیرتے اور ڈنگ مارتے رہتے ہیں لیکن آدمی کو ان کا گزند اور تکلیف دینا دیکھائی نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ پردہ اٹھا لیا جائے اور آدمی قبر میں رکھ دیا جائے۔ اس وقت نظر آئے گا کہ سانپ اور بچھو قبر میں آ کر بدن کو گھیر لیں گے پس اگر ان کو مار ڈالنا منظور ہے تو مرنے سے پہلے یہ بات آدمی کے اختیار میں ہے تو اس سے ہرگز نہیں چوکنا چاہیے۔ اور ان کا کاٹنا اور نوچنا خوب اچھی طرح دل و جان سے جان لینا چاہیے اور ہر وقت خوف خدا سے لرزتے رہنا چاہیے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا خوف خداوندی:

حضرت حذیفہؓ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ایک صحابی تھے۔ ان کے والد ایک ایسے جنگی معرکے میں شریک ہوئے جس میں حضرت حذیفہؓ بھی شامل تھے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ کے والد کچھ ایسے دشمنوں کے درمیان آ گئے۔ جن کو باقی صحابہؓ نے گھیر رکھا تھا۔ اب مسلمانوں کی تلواریں چل تو کفار پر رہیں تھیں لیکن اس کی زد میں حضرت حذیفہؓ کے والد بھی آ جاتے تھے۔ اگر حضرت حذیفہؓ کے والد کو اس نرغے سے نکالتے تو دشمن کو فرار ہونے کا پورا موقع مل جاتا۔ مسلمان حضرت حذیفہؓ کے والد کو بچانے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ لیکن جب دشمن ختم ہو گئے۔ تو حضرت حذیفہؓ کے والد بھی سخت زخمی ہو چکے تھے۔ پھر بعد میں وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت حذیفہؓ یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ یہ تمام نقشہ حضرت حذیفہؓ نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو بھی بتایا۔ پھر اکثر حضرت حذیفہؓ اپنے والد کی اس تکلیف کو یاد کرتے اور بہت روتے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ایک مرتبہ حضرت حذیفہؓ سے فرمایا" حذیفہؓ اگر میں تجھے کار نبوت میں شامل کر لوں تو کیا تو اپنے والد کے شہید ہونے والے واقعہ کو بھول جائے گا"؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا ''یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ میرے ماں باپ آپ خاتم النبیین ﷺ پر قربان میں کیوں ایسا نہیں کروں گا"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو منافقین کے نام بتائے منافقین تمام لوگوں کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو ان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو ان چھپے ہوئے دشمنوں کا پتہ نہ تھا۔ جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور اندر سے مشرک یا کافر تھے"۔ (منافقین)

حضرت عمرؓ نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے پردہ فرما جانے اور خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے کے بعد جب اپنا زمانہ آیا تو حضرت حذیفہؓ کو

بلایا اور کہا ''حذیفہ اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ نے تمہیں کار نبوت میں سے منافقین کے نام بتائے تھے تو کیا تم مجھے وہ بتا سکتے ہو''؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا" امیر المومنین جب آپ خاتم النبیین ﷺ نے یہ نام میرے علاوہ کسی اور کو نہیں بتائے تو میں آپؓ کو یہ نام کیسے بتا سکتا ہوں"؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا" یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" اور خاموش ہو گئے۔لیکن پھر دوسرے دن حضرت حذیفہؓ سے کہا" حذیفہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے آپ کو منافقین کے نام نہ بتانے کو کہا تھا ان کی تعداد بتانے کو تو منع نہیں فرمایا تھا۔ مجھے ان کی تعداد بتا دیں"۔حضرت حذیفہؓ نے فرمایا" امیر المومنین ان کی تعداد آج کے دن 28 ہے" حضرت عمرؓ نے کہا" اچھا 28 ہیں" اور خاموشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد جب کسی مسلمان کا انتقال ہوتا۔حضرت عمرؓ حضرت حذیفہؓ کو اطلاع کرواتے اور جنازے میں شرکت کے لئے بلواتے۔حضرت حذیفہؓ آ جاتے اور اگر کسی منافق کا انتقال ہوتا تو حضرت حذیفہؓ شامل نہ ہوتے کوئی بہانہ کر دیتے۔حضرت عمرؓ یہ نوٹ کرتے رہے کہ حضرت حذیفہؓ کن کن لوگوں کی نماز جنازہ میں نہیں آئے ہیں۔وہ ان لوگوں کی تعداد گنتے رہے۔حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال قبل تک ان لوگوں میں سے 27 لوگ فوت ہو چکے تھے۔اب صرف ایک منافق باقی رہ گیا تھا۔

آپؓ کی شہادت سے پونے دو سال پہلے ایک شخص کا انتقال ہوا۔حضرت عمرؓ نے پھر حضرت حذیفہؓ کو اطلاع دی۔لیکن دیکھا اور معلوم کیا تو پتہ چلا کہ حذیفہؓ نہیں آئے۔حضرت عمرؓ بھی واپس آ گئے۔اور سجدے میں گر کر روتے رہے اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہے کہ "شکر ہے باری تعالیٰ میں منافقین میں شامل نہیں تھا"۔

یہ ہے خدا خوفی کہ آپؓ کے زمانے سے لے کر آخری منافقین کے مرنے تک حضرت عمرؓ اس بات سے ڈرتے رہے کہ کہیں میں تو منافق نہیں ہوں؟

مختصر یہ کہ اب ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی ہے کہ ''دین کے ہر کمال کا زینہ اللہ کا خوف ہے''۔

1۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے اس کا آگ میں جانا ایسا ہی مشکل ہے جیسے دودھ کا تھنوں میں واپس جانا''۔(جامع ترمذی)

2۔ حضرت فضیلؒ مشہور بزرگ ہیں ان کا کہنا ہے کہ ''اللہ کا خوف ہر خیر کی رہبری کرتا ہے"۔

3۔ حضرت شبلیؒ کے نام سے سب ہی واقف ہیں وہ کہتے ہیں "جب بھی میں اللہ سے ڈرتا ہوں تو اس ڈر کی وجہ سے مجھ پر حکمت اور عبرت کا ایسا دروازہ کھلا ہے۔جو اس سے پہلے نہیں کھلا تھا"۔

4۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں" آدمی بے چارہ اگر جہنم سے اتنا ڈرنے لگے جتنا تنگ دستی سے ڈرتا ہے تو سیدھا جنت میں چلا جائے"۔

5۔ حضرت سلیمان درانیؒ فرماتے ہیں" جس دل سے اللہ کا خوف جاتا رہتا ہے وہ برباد ہو جاتا ہے"۔

6۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے خوف الٰہی کا یہ عالم تھا کہ ابر اور آندھی کو دیکھ کر پہلی قوموں کے عذاب یاد آ جاتے ہیں اور آپ خوف زدہ ہو جاتے۔

7۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ ایک صحابی ہیں انہوں نے ایک مرتبہ آپ خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا" نجات کا راستہ کیا ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اپنی زبان کو روکے رکھو۔گھر میں بیٹھو اور اپنی خطاؤں پر روتے رہو"۔(گھر میں بیٹھو سے مراد کہ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو)۔(جامع ترمذی)

اس لیے دین کے ہر کمال کے زینے اور حکمت کی جڑ یہ ہے کہ اللہ کے خوف کو دل میں بسا لیا جائے۔توبہ استغفار کا راستہ پکڑا جائے جو ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا انشاء اللہ بیڑا پار ہونے کی امید ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے اور ان تمام باتوں سے سبق سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یا رب العالمین۔

****

عطائے الٰہی

ہر کامیاب انسان اپنی کامیابی کو ذاتی اچیومنٹ سمجھتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر غرور اور تکبر پیدا کر دیتا ہے اور پھر یہاں سے خرابی جنم لیتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہر کامیاب انسان آخر میں تنہا کیوں رہ جاتا ہے؟ تو اسکی وجہ بھی ہی۔ اس لیے کہ دنیا میں تکبر کی سب سے بڑی شکل ''سلف میڈ'' ہے۔ جب کوئی انسان اپنی کامیابی کو سیلف میڈ کا نام دیتا ہے تو وہ نہ صرف اللہ تعالی کی قدرت اور فطرت کی نفی کرتا ہے۔ بلکہ وہ ان تمام انسانوں کے احسانات اور مہربانیوں کو بھی روند ڈالتا ہے جنھوں نے اس کی کامیابی میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اور یہ دنیا کا بدترین تکبر ہوتا ہے۔

فرعون اور نمرود کی مثال ہمارے سامنے ہے- یہ دونوں انتہا درجے کے ذہین، فطین اور باصلاحیت حکمران تھے۔ فرعون نے لاشوں کو محفوظ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اس نے ایک ایسی سیاہی بنوائی تھی جو قیامت تک مدھم نہ ہوتی۔ اس نے ایسے احرام بھی تیار کیے تھے جن کی ہیت آج تک کی جدید سائنس نہ سمجھ سکی۔ اس نے دنیا میں آبپاشی کا پہلا نظام بنایا تھا۔ اور فرعون کے دور میں مصر کے صحراؤں میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ لیکن وہی فرعون بعد ازاں عبرت کا نشان بن گیا کیوں؟؟ اپنے تکبر اور اپنے غرور کی وجہ سے۔ لیکن فرعون کا یہ تکبر ''سیلف میڈ'' لوگوں کے غرور سے چھوٹا تھا۔

اس نے صرف اللہ کی نفی کی تھی۔ وہ اللہ تعالی کے سوا اپنے تمام بزرگوں، اپنے تمام دوستوں اور اپنے تمام مہربانوں کا احسان تسلیم کرتا تھا۔ وہ اپنے استادوں کو دربار میں خصوصی جگہ دیتا تھا۔ وہ اپنی بیویوں کا اتنا احترام کرتا تھا کہ اس نے اپنی اہلیہ محترمہ کے کہنے پر حضرت موسی علیہ السلام کو گود لے لیا تھا۔

اب نمرود کو دیکھتے ہیں۔ نمرود نے کھیتی باڑی کے جدید طریقے ایجاد کروائے۔ اس نے دنیا میں پہلی بار زمین کو یونٹوں میں تقسیم کیا۔ اس نے اونچی اونچی عمارتیں بنوائیں۔ اس نے شہروں میں فوارے لگوائے۔ اس نے دنیا میں پہلی بار درخت کاٹنے کی سزا تجویز کی۔ وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا جس کے ملک سے غربت اور بے روزگاری دور ہوگئی تھی۔ اور جس کی رعایا کا ہر فرد خوشحال اور مطمئن تھا۔ لیکن پھر بھی یہ بادشاہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوا؟ کیوں؟ غرور کی وجہ سے وہ اللہ کے وجود کی نفی کا مرتکب ہوا۔ اور یہ اس کا واحد جرم تھا۔

جبکہ عام زندگی میں وہ ایک اچھا انسان اور شاندار بادشاہ تھا۔ مہمان نواز تھا۔ وہ کبھی بھی شائستگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں دنیا جہان کے عالم اور ماہرین جمع کر رکھے تھے۔ وہ بہادری اور شجاعت میں یکتا تھا۔ وہ اپنے دوست، احباب، ماں باپ اور عزیز رشتہ داروں کا احترام کرتا تھا۔ وہ لوگوں کے احسانات اور مہربانیوں کو یاد رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اللہ کی ذات کی نفی کی خود کو خدا کہہ بیٹھا اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ گیا۔

فرعون اور نمرود نے اللہ کی ذات میں برابری کی تھی جبکہ خود کو ''سیلف میڈ'' کہنے والا شخص نعوذ باللہ وہ صرف اللہ تعالی سے برتری کا دعویٰ کرتا ہے بلکہ وہ دنیا بھر کے لوگوں کے احسانات کو بھی فراموش کر دیتا ہے جنھوں نے اس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ ایسا شخص فرعون اور نمرود کے مقابلے میں کئی گنا بڑے غرور و تکبر کا مرتکب ہے۔ جہاں یہ اخیر میں اللہ تعالی کی پکڑ میں آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو تنہائی کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے ہمارے لیے سب سے بڑی سزا تنہائی ہے۔ انسان بڑے سے بڑا عذاب برداشت کر سکتا ہے لیکن یہ تنہائی کا عذاب برداشت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالی ہماری رگ رگ سے واقف ہے۔ چنانچہ وہ خود کو سیلف میڈ قرار دینے والوں کو تنہائی کی حتمی سزا دیتا ہے۔ ہم غور کر سکتے ہیں کہ دنیا میں جس شخص نے خود کو سیلف میڈ قرار دیا۔ جس نے بھی اپنی ''اچیومنٹس'' کو اپنی ذاتی کوشش، جدوجہد اور محنت کا نتیجہ کہا وہ کامیابی کے آخری سٹیج پر پہنچ کر تنہائی کا شکار ہو گیا اور وہ تنہائی کی موت مرا۔

اس لیے ایسے لوگوں کو اپنے آپ کو سلف میڈ کہنے کے بجائے ''اللہ میڈ'' کہنا چاہیے کیونکہ کامیاب اور کامران لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالی ان لوگوں کو کروڑوں، اربوں لوگوں میں سے کامیابی کے لئے خصوصی طور پر چنتا ہے۔ انہیں ویژن اور آئیڈیاز دیتا ہے۔ ان کو محنت کی طاقت دیتا ہے وہ انہیں دوسرے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ توانائی بخشتا ہے۔ ان کو آگے بڑھنے کے خصوصی مواقع فراہم کرتا ہے۔ ان کے لئے کامیابی کے راستے کھولتا ہے۔ معاشرے کے بااثر اور اہم لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے محبت اور ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ اور آخر میں تمام لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں کو کامیاب تسلیم کر لیں۔ وہ اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کے لیے تالیاں بجائیں۔ اس طرح یہ تمام تر کامیابیاں اللہ کی کامیابی نہ ہوئی؟؟۔ ہم لوگ ہماری ساری کامیابیاں اس کا فضل نہ ہوئیں؟؟

جب کوئی کامیاب شخص اپنی کامیابی کو اللہ کا کرم اور اس کی مہربانی قرار دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں اس کے گرد رونق لگا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے

دلوں میں اس شخص کے لئے محبت ڈال دیتا ہے۔اس طرح یہ شخص زندگی کے آخری سانس تک لوگوں کی محبت اور رونق سے لطف اٹھاتا رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی زندگی پر تنہائی کا سایہ بھی پڑنے نہیں دیتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اس کی کوشش اور جدوجہد کا کیا مقام ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری کیا مجال کے ہم اس کی اجازت کے بغیر محنت کر سکیں۔یہ ہم اس کی مہربانی کے بغیر جدوجہد کر سکیں۔ ہم میں تو اتنی مجال بھی نہیں کہ ہم اس کی مہربانی کے بغیر اس کا نام تک لے سکیں۔پھر ہماری محنت اور ہماری جدوجہد کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے؟ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا کھیل ہے ہم اور ہم سب کی کامیابیاں اللہ کی طرف سے ہیں۔ہمیں اللہ تعالی کے اس کریڈٹ کو تسلیم کرنا چاہیے تا کہ ہماری زندگیاں تنہائیوں سے بچ جائیں اور ہم پر غم کا سایہ نہ پڑ سکے۔

ہمیشہ یہ بات یاد رکھیں کہ اگر زندگی کی ہر کامیابی میں ہم اللہ کے کرم اور مہربانی کو تسلیم کرتے چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت کے سائے ہمیشہ ہمارے سروں پر سایہ فگن رکھے گا۔

جب تک انسان کو اللہ تعالی کی محبت، اس کے کرم، اس کے فضل اور اس کا رحم نظر نہیں آئے گا اس وقت تک انسان کو سکون، آرام، چین، خوشی پر مسرت حاصل نہیں ہوسکتی۔خوشی، خوشحالی اور سکون اللہ کی رضامندی سے منسلک ہے۔جو فرد، جو طبقہ اور جو قوم اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے محروم ہوجاتی ہے۔اس کا سکون، خوشی اور خوشحالی چھن جاتی ہے۔ اس لئے ہر کام اور ہر کامیابی کو اللہ تعالی سے منسوب کر کے عبدیت کا حق ادا کرنے میں ہی انسان کی کامیابی ہے۔

گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

****

ارشادات الٰہی

حضرت داود علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد

1)۔ ''اے داؤد (علیہ السلام)! مجھے اپنی راحت کے دنوں میں یاد کرتا کہ میں مصیبت کے دنوں میں تیری مدد کروں''۔

2)۔ ''اے داؤد (علیہ السلام)! اُن دِلوں میں میرا خوف پیدا کر جو دنیا کی آرزوؤں میں الجھے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں''۔

3)۔ ''اے داؤد (علیہ السلام)! مجھ سے قریب صرف وہ ہی لوگ ہیں جو عاجزی اور انکساری کرنے والے ہیں اور دور صرف اور صرف غرور اور تکبر کرنے والے''۔

4)۔ ''اے داؤد (علیہ السلام)! گناہوں کی بشارت دے (خوف دِلا) اور ڈرا میرے نیک بندوں کو۔ حضرت داودؑ نے کہا اے پروردگا میں گناہوں کی بشارت کِس طرح دوں؟ اور نیک لوگوں کو کیسے ڈراؤں؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اے داود (علیہ السلام)! گناہ گاروں کو اِس بات کی بشارت دو کہ وہ گناہوں سے توبہ کریں میں توبہ قبول کرتا ہوں اور گناہ معاف کر دیتا ہوں۔ اور نیک لوگوں کو اِس طرح ڈراؤ کہ وہ اپنے اعمال پر غرور نہ کریں اِس لیے کہ کوئی بندہ بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ حساب دینے کے لیے قیامت کے دن میرے سامنے کھڑا ہوا اور ہلاک نہ ہو جائے (یعنی عذاب نہ پائے)''۔

5)۔ ''اے داؤد (علیہ السلام)! میرے بندوں سے کہہ دو کہ اگر تم میرے فیصلوں پر راضی نہیں اور میری نعمتوں پر شکر نہیں کرتے اور مصیبت پر صبر نہیں کرتے تو میرے سوا کوئی اور پروردگار تلاش کر لو''۔

6)۔ ''اے داود علیہ السلام! جو بندے بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں اُن کو بقدر ضرورت رزق دیتا ہوں۔ اور بعض اوقات میں اپنے دشمنوں کو مال اور اولاد زیادہ دیتا ہُوں''۔

7)۔ ''اے داود علیہ السلام! تو بھی چاہتا ہے اور میں بھی چاہتا ہوں۔ اگر تو میرے چاہنے پر راضی ہو جائے گا تو میں تیرے چاہنے پر کافی ہو جاؤں گا۔ اگر تو میرے چاہنے پر راضی نہ ہوگا۔ تو میں تجھے تیرے چاہنے میں پھنسا دوں گا اور پھر وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں''۔

''اے اولاد آدم علیہ السلام! بچے پیدا کر موت کے لئے۔ مال جمع کر فنا کے لیے عمارتیں تعمیر کر برباد ہونے کے لئے''۔

(جامع الاخبار ایک اقتباس)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا خطاب:

1)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! اپنے دل کو خشیت الٰہی سے جھکا دے اور اپنے سے کمتر شخص کی طرف نگاہ رکھ اور اپنے سے بہتر شخص کی طرف مت دیکھ اور جان لے کہ ہر برائی اور گناہ کی بنیاد دنیا کی محبت ہے۔ پس تو دنیا سے محبت نہ کر کیونکہ میں بھی دنیا سے محبت نہیں رکھتا''۔

2)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! میری خشیت سے اپنے دل کو پاکیزہ بنا اور اپنی تنہائیوں میں میرا ذکر کیا کر اور جان لے کہ میری خوشنودی عجز و انکساری میں ہے''۔

3)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! کسی کو میرا شریک نہ بنا اور مجھ سے ہمیشہ ڈرتا رہ اور اپنی صحت پر غرور نہ کر اور اپنے اوپر نہ اترا۔ اور دنیا سے اِتنا لے جو تیرے لیے کافی ہو''۔

4)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! یہ دنیا اپنی طرف رخ کرنے والوں کو فریب دیتی ہے۔ اور پھر پیٹھ پھیر کر پریشان کرتی ہے۔ پس اپنی کوششوں کو نیک کاموں میں صرف کر''۔

5)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! حق جہاں بھی ہو ہمیشہ اُس کا ساتھ دے۔ اگرچہ تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ یا تو آگ میں جلا دیا جائے''۔

6)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! میری معرفت کے بعد میرا انکار نہ کر اور جاہلوں میں شامل نہ ہو''۔

7)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! اپنی زبان سے میرا ذکر زندہ اور جاری رکھ اور میری محبت کو اپنے دل میں قائم کر''۔

8)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام)! اپنی آنکھ میں حزن اور ملال کی سیاہی سے سرمہ لگا اگرچہ باطل پرست تیرا مذاق اڑائیں''۔

9)۔ اے عیسٰی (علیہ السلام)! تجھ سے باز پرس کی جائے گی لہٰذا تو کمزوروں پر اِس طرح رحم کر جیسا کہ میں تم پر رحم کرتا ہوں۔ اور یتیم پر غضب ناک نہ ہو۔

10)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام) ! اگر میں تجھ پر غضب کروں تو کسی کی رضا مندی تجھے فائدہ نہ دے گی اور اگر میں تجھ سے راضی ہو جاؤں تو غضب کرنے والوں کا غضب تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔

11)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام) ! دنیا کی عمر بہت کم ہے۔ مگر دنیا لمبی آرزوؤں کی جگہ ہے اور لوگ (یہاں) جو کچھ مال وغیرہ جمع کرتے ہیں اِن سے میرے خزانے بہت بہتر ہیں''۔

12)۔ ''اے عیسٰی (علیہ السلام) ! میرے پاس آرام و آسائش کا سامان ہی سامان ہے۔ جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اور جس کو یہ دیا جائے گا۔ اُس سے کبھی واپس نہیں لیا جائے گا نہ اُس سے چھینا جائے گا تو تم انسانوں سے کہہ دو کہ اِس مال کو حاصل کرنے کی کوشش کریں''۔ (جامع الاخبار ایک اقتباس)

قرآن پاک میں اللہ تعالی نے یہی تمام باتیں مومنین کو مخاطب کر کے بار بار سمجھائی ہیں۔ رب تعالی کا ایک انداز ہے۔ وہ تمام مخلوق سے شفقت کرنے والا سب پر رحم کرنے والا۔ سب کا ہمدرد۔ عفو و درگزر کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا اُس کی صفات کا احاطہ کرنا مخلوق کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ اُس نے ایک ایک بات کو انتہائی موثر انداز میں انسانوں کو بتا کر حجت تمام کر دی ہے اور انسان کو مکلف بنا دیا۔ اَب چاہے اپنے ارادے اور اختیار سے رب کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو یا شیطان کی پیروی کرے۔

قرآن پاک سورۃ بقرہ آیت نمبر 44

ترجمہ: "اور تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے "۔

سورۃ بقرہ آیت نمبر 148

ترجمہ: ''ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔ جہاں بھی تم جاؤ گے۔ اللہ تمھیں پائے گا اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں''۔

سورۃ بقرہ آیت نمبر 174

ترجمہ: ''حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں۔ اور تھوڑے سے دنیاوی فائدوں پر انھیں بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں''۔

سورۃ بقرہ آیت نمبر 219

ترجمہ: ''پوچھتے ہیں کہ شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کیلئے کچھ منافع بھی ہے۔ مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے''۔

سورۃ آل عمران آیت نمبر 105

ترجمہ: " کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا۔ جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی اور واضح ہدایت پانے کے (باوجود) پھر اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے"

سورۃ آل عمران آیت نمبر 200

ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر سے کام لو۔ اور باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ۔ حق کی خدمت کیلئے کمر بستہ رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔

سورۃ النساء آیت نمبر 14

ترجمہ: "اور جو اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین ﷺ کی نافرمانی کرے گا۔ اور اس کی مقرر کی گئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا۔ اسے اللہ تعالیٰ آگ میں ڈالے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے"۔

سورۃ النساء آیت نمبر 112

ترجمہ: "پھر جس نے کوئی خطا یا کوئی گناہ کر کے اُس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا تو اُس نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا"۔

سورۃ النساء آیت نمبر 123

ترجمہ: "انجام نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر جو بُرائی کرے گا اس کی (سزا) پھل پائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پائے گا"۔

سورۃ النساء آیت نمبر 135

ترجمہ: "اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار، اللہ کے بندے اور گواہ بنو۔ اگرچہ انصاف اور تمھاری گواہی کی زد تمھاری اپنی ذات یا تمھارے والدین اور رشتہ دار پر ہی کیوں نہ پڑے"۔

سورۃ المائدہ آیت نمبر 72

ترجمہ: "جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں"۔

سورۃ المائدہ آیت نمبر 90

ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب گندے اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی"۔

سورۃ المائدہ آیت نمبر 91

ترجمہ: "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے۔ اور تمھیں اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز آؤ گے؟"

سورۃ المائدہ آیت نمبر 105

ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اپنی فکر کرو دوسروں کی گواہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔ اور اللہ ہی کی طرف تم لوگوں کو پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تمھیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے ہو؟"۔

سورۃ الانعام آیت نمبر 50

ترجمہ: "اے محمد (خاتم النبیین ﷺ) ان سے کہو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو کچھ مجھ پر نازل ہوتی ہے"۔

سورۃ الانعام آیت نمبر 119

ترجمہ: "اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں اور یقیناً حد سے گزرنے والوں کو تمھارا رب خوب جانتا ہے"۔

سورۃ الانعام آیت نمبر 120

ترجمہ: "تم کھلے اور چھپے گناہوں سے بچو۔ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے"۔

سورۃ الانعام آیت نمبر 151

ترجمہ: "اے محمد (خاتم النبیین ﷺ) ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور اُنہیں بھی دیں گے اور بے

شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں''۔

سورۃ الانعام آیت نمبر 159

ترجمہ: "جن لوگوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ بن گئے۔یقیناً ان سے تمھارا کچھ واسطہ نہیں ان کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے؟"

سورۃ الانعام آیت نمبر 162

ترجمہ: '' کہو میری نماز، میرے تمام مراسم، عبودیت، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔جس کا کوئی شریک نہیں ہے''۔

سورۃ الاعراف آیت نمبر 194

ترجمہ: "تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہو وہ محض بندے ہیں۔جیسے تم بندے ہو۔ان سے دعائیں مانگ کر دیکھو۔یہ تمھاری دعاؤں کا جواب دیں۔اگر ان کے بارے میں تمھارے خیالات صحیح ہیں"

سورۃ الانفال آیت نمبر 20 تا 21

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (خاتم النبیین ﷺ) کی اطاعت کرو۔اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا ہم نے سنا۔حالانکہ وہ نہیں سنتے"

سورۃ الانفال آیت نمبر 22

ترجمہ: "یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے اور گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے"

سورۃ یونس آیت نمبر 66

ترجمہ: '' آگاہ رہو آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے سب کے سب اللہ کی مخلوق ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا اللہ کے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ صرف وہم وگمان کے پیروکار ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں''۔

سورۃ یونس آیت نمبر 107

ترجمہ: "اور اگر اللہ تجھ کو کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے۔اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو ختم کرنے والا بھی کوئی نہیں"

سورۃ ھود آیت نمبر 112,113

ترجمہ: ''جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمھارے رب کی نگاہ ہے۔ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔اور پھر کہیں سے تم کو مدد نہیں پہنچے گی''۔

سورۃ ابراہیم آیت نمبر 2 تا 3

ترجمہ: ''اور سخت تباہ کن سزا ہے۔جو قبول حق سے انکار کرتے ہیں۔ان کے لیے۔جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں''۔

سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 36

ترجمہ: '' کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے''۔

سورۃ کہف آیت نمبر 110

ترجمہ: "اے محمد (خاتم النبیین ﷺ) کہو میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے"

سورۃ کہف آیت نمبر 17

ترجمہ: ''یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے۔ اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے''۔

سورۃ فرقان آیت نمبر 03

ترجمہ: لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں۔ جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ جو اپنے لیے کسی بھی نفع یا نقصان کا ذرا اختیار نہیں رکھتے۔ نہ مار سکتے ہیں۔ نہ جلا سکتے ہیں۔ نہ مرے ہوئے کو اٹھا سکتے ہیں''۔

سورۃ فرقان آیت نمبر 72

ترجمہ: ''اور رحمان کے بندے وہ ہیں وہ جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں''۔

سورۃ الروم آیت نمبر 32 ,31

ترجمہ: ''اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے جنھوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اس میں مگن ہے''۔

سورۃ لقمٰن آیت نمبر 18 تا 19

ترجمہ: ''اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر۔ نہ زمین میں اکڑ کر چل اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو اور اپنی آواز پست رکھ۔ بیشک سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہے''۔

سورۃ الاحزاب آیت نمبر 45 تا 46

ترجمہ: "اے نبی ہم نے تم کو بھیجا گواہ بنا کر بشارت دینے والا، اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور اللہ کی طرف سے دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ"

سورۃ الاحزاب آیت نمبر 70 تا 71

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کرو۔ اللہ تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول (خاتم النبیین ﷺ) کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی"

سورۃ فاطر آیت نمبر 29

ترجمہ: "جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں۔ ان کو ایک ایسی تجارت کی امید ہے جو ہرگز خسارہ نہ دے گی"-

سورۃ المؤمن آیت نمبر 58

ترجمہ: ''اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائے اور ایمان دار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو''۔

سورۃ المومن آیت نمبر 60

ترجمہ: "تمھارا رب کہتا ہے۔ مجھے پکارو میں تمھاری دعاؤں کو قبول فرماؤں گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہونگے"

سورۃ حٰمٓ سجدہ آیت نمبر 40

ترجمہ: "جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں۔ وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو آیا وہ شخص بہتر ہے۔ جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے۔ یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟"

سورۃ الاحقاف آیت نمبر 5

ترجمہ: ''آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا شخص کون ہوگا؟ جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کو پکارتے ہیں جو قیامت تک انھیں جواب نہیں دے سکتے۔ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ کوئی پکارنے والا انھیں پکار رہا ہے''۔

سورۃ محمد آیت نمبر 36

ترجمہ: "یہ دنیا کی زندگی تو کھیل تماشہ ہے اگر تم ایمان رکھو اور تقوی کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمھارے اجر تم کو دے گا۔ اور وہ تمھارے مال تم سے نہ مانگے گا"

سورۃ الحجرات آیت نمبر 6

ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔ پس ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر پشیمان ہو"

سورۃ الحجرات آیت نمبر 11

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو''۔

سورۃ الحجرات آیت نمبر 12

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو۔ کہ بہت سے گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے''۔

سورۃ نجم آیت نمبر 39 تا 41

ترجمہ ''اور یہ کہ انسان کیلئے کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔ اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی۔ اور اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی''۔

سورۃ حدید آیت نمبر 23

ترجمہ: '' کچھ بھی تمھیں نقصان ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ تمھیں اللہ تعالیٰ عطا فرمائے۔ اس پر پھول نہ جاؤ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں''۔

سورۃ منافقون آیت نمبر 09

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں''۔

سورۃ الملک آیت نمبر 02

ترجمہ: ''اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ تا کہ دیکھے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔ وہ زبردست درگزر کرنے والا ہے''۔

سورۃ القلم آیت نمبر 10 تا 13

ترجمہ: ''ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو قسمیں کھانے والا، بے وقتہ، طعنہ دینے والا، چغلیاں کھانے والا، بھلائی سے روکنے والا، ظلم اور زیادتی میں حد سے گزر جانے والا سخت بداعمال اور ریاکار ہے''۔

سورۃ القیامۃ آیت نمبر 3 تا 5

ترجمہ: '' کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو بے شک اس کی انگلیوں کے پور پور تک ٹھیک بٹھا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے''۔

سورۃ المجادلہ آیت نمبر 9

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو۔ تو گناہ اور زیادتی اور رسول خاتم النبیین ﷺ کی نافرمانی کی باتیں نہ کرو۔ بلکہ نیکی اور تقوی کی باتیں کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمھیں پیش ہونا ہے''۔

سورۃ البینۃ آیت نمبر 5

ترجمہ: ''اور اُن کو اُس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں۔ اپنے دین کو اس کے لیے خاص کر کے بالکل یک سو ہو جائیں۔ اور نماز قائم کریں۔ اور زکوٰۃ ادا کریں۔ یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے''۔

سورۃ التکاثر آیت نمبر 1 تا 2

ترجمہ: ''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھن میں تم قبر کے دھانے تک پہنچ جاتے ہو''۔

سورۃ الھمزۃ آیت نمبر 1 تا 2

ترجمہ: ''تباہی ہے ہر اس شخص کیلئے جو (منہ در منہ لوگوں پر طعن اور پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور گن کر رکھا''۔

سورۃ الماعون آیت نمبر 4 تا 7

ترجمہ: ''تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کیلئے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو ریا کاری کرتے ہیں۔ اور معمولی ضرورت کی چیزوں کو لوگوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں''۔

مندرجہ بالا قرآنی آیات کا اگر بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب میں فرمایا ہے۔ اُس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر قرآن پاک میں بیان فرما دی ہے۔

پس ایک مومن اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور دل و دماغ کو حاضر و ناظر جان کر غور کرے تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ عافیت صرف اور صرف رضائے الٰہی میں ہے۔ یاد رکھیں کہ ایمان صرف زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی ہستی کو اپنی زندگی بنا لینے کا نام ہے۔ رسمی عبادات اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو بندے کی محبت اور سیرت دیکھتا ہے۔ اس لیے بدنصیب وہ نہیں جس کو یہ فانی دنیا نہیں ملی بدنصیب تو وہ ہے جس کو وہ ابدی دنیا نہیں ملی۔

قرآن پاک میں بخشش کی تمام تر یا دد ھانی اس بات پر ہے کہ ایمان لاؤ۔ اعمال صالح کرو۔ گناہ ہو جائے تو توبہ کرو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھو۔

اللہ کے حضور کسی شخص کا فیصلہ اس کے علم کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ اس کے عمل، اس کے اخلاص، اس کی سیرت و کردار اور اس کی شخصیت کی بنیاد پر ہوگا۔ اور خاص عبادات و اطاعت کے بعد اس بات سے ڈرتے رہنا چاہیئے کہ نہ معلوم کوئی عمل ایسا تو نہیں ہو گیا کہ یہ عبادات اکارت جائیں۔ اپنی عبادات پر اترانے کے بجائے اپنی نظر اس کے فضل پر رکھی جائے اگر فضل ہوا تو کام بن جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ عدل ہوا تو بندہ مارا جائے گا۔

کیونکہ جیسی اطاعت اور عبادات ہم کرتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم و فضل ہی سے قبول کرے تو کرے۔ اگر یہ سوال کر دیا کہ بندے اپنی زندگی کی نمازوں سے کوئی ایسا سجدہ بتا دے جس میں تو سو فیصد میری طرف متوجہ تھا۔ تو ہم جیسوں کے پاس ایک سجدہ بھی نہ ہوگا۔

(انبیاء کرام علیہ السلام اور اولیاء کرام کی بات اور ہے)۔ ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں قرآن پاک کی ہدایت اور حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

روح سورج کی طرح، جسم اُجالے کی مثال
کیسے الفاظ میں ڈھالوں میں وہ تصویر جمال؟
ذِکر اُس نور مُجسم کا ہے کرنا مقصود
مالک لوح و قلم تو میرے لفظوں کو اُجال

****

اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے

اللہ تعالی کی عظمت و بڑائی کا وجود پر طاری ہوجانا ہی ایک مومن کی پکی نشانی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ایک بہت ہی اہم روایت بیان کی گئی ہے جسے عام زبان میں حدیث جبرائیل علیہ السلام کہا جاتا ہے۔

اس حدیث میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک اجنبی کے روپ میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب صحابہ کرام رضی اللہ بھی موجود تھے۔ اس اجنبی نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو سلام کیا اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پوچھا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ اسلام کیا ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کے اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے، محمد خاتم النبیین ﷺ اس کے رسول برحق ہیں، اسکے ساتھ نماز پڑھنا، زکوۃ دینا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور اگر استطاعت ہوتی ہے تو حج کرنا یہ اسلام ہے"۔ اس شخص نے کہا" آپ خاتم النبیین ﷺ نے سچ کہا"۔ صحابہ کرام رضی اللہ کا بیان ہے کہ ہم حیران ہوئے کہ یہ شخص سوال بھی کرتا ہو اور پھر جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس نے دریافت کیا" مجھے یہ بتایئے کہ ایمان کیا ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور یہ کہ اچھائی اور برائی کو مقرر کر دیا گیا ہے"۔ اس شخص نے کہا" آپ خاتم النبیین ﷺ نے ٹھیک فرمایا ہے"۔ اس کے بعد اس شخص نے سوال کیا" احسان کیا ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اللہ تعالی کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ کیفیت نہیں بن پاتی تو یہ بن جائے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔ اس شخص نے کہا" آپ خاتم النبیین ﷺ ٹھیک کہتے ہیں"۔ اس کے بعد اس شخص نے سوال کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ قیامت کب آئے گی؟" آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اس بارے میں مجھے تم سے زیادہ علم نہیں ہے"۔ پھر اس شخص نے کہا" قیامت کے کچھ علامات بیان فرما دیجئے"۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" لوگ زیادہ سے زیادہ لونڈیاں رکھیں گے۔ (کثرت عیش کی طرف اشارہ ہے)، مفلس، نادار اور بھوکے ننگے لوگ اتنے مالدار ہوجائیں گے کہ اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے"۔ اتنا سننے کے بعد اجنبی اٹھا اور واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ خاتم النبیین ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ سے پوچھا" تم جانتے ہو وہ کون تھا"۔ حضرت عمر رضی اللہ نے جواب دیا" اللہ اور اس کا رسول خاتم النبیین ﷺ جانتے ہیں"۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" یہ جبرائیل علیہ السلام تھے تمہیں دین سکھانے کے لیے آئے تھے"۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث میں دین کے بنیادی حقائق کا ایک نہایت جامع بیان ہے وہ یہ کہ ایمان عقیدے کا نام ہے، اسلام عمل کا اور احسان اخلاص کا- اس لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ اس مقام احسان یا مقام اخلاص کو تصوف یا روحانیت اور طریقت کا نام دیتے ہیں۔ اس مکالمے میں جب حضرت جبرائیل علیہ سلام سوال کرتے ہیں کہ "احسان کیا ہے؟" تو جواب میں رسول پاک خاتم النبیین ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ" اللہ تعالی کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو کم سے کم ایسے عبادت کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔ احسان کی یہ تعریف حقیقی معنوں میں اس بات کا ایک مکمل اور جامع بیان ہے کہ بندہ مومن کے حسن عمل کی اساس کیا ہے؟ (بنیاد کیا ہے؟)۔ یہ اساس اس احساس کے ساتھ جینا ہوتا ہے کہ بندہ رب کے اور رب بندے کے ساتھ ہے۔ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے قرب الہی کے اس تجربے کو بلاغت کی انتہا پر پہنچاتے ہوئے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ بندہ مومن تو اس طرح بندگی کی زندگی جیتا ہے۔ گویا کہ رب کریم ہر وقت اسکی نگاہوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ رب تعالیٰ وہ ہستی ہے کہ اس کو ہماری یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اب ایسی صورت میں جبکہ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں تو قربت الہی کو تازہ رکھنے کا دوسرا راستہ اس بات کا یقین ہے کہ بندہ خالق کو نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا؟ خالق تو اپنے بندے کو دیکھ رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔

اس بات کی وضاحت موجودہ صدی میں ان کیمروں سے کی جاسکتی ہے جو آج کل بڑی بڑی دکانوں، بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز، اہم عمارات اور بنکوں وغیرہ میں لگائے جاتے ہیں۔ ان تمام جگہوں پر خریداری کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ بڑا ہی آسان کام ہے کہ کسی بھی قیمتی مگر چھوٹی چیز کو اپنے کپڑوں میں چھپالے گا اپنے پرس وغیرہ میں ڈال لے۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے دوکاندار یہ نگرانی والے کیمرے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان دوکانوں پر جگہ جگہ ایک جملہ لکھا ہوا ہوتا ہے" خبردار کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی ہے"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بری نیّت سے آنے والے حضرات کو یہ احساس کہ کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی ہے اسے چوری کرنے سے روک دیتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کسی کو دیکھے یا اسے احساس ہوجائے کہ کوئی اس کو دیکھ رہا ہے دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔

بالکل یہی بات حدیث جبرائیل علیہ السلام میں ''احسان'' کے حوالے سے سمجھائی گئی ہے۔ کہ اللہ تعالی کا بندے کو دیکھتے رہنا حسن عمل کے پہلو سے بندے کا اللہ تعالی کو دیکھتے رہنے کے برابر ہے۔ یہ چیز نہ صرف انسان کو برے عمل سے روک دیتی ہے بلکہ اس کی عبادت اور عمل صالح میں خوبصورتی، کمال اور اخلاص پیدا کرتی ہے۔

بندہ جس کے لیے کام کرتا ہے ہمہ وقت خود کو اس کے سامنے سمجھتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالک کو نہیں دیکھ پا رہا تو کیا ہوا اس کا مالک تو اس کو دیکھ رہا ہے۔

جس شخص میں ایمان کی زندگی موجود ہے، جس کے وجود پر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی کا غلبہ ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اللہ تعالی کی معیت (ساتھ) کا زندہ تجربہ کر سکتا ہے۔

مگر افسوس کے خالق کائنات کی عظمت کا ادراک اور اپنی عاجزی کی ہر شکل کا احساس رکھنے والا یہ انسان اپنے مالک و خالق و رب سے بے پرواہو جاتا ہے۔ یہ کیمرے کی آنکھ سے تو ڈرتا ہے اور رب تعالیٰ کے سمیع اور بصیر ہونے کو بھی خوب جانتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ احساس اپنے اوپر طاری نہیں کرتا کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مقصد حیات کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی کہانی کے صرف اس حصے سے واقف ہے جو آج اس کے سامنے ہے۔ یعنی اس کے سامنے صرف اور صرف یہ دنیا ہے۔ اس دنیا کی خوشیاں، اس دنیا کے غم، اس کی لذتیں، اس کی تلخیاں، اس کی آسائشیں، اس کے مسائل، اس کی نصیحتیں، اس کی محرومیاں، اس کو پانا اور اس کا کھونا۔

آج دنیا پرستی کے فتنہ نے ہمیشہ سے بڑھ کر انسان کو اپنی منزل مقصود اور اس تک پہنچنے والے صراط مستقیم سے غافل کر دیا ہے۔ اس کی توجہ صرف اور صرف دنیا ہے۔ مجھے پیسہ کمانا ہے تا کہ اچھا سا گھر بنا سکوں، مجھے پیسے کمانے ہیں تا کہ میری شادی اچھی جگہ ہو سکے، میں نے پیسہ کمانا ہے تا کہ میرے بچے اچھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ تا کہ معاشرے میں مجھے باوقار مقام مل جائے۔ یہ باتیں آج ہمارے معاشرے کے ہر فرد کا نصب العین ہیں۔

ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے آج کا انسان ہر حد کو توڑ دیتا اور ہر اصول کو نظر انداز کر دیتا ہے، اور قدر کو پامال کر دیتا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں ہوتا کہ ایک وقت اسے مرنا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں ہوتا تو اس کی قبر اس کی منتظر ہے اور یہ کہ حشر کے روز اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔ اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور پھر زندگی میں کئے گئے ہر نیک و بد کا حساب دینا ہے۔ جس کی جگہ ابدی جنت یا خدانخواستہ جہنم ہوگی۔

یاد رکھیں اس دنیا میں ہم ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں یا سائنسدان ہیں لیکن کل کی دنیا میں یا تو ہم جیتنے والے ہیں یا پھر ہارنے والے ہیں۔ دنیا میں اپنی ضروریات، سہولتیں اور آسائشوں کے لیے جدوجہد کرنا جرم نہیں ہے۔ جرم یہ ہے کہ انسان دنیا کیلئے کوشش کرتے وقت اپنی آخرت کو بھول جائے۔ وہ اس ہستی کو نظر انداز کر دے جس نے ہمیں عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا تھا۔

ہمیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جنت کے مسافر اس دنیا میں راستے کی رنگینیوں میں الجھ کر کبھی اپنی منزل کھویا نہیں کرتے۔ وہ ہر گھڑی اپنے نفس کا مقابلہ کرتے ہیں اور پھر وہ اپنے نفس کو پاک کر لیتے ہیں۔ اور نفس کی پاکیزگی کسی کو غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ شاہراہ زندگی کو چھوڑ کر مسائل زندگی سے فرار اختیار کر کے یہ پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ پاکیزگی تو زندگی میں پیش آنے والے ہر اچھے اور برے حالات میں تقوی اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ پاکیزگی ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے جڑے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے لیے کسی کو نیکوکار ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ ماضی کی وفاداری کا کوئی ریکارڈ پیش کرنا ہوتا ہے۔ صرف اور صرف اپنے اضطرار، حرف یقین ہو کہ صرف تو ہی دینے والا ہے، تو ہی دے سکتا ہے، اور تو ہی مجھے دے گا۔ اور صرف یہ عزم کے بندہ آئندہ اپنے رب کا شکر گزار رہے گا۔ اسے مستحق بنانے کے لیے کافی ہے۔ تو سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ میرا مالک و خالق ہی بڑا رب ہے۔ اور وہ زندگی کے ہر قدم پر میرے ساتھ ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوتا ہے، انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اگر حاصل تمنا سے زیادہ ہو تو سکون کا باعث بن جاتا ہے۔ اسلئے کم آرزو والے انسان ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں۔ بلکہ کثرت پرست سوچ، تفکر اور تدبر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انسان کی پہچان کے لئے اللہ تعالی نے اس دنیا کو آسمان اور زمین کے حوالے سے ظاہر کیا ہے۔ انسان اپنی ہستی کا سفر زمین پر شروع کرتا ہوں اور یہ سفر زمین پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ زندگی اس کے علم کے وسیع اسباب ہیں۔ انسان کو علم الاسماء عطا کیا گیا ہے۔ وہ " آسماء" اشیاء کو پہچانتا ہے۔ پھر اشیاء سے مفاہم تلاش کرتا ہے۔ انسان رب کائنات کی بہترین تخلیق ہے۔ اس لیے انسان کی مختصر سی ہستی میں لامحدود امکانات موجود ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ علم کی کمند پھینک کر تماشائے صفات باری تعالی کے ساتھ ساتھ مشاہدہ ذات بھی کر سکتا ہے۔ تماشہ صفحات وہ آنکھ کا کام ہے جس میں علم سے نور پیدا ہو۔ جب کہ مشاہدہ ذات اس آنکھ کا کام ہے جو صرف

اور صرف عشق سے کھلتی ہے۔

انسان کو شرف عطا کرنے والے نے انسان کو علم عطا کیا، کائنات کی اشیاء کا علم، اس کائنات کی زندگی اور اس کائنات کے حسن کا علم۔ یہ کائنات ایک آئینہ ہے۔ اس میں ہر طرف انسان کی اپنی صفات پھیلی ہوئی ہیں۔ ہمیں رب تعالی پر نظر رکھنی چاہیے پھر اگر یہ بات نہ بن پائے تو یہ یقین کامل ہونا چاہیے کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ مجھے کچھ کہہ رہا ہے مجھے اس کو نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ مجھے اس کی ہر بات کو ماننا ہے اس میں میری بھلائی اور میری عافیت ہے۔ مالک کا حکم نہ مانے تو بڑے بڑے حکم ماننے پڑھتے ہیں۔ اس کی اطاعت نہ کرنے سے بڑی بڑی اطاعتیں کرنی پڑتی ہیں۔

لیکن افسوس! اس کو سجدہ کرنے کے بجائے ہم اپنی آرزوؤں کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ انسان اگر غور کرے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فنا کے دیس میں بقا کا مسافر ہے۔ انسان غور کرے سوچے تو سہی کے مالک نے کس کس طرح اس پر کیا کیا احسانات کئے ہیں؟ مالک نے یہ دنیا کسی کے لیے بنائی ہے؟ یہ دنیا کی تمام اشیاء کس کے استعمال کے لیے بنائی ہیں؟ یہ دریا رواں کیسے ہیں؟ یہ چشمے کیوں ابل رہے ہیں؟ یہ سمندر ساکن کیوں ہے؟ آنکھ بنانے والا خود کتنا بصیر ہوگا؟ ہر ایک کو بنانے والا خود کیسی سماعت رکھتا ہوگا؟ کسی انسان کی شکل دوسرے انسان سے نہیں ملتی۔ کسی ایک درخت کا ایک پتہ دوسرے درخت کے پتے سے نہیں ملتا۔ ہاتھی کو بنانے والا ہی چیونٹی کو بنانے والا ہے۔ دماغ کو بنانے والا خود کیسی عقل رکھتا ہوگا؟ اس ایک لامحدود عقل جس کا تصور ہی محال ہے۔ خالق کائنات ہم تیری عظمت کی گہرائیوں کو پا ہی نہیں سکتے ہم زمین پر رہتے ہیں ہم اپنی پیشانی زمین پر رکھتے ہیں اور ہمیں جواب آسمان سے آتا ہے۔ وہ خالق اور مالک تو ہماری شاہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ ایک ہم ہیں کہ بس ہمیں دنیا مانگنے کا ہی سلیقہ آتا ہے۔

تمثل:-

ایک شخص رات کے وقت عبادت میں مصروف تھا اس نے ایک نورانی ہالہ اپنے قریب محسوس کیا۔ اس کے دل نے کہا" یہ فرشتہ ہے"- اس شخص نے بلند آواز سے کہا" اگر تم فرشتے ہو تو میری کچھ دعائیں اللہ تعالی تک پہنچا دو"۔ فرشتے نے جواب دیا" بتاؤ"۔ اس آدمی نے اپنی دعائیں بتانی شروع کیں۔ فرشتہ کچھ دیر تو خاموش رہ کر یہ دعائیں سنتا رہا آخر اس نے کہا" بس بس میں سمجھ گیا"۔ اس آدمی نے کہا" کیا سمجھ گئے میں نے تو ابھی اپنی دعائیں پوری بتائی ہی نہیں ہیں"؟ فرشتے نے کہا" میں رب تعالی سے کہہ دونگا مالک تیرا فلاں بندہ تیرے سوا دنیا کی ہر چیز کی تمنا کرتا ہے"۔

تو ہم مانگتے ہیں تو دنیا ہی مانگتے ہیں۔ خواہشات کا انبار اپنے سامنے رکھتے ہیں اور پھر شکوہ کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہمیں سکون عطا فرما۔

زمین والے آسمان والے سے اگر تعلق نہ رکھیں تو آسمان کی گرفت میں ہیں۔ یہی زمین والے اگر اسکے ہو جائیں تو آسمان کی وسعتیں ہمارے گرد و پا ہو جائیں۔ اللہ کے محبوب زمین پر ہوں تو آسمان ان پر نثار اور اگر اللہ تعالی کے باغی چاند پر بھی پہنچ جائیں تب بھی گرفت میں ہے شدید گرفت میں۔

اس دنیا کا ہر رنگ عارضی ہے۔ ہر حال میں ختم ہونے والا ہے۔ ہر حاصل محرومی اور ہر ہونا نہ ہونا۔ یہ دنیا اور اس دنیا کا ہر روپ عارضی ہے۔ زندگی کا یہ قافلہ ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ راج ان انسانوں پر آشکار ہوتا ہے جو یہ جان لیں گے رب ہمیں دیکھ رہا ہے پھر وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ" اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا"۔ رب تعالیٰ سے ڈرنے والا اس کی ذات کو ہر وقت اپنی نگاہ میں رکھنے والا اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ یہ دین صرف اور صرف سچے انسانوں کا ہے۔ یہ سچ کا راستہ ہے۔ اسی راستے کو قرآن پاک میں صراط مستقیم کہا ہے۔ یاد رکھیں اعمال صالح ہی ہمارے خوبصورت اثاثے ہیں۔ اعمال صالح رکھنے والا انسان خوبصورت دل رکھتا ہے۔ وہ اپنے ہر ہر عمل کو اللہ کی رضا، اس کی خوشنودی، اور اس کی عظمت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کرتا ہے۔ وہ عبادت اور خدمت کے مفہوم سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ عبادت اللہ کی اور خدمت اللہ کے بندوں کی پھر یہ خوبصورت احساسات کا مالک ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالی سے ڈرنے والا، اللہ کی ذات کو اپنی زندگی بنا لینے والا ہی اللہ کی نگاہوں کو ہر دم اپنی ذات پر فوکس محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ کتاب قانون ہے پہچان کا۔ لیکن پہچان کتاب کی نہیں کتاب بھیجنے والے کی ہونی چاہیے۔ ہمیں علم کی پہچان نہیں علم بھیجنے والے کی پہچان درکار ہے۔ ہمیں نورانی علم چاہیے سراسر رحمان کا علم۔ وہ علم جو ہماری نگاہوں اور ہمارے دل کو مالک کائنات کی ذات پر مرکوز کر دے۔ ہمیں خود آگاہی نصیب کر دے۔ علم اگر خود آگاہی کے قریب کر دے تو نور ہے ورنہ حجاب۔ زیادہ جاننے کا غرور اگر نہ جاننے کی عاجزی میں بدل جائے تو حجاب اٹھ جاتا ہے۔ علم کا منشاء اگر رضائے حق ہے، حصول حق ہے تو نور ہے بلکہ نور علی نور ہے۔

یاد رکھیں اللہ کی حضوری میں ہر وقت جینے کا نام ایمان، اور اللہ تعالی کو ہر وقت نگاہوں میں رکھنے یا اللہ کی نگاہوں کو ہر وقت اپنے اوپر محسوس کرنے کا نام" احسان" ہے۔

تم آج خیر پر ہو

فراخی دنیا کی اطلاع آپ خاتم النبیین ﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی۔

1) امام احمد اور حاکم نے صحیح بتا کر اور بیہقی نے طلحہ نصریؓ سے روایت کی ہے کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" تم بہت جلد ایسے زمانے کو پاؤ گے کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس صبح کو ایک کھانا اور شام کو دوسرا کھانا آئے گا۔ اور تم ایسا لباس پہنو گے جیسے خانہ کعبہ کا غلاف" (مخمل۔مخملی لباس یعنی قیمتی لباس) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ! ہم آج خیر پر ہیں یا اس وقت خیر پر ہوں گے"؟ فرمایا" نہیں بلکہ تم آج خیر پر ہو۔ آج تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور اس وقت تم ایک دوسرے سے بغض رکھو گے اور ایک دوسرے کی گردن مارو گے"۔

2) شیخین نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" کیا تمہارے پاس نقشین فرش نہیں"؟ میں نے عرض کیا" یا رسول خاتم النبیین ﷺ ہمارے پاس نقشین فرشی کہاں سے آئے"؟ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" عنقریب تمہارے پاس نقشین فرش ہوں گے"۔ حضرت جابرؓ نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد فرمایا" آج میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ ان نقشین فرش کو مجھ سے دور رکھو"۔ تو وہ یہ کہتی ہے" کیا رسول خاتم النبیین ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میرے بعد تمہارے پاس نقشین فرش ہوں گے"۔

3) ابونعیم نے عبداللہ بن یزید سے روایت کیا ہے" انہیں کسی دعوت پر مدعو کیا گیا جب وہ اس گھر میں آئے تو انہوں نے دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے دیکھے تو وہ باہر بیٹھ کر رونے لگے۔ کسی کے پوچھنے پر بتایا کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا تھا" یہ دنیا تمہاری طرف امڈ کر آئے گی"۔ اور یہ بات تین مرتبہ فرمائی تھی۔ پھر فرمایا" تم آج اچھے ہو اس وقت سے جب تمہارے پاس صبح کو ایک کھانا آئے گا اور شام کو دوسرا۔ تم صبح کو ایک لباس پہنو گے اور شام کو دوسرا۔ اور تمہارے گھروں کی دیواروں پر ایسے پردے پڑے ہوں گے جیسے کعبہ پر پردہ پڑا ہوتا ہے"۔

4) ابونعیم نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم لوگوں کو قحط سالی نے کھا لیا ہے"۔ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" میں قحط سالی کے سوا اس بات سے تم پر ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا ہر طرف سے امڈ آئے گی۔ کاش میری امت سونے کا زیور نہ بناتی"۔

5) بیہقی اور ابونعیم نے عبداللہ بن بسرؓ سے روایت کیا کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد خاتم النبیین ﷺ کی جان ہے اللہ تعالیٰ فارس اور روم کو (تم سے) ضرور فتح کروائے گا۔ پھر غلہ کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ لوگ کھانے پر بسم اللہ پڑھنا بھول جائیں گے"

6) ابونعیم نے عوف بن مالکؓ سے روایت کیا ہے" رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا" تم لوگ مفلسی کا خوف رکھتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے روم اور فارس کو فتح کرائے گا اور تم پر دنیا اس طرح امڈ آئے گی کہ میرے بعد تم حق سے پھر جاؤ گے اور دنیا ہی کی وجہ سے پھرو گے" (یعنی دنیا میں مگن ہو جاؤ گے اور شکر گزاری کو بھول جاؤ گے)

7) سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہمارے پاس آئے، ہم اس وقت غربت و افلاس اور فقر کا تذکرہ کر رہے تھے، اور اس سے ڈر رہے تھے، آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" کیا تم لوگ فقر سے ڈرتے ہو؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور تم پر دنیا آئندہ ایسی لائی جائے گی کہ اس کی طلب مزید تمہارے دل کو حق سے پھیر دے گی۔ قسم اللہ کی! میں نے تم کو ایسی تابناک اور روشن شریعت پر چھوڑا ہے جس کی رات (تابناکی میں) اس کے دن کی طرح ہے"۔

8) ایک اور حدیث میں حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے" مجھے تم لوگوں پر زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ حق تعالیٰ تم پر زمین کی برکات نکال دے"۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ زمین کی برکات سے مراد کیا ہے؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "دنیا کی رونق بڑھا دے"۔
حضرت عبداللہ مسعودؓ کا ارشاد ہے" ہر شخص اپنے گھر میں چند روزہ مہمان ہے اس کا مال و متاع مانگی ہوئی چیز ہے مہمان کو ہر حال میں چند دن کے بعد اپنے گھر (یعنی آخرت) کو چلا جانا ہے اور مانگی ہوئی چیز بحر حال واپس ہونے والی ہے"۔

9) حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی بعثت ہوئی تو ابلیس نے تحقیق کی" کیا ہوا ہے"؟ اور اپنے لشکر کو تحقیق کے لئے بھیجا"

کیا ان لوگوں میں (امت محمدی میں) دنیا کی محبت ہوگی"؟انہوں نے کہا (ابلیس کے چیلوں نے)"ہاں دنیا کی محبت ہے"۔ابلیس نے کہا''پھر مجھے اس کا رنج نہیں کہ وہ بت پرستی نہیں کریں گے۔میں تین چیزیں ان پر مسلط کردوں گا (الف) ناجائز طریقے سے کمانا (ب) ناجائز طریقے پر خرچ کرنا (ج) جہاں خرچ کرنا ضروری ہو وہاں پر خرچ نہ کرنا''۔

حضرت حسن فرماتے ہیں"بنی اسرائیل کو حق تعالیٰ کی بندگی کرنے کے باوجود (مال کی کثرت) دنیا کی محبت نے بت پرستی تک پہنچا دیا تھا"۔ان کا یہ بھی ارشاد ہے"آدمی اپنے مال کم سمجھتا رہتا ہے لیکن اپنے عمل کو کبھی کم نہیں سمجھتا"۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے''دنیا کی حلال مال کا حساب اور اس کے حرام مال کا عذاب ہے"۔

وہب بن منبہؒ کہتے ہیں"جو شخص دنیا کی کسی چیز سے خوش ہوتا ہے وہ حکمت کے خلاف کرتا ہے۔اور جو شخص خواہشات کو اپنے قدم کے نیچے دبا لیتا ہے شیطان ایسے شخص کے سائے سے بھی ڈرتا ہے"۔

حضرت حسن بصریؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک خط لکھا جس میں حمد وصلواۃ کے بعد تحریر فرمایا:

''امیر المومنین یہ دنیا کوچ کا گھر ہے یہ رہنے کا گھر نہیں ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کو اس میں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا کہ جنت میں ان سے ایک لغزش ہوگئی تھی۔اس لئے اس دنیا سے اور اس کے مال ومتاع سے ڈرتے رہیں۔اس کا توشہ اس کو چھوڑ دینا ہے۔اس میں غنی وہی شخص ہے جو ظاہر میں فقیر ہے۔یہ ہر وقت کسی نہ کسی کو ہلاک کرتی رہتی ہے۔جو اس کو عزیز سمجھے یہ اس کو ذلیل کردے گی۔اور جو اس کو جمع کرنے کا ارادہ کرے یہ اس کو محتاج بنا دے گی۔یہ ایک زہر ہے جس کو انجان لوگ کھاتے ہیں۔پھر وہ مرجاتے ہیں۔اس میں اس طرح زندگی گزاریں جیسے ایک زخمی بیمار ہر ایک چیز سے احتیاط کرتا ہے تاکہ صحت مند ہوجائے اور کڑوی دوا اس لئے استعمال کرتا ہے کہ مرض طول نہ پکڑے۔آپ اس مکار، دغاباز اور فریبی سے بہت احتیاط کریں۔جو محض دھوکا دینے کے لئے بنتی سنورتی ہے۔اور پھر دھوکے سے لوگوں کی مصیبت میں پھنسا دیتی ہے۔یہ اپنی امیدوں کے ساتھ لوگوں کے ہاں آتی ہے۔پس یہ ایک ایسی بنی ٹھنی نئی نویلی دلہن کا روپ دھارتی ہے کہ آنکھیں اس پر ٹکٹکی لگا دیتی ہیں۔اور آدمی اس کے جانثار بن جاتے ہیں۔لیکن یہ کمبخت سب کے ساتھ دشمنی ہی کرتی ہے۔حیرت ہے کہ نہ تو رہنے والے جانے والوں سے عبرت پکڑتے ہیں اور نہ بعد کے آنے والے پہلے والوں کا حال سن کر اس سے احتراز کرتے ہیں۔اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو جاننے والے اس کے ارشادات سے کچھ نصیحت پکڑتے ہیں۔اور پھر اس دھوکے کے گھر میں پڑ کر آخرت کو بھول جاتے ہیں۔دل! دنیا اور دنیا کے مال ومتاع میں مشغول ہوجاتا ہے اور قدم آخرت کے راستے سے پھسل جاتے ہیں پھر ندامت اور حسرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔آخر میں موت اور نزع کے کرب کی بے چینی ان کو گھیر لیتی ہے۔اور ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر جانے کی حسرتیں ان پر مسلط ہوجاتی ہیں۔دنیا اور دنیا کے مال ومتاع میں رغبت کرنے والا اپنے مقصد کو کبھی بھی پورا نہیں کرسکتا۔اور مشقت سے کبھی راحت نہیں پاسکتا۔امیر المومنین اس سے بچتے رہیے گا۔اور اس کے نہایت خوشی کے ایام میں بھی بہت زیادہ ڈرتے رہیں۔اس پر اعتماد کرنے والا جب بھی خوش ہوتا ہے۔یہ اس کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کردیتی ہے۔اس میں خوش رہنے والا دھوکے میں پڑا ہے۔اور اس میں ضرورت سے زیادہ نفع اٹھانے والا نقصان میں پڑا ہے۔امیر المومنین اس کی راحتیں تکلیفوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔اس میں دل لگانے اور رہنے کا منتہا فنا ہے۔اس میں دل لگانے والے کی خوشی رنج میں بدل جاتی ہے۔جو کچھ گزر گیا وہ واپس آنے والا نہیں اور جو آنے والا ہے اس کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہو؟اس کی آرزوئیں جھوٹی ہیں، اس کی امید سب باطل، اس کی صفائی میں گدلا پن ہے۔اس کے عیش میں مشقت اور وقت کا ضائع کرنا ہے۔آدمی اس میں ہر وقت خطرے کی حالت میں رہتا ہے۔اس کی نعمتیں خطرناک، اس میں بلاؤں کا ہر وقت خوف رہتا ہے۔اگر حق تعالیٰ شانہ جو اس کے خالق ہیں وہ اس کی برائیوں کی اطلاع نہ بھی فرماتے تب بھی اس مکار کی اپنی حالت ہی سوتوں کو جگانے کے واسطے اور غافلوں کو ہوشیار کرنے کے واسطے کافی تھی۔حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو خود اس پر خبردار کیا ہے۔اور اس دنیا کو دھوکے کا گھر اور کھیل تماشہ فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی قدر نہیں۔حق تعالیٰ شانہ نے اس کو پیدا فرما کر کبھی بھی اس کی طرف نظر نہیں فرمائی۔امیر المومنین یہ دنیا اپنے سارے خزانوں کے ساتھ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اس کو قبول نہ فرمایا۔اس لئے کہ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف پسند نہیں فرمایا۔اور جس چیز سے آپ خاتم النبیین ﷺ کے خالق نے بغض رکھا۔اس سے آپ خاتم النبیین ﷺ نے محبت نہیں کی۔اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے قیمت گرادی آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس کو پسند کرکے اس کا درجہ بلند نہیں کیا۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں سے اس کو قصداً ہٹا دیا۔اور اپنے دشمنوں پر اس کی وسعت کردی ہے۔بعض دھوکے میں پڑے ہوئے لوگ اس کی وسعت کو جو حسرت سے دیکھتے ہیں وہ اس وسعت کو دیکھ کر کہتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت کرم کیا ہے اور وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ رکھا کر پیٹ پر پتھر باندھے پڑے ہیں''۔فقط وسلام

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے'' مجھے دنیا سے کیا لینا ہے۔میری مثال تو اس سوار کی سی ہے جو سخت گرمی میں سفر کر رہا ہو۔گرمی کی شدت میں کوئی سایہ دار درخت پر نظر پڑ جائے اور اس کے سائے میں دوپہر میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے ٹھہر جائے۔پھر اس درخت کو چھوڑ کر آگے چلا جائے۔''(مسند احمد)

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' دنیا دار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو پانی پر چل رہا ہو-کیا کوئی شخص اس کی طاقت رکھتا ہے کہ پانی میں چلے اور اس کے پاؤں نہ بھیگیں؟''(مشکوۃ)

ایک حدیث میں حضور کریم خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے'' جو شخص لا الہ الا اللہ کی گواہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے وہ سیدھا جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔جب تک اس کے ساتھ کسی دوسری چیز کو خلط نہ کر دے''(گڈ مڈ نہ کر دے)حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا۔مجمع میں سے ایک شخص نے عرض کیا'' میرے ماں باپ آپ خاتم النبیین ﷺ پر قربان دوسری چیز خلط کرنے کا مطلب کیا ہے''؟حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' دنیا کی محبت اس کی ترجیح،اس کے لئے مال کا جمع کرنا،دنیا کی چیزوں سے خوش ہونا اور متکبر لوگوں کا سا عمل کرنا''-(درمنثور)

****

تواضع

تواضع کا مفہوم اور معنی

تواضع کے لغوی معنی، عاجزی وانکساری کے ہیں۔انسان کا اپنے جاہ، منصب اور بزرگی کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا اور اپنے مصاحبین میں خود کو ہیچ سمجھنا تواضع کہلاتا ہے۔

تواضع کے پیکر رسول کریم خاتم النبیین ﷺ

حضور خاتم النبیین ﷺ دین ودنیا کے بادشاہ ہونے کے باوجود بے حد متواضع اور سادہ مزاج تھے۔مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، چھوٹا ہو یا بڑا اسے سلام کرنے میں سبقت کرتے تھے، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور غریب سے غریب آدمی کی عیادت کو تشریف لے جاتے تھے۔صحابہ کرامؓ کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جاتے، کسی امتیازی نشست یا نشانی کی ضرورت نہ ہوتی۔بازار سے خود سودا خرید کر لاتے، اپنے جانوروں کو خود چارہ ڈالتے ان کے بدن پر تیل ملتے اور گھر کے دوسرے کام بھی ہاتھ سے کرنے میں خوشی محسوس فرماتے۔

1- حدیث:

ایک شخص حضور خاتم النبیین ﷺ سے ملاقات کرنے کے لیے آیا لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ کو دیکھ کر رعب نبوت سے کانپنے لگا۔حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''گھبراؤ نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی''۔(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3312)

2- حدیث:

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی نازل فرمائی'' تم تواضع کرو اور کوئی شخص ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے''۔(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4214)

3- حدیث:

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ اسے بلند کر دے گا''۔(مسند احمد، حدیث نمبر 9251-السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر 178)

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (سورۃ آل عمران 3:31)

ترجمہ: ''محبوب فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو''۔تو اس وقت حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''یہ اتباع نیکی، تقویٰ، خوف اور تواضع کے ساتھ ہو''۔

حضرت شعیبؒ فرمایا کرتے تھے ''تواضع کی بنیاد یہ ہے کہ جس سے ملو اسے پہلے سلام کرو اور جو تمہیں سلام کرے اس کا جواب دو۔محفل میں کم درجہ کی نشست پسند کرو اور یہ نہ چاہو کہ کوئی تمہاری تعریف، توصیف کرے یا تم پر احسان کرے"۔مزید فرمایا" وہ شخص کتنا اچھا ہے جو اپنی کوتاہی یا برائی کے بغیر تواضع اختیار کئے اور محتاجی کے بغیر اپنے آپ کو عاجز سمجھے''۔

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے تواضع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ''تم حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور جو حق بات سنو تو اسے قبول کرو جس نے اپنی قدر و قیمت کو محسوس کیا تو اس کا تواضع سے کوئی تعلق نہیں''۔

شیخ ابو حفصؒ کا قول ہے، ''جو یہ چاہتا ہو کہ اس کا دل تواضع کرے وہ نیک بندوں کی صحبت اختیار کرے اور ان کی عزت کرے۔اس طرح ان کی بے حد تواضع کی وجہ سے وہ ان کی اتباع کرے اور تکبر نہ کرے''۔

حضرت لقمانؑ کا قول ہے ''ہر چیز کی سواری ہوتی ہے اور عمل کی سواری تواضع ہے''۔

شیخ نوریؒ فرماتے ہیں "دنیا میں معزز ترین انسان پانچ قسم کے ہیں۔

(1) زاہد عالم (2) فقیر صوفی (3) متواضع دولت مند (4) شکر گزار درویش (5) روشن ضمیر شریف

شیخ جلاءؒ فرماتے ہیں ''اگر تواضع کی قدر نہ ہوتی تو ہم اکڑ کر چلتے''

شیخ یوسف بن اسباطؒ سے پوچھا گیا" تواضع کی حد کیا ہے"؟ فرمایا ''جب اپنے گھر سے نکلو اور کسی سے ملاقات کرو تو اسے اپنے سے بہتر سمجھو''

حضرت شیخ جریریؒ فرماتے ہیں ''اہل معرفت کا یہ صحیح خیال ہے کہ دین اسلام کا سرمایہ پانچ ظاہری اصول اور پانچ باطنی اصول ہیں ظاہری اصول یہ ہیں۔

(1) سچ بولنا (2) سخاوت (3) جسمانی طور پر تواضع کرنا (4) دوسروں کو تکلیف اور اذیت سے بچانا (5) کسی انکار کے بغیر خود تکالیف برداشت کرنا

اور باطنی اصول یہ ہیں:

(1) اپنے آقا کے وجود سے محبت کرنا (2) آقا سے جدائی کا خوف (3) اپنے آقا کے وصال کی توقع (4) اپنے فعل پر ندامت (5) اپنے پروردگار سے حیا کرنا۔

حضرت یحیٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں ''تواضع ہر ایک کے لیے اچھی ہے مگر دولت مندوں کے لیے زیادہ اچھی ہے۔ تکبر ہر ایک کے لیے برا ہے مگر درویش کے لیے تکبر کرنا بدترین ہے''

حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں ''تواضع کی تین نشانیاں ہیں:

1۔ عیب کو معلوم کرنے کے لیے نفس کو کم تر سمجھنا

2۔ توحید کی حرمت کے لیے لوگوں کی تعظیم کرنا۔

3۔ حق بات اور نصیحت کو ہر ایک سے قبول کرنا"۔

شیخ ابو یزیدؒ سے پوچھا گیا" آدمی متواضع کب ہوتا ہے"؟ فرمایا ''جب اپنے نفس کا کوئی حق نہ سمجھے کیونکہ وہ اس کی شرارت اور عیب سے واقف ہے۔ اور یہ نہ خیال کرے کہ مخلوق میں اس سے بدتر کوئی ہے'' ایک عقل مند کا قول ہے'' ہم جہالت و بخل کے ساتھ تواضع کو ادب و سخاوت کے ساتھ تکبر کرنے سے بہتر سمجھتے ہیں''۔

کسی دانشمند سے پوچھا گیا" تم کسی ایسی نعمت سے واقف ہو جس پر حسد نہ کیا جائے اور ایسی مصیبت سے واقف ہو جس پر رحم نہ کیا جائے''؟ اس نے کہا" ہاں وہ نعمت تواضع ہے اور وہ مصیبت تکبر ہے"۔

حضرت ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ''تواضع کی دو قسمیں ہیں۔

1۔ انسان اللہ کے احکام و نواہی میں تواضع کرے کیونکہ نفس آرام طلبی کی وجہ سے اس کے حکم سے غافل ہوتا ہے اور ممنوعہ شے کی خواہش کرتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ اس کے حکم و ممانعت کے مطابق عمل کرتا ہے تو یہ بھی تواضع ہے۔

2۔ اپنے نفس کو اللہ کی عظمت کے تابع کر دے چنانچہ اگر اس کا نفس کسی جائز چیز کی خواہش کرے تو وہ اسے روک دے یعنی وہ اپنے ارادے کو مشیت ایزدی کے تابع کر دے''۔

متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہیں:

اس لئے وہی انسان اللہ کے نزدیک بہتر ہوگا جس میں عاجزی، انکساری، نیازمندی اور تواضع ہو۔ جو بڑا بنے گا اس کو نیچا کر دیا جائے گا۔ اللہ کو تکبر پسند نہیں۔ جو خود کو بلند کرتا ہے اس کو پٹخ دیا جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ اسے بلند کر دے گا''۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 9251 - السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر 178)

اگر کوئی بندہ عمل کر کے نماز پڑھ کے روزے رکھ کر شیخی بگھارے اور یوں کہے یا یوں سمجھے کہ میں تو نماز پڑھنے والا، روزہ رکھنے والا اور تہجد وغیرہ پڑھنے والا ہوں اور ان کو اپنے لئے بڑی چیزیں سمجھے تو اللہ کی طرف سے یہ جواب ہوتا ہے کہ نالائق تو نے کیا کیا ہے؟۔ یہ تو میرا فضل تھا کہ تجھے صحت دی، وقت پر اٹھایا، توفیق دی، ہدایت دی تو یہ تو میرا فضل تھا تو نے کیا کیا ہے؟ یہ اترانا کیسا؟

اور اگر کوئی یہ کہتا ہے "باری تعالیٰ میں تو کچھ بھی نہ کر سکا جو کچھ کیا تو نے کیا تیرے فضل نے کیا نہ میرے اندر طاقت اور نہ میں کچھ کرنے کے قابل ہوں"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تو نے ہی تو سب کچھ کیا۔ اس لئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی شکر کرتا رہے اور یہی کہتا رہے کہ یا اللہ میں عاجز ہوں میں تیرا شکر ادا نہیں کر سکتا"۔ ہم خود محدود ہیں، ہماری عقل و طاقت محدود ہے۔ محدود ہو تو لامحدود افعال کیسے انجام دے؟ تو دینے والے نے نعمتیں لامحدود دی ہیں اور شکر محدود ہے تو لامحدود نعمتیں اور محدود شکر پورا نہیں ہو سکتا۔ تو شکر ادا کرتے ہوئے اللہ سے اس بات کا اقرار کرنا کہ یا اللہ تیرا شکر ادا کرنے تیری ثناء کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا کہ عطا زیادہ ہے اور توانائی محدود ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا "اے اللہ میرا فرض ہے کہ میں تیرا شکر ادا کروں لیکن جب نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس شکر کی توفیق بھی تو تو نے ہی دی ہے۔ پھر اس توفیق پر شکر ادا کرتا ہوں۔ اس لئے میں تو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ تیرا شکر کس طرح ادا کروں؟۔ کیونکہ ہر شکر کے بعد ایک اور شکر نکلتا ہے"۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔ "اے داؤد اگر تو نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تو شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو شکر کی ادائیگی یہی ہے کہ اپنا عجز مان لو۔ اپنی ناتوانی کو تسلیم کر لو۔ کون ہے جو ہمارا شکر ادا کر سکے؟ اور ہماری اطاعت کا حق ادا کر سکے"۔

اس لئے بندے کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد اس چیز کا اقرار کرے کہ باری تعالیٰ میں کچھ نہیں کر سکا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل دامن گیر نہ ہو تو ہماری نجات بھی نہیں ہو سکتی۔ عمل بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری نمازیں، وسوسے بھری ہوئی ہیں۔ خیالات اِدھر اُدھر، نمازیں تو انبیاء کرامؑ، اولیاء کرام کی تھیں، تو بس یہ اللہ کا فضل ہی ہوگا کہ اللہ ان بے جان نمازوں کو قبول کر لے۔

حضرت جلال الدین سیوطیؒ نے ایک کتاب آخرت کے احوال پر لکھی ہے۔ اس میں پچھلی امتوں میں سے بنی اسرائیل کا ایک بڑا عجیب واقعہ لکھا ہوا ہے۔ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا۔ اللہ کی بہت زیادہ عبادت کرتا تھا۔ گھر بار تھا، بیوی بچے تھے۔ اس کو یہ گوارا نہ ہوا کہ میں بچوں اور گھر بار میں اتنا وقت ضائع کروں اس نے بیوی بچے، رشتہ دار وغیرہ سب چھوڑے اور ایک ٹیلہ جو سمندر کے بیچ میں تھا اس پر چلا گیا۔ وہاں چوبیس گھنٹے عبادت میں مشغول رہتا۔ یہ رہبانیت ہے۔ اس زمانے میں رہبانیت جائز تھی۔ اسلام نے اس کو ختم کر دیا۔ وہاں اس نے ایک چھپر ڈال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اس کے قریب ہی ایک انار کا درخت اُگ آیا اور اس پر انار لگ گئے اور اس کڑوے پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے اسی پہاڑ کے بیچ میں سے ایک میٹھے پانی کا چشمہ نکال دیا۔ اس عابد کا کام یہ تھا کہ ایک انار روز کھاتا اور ایک کٹورہ پانی کا پیتا اور پورے وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ پانچ سو برس اس نے اسی طرح عبادت کی پانچ سو برس کے بعد جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا "باری تعالیٰ مجھے نماز عزیز ہے مجھے نماز کی حالت میں موت آئے"۔ تو سجدے کی حالت میں اس کی روح قبض کی گئی اور حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "آج تک اس کی لاش سجدے ہی کی حالت میں محفوظ ہے"۔

آپ خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب اس کی روح نکل گئی اور بارگاہ حق میں پیش ہوئی تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "اے میرے بندے میں نے اپنے فضل و کرم سے تجھے بخش دیا اور تجھے جنت کا مقام رفیع عطا کیا ہے۔ اب تو ابد تک چین میں رہ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ میرا مقبول بندہ ہے میں نے اس کو اپنے کرم و فضل سے نجات دے دی ہے"۔ اس عابد کے دل میں یہ بات (خیال میں) آئی کہ پانچ سو برس میں نے عبادت کی، بیوی بچے، رشتہ دار، عزیز و اقارب، عیش و آرام سب ختم کیا اب بھی اللہ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے بخشا ہے۔ میری تسلی کے لئے اگر اللہ تعالیٰ یہ کہہ دیتے کہ تو نے گھر بار چھوڑا، نمازیں پڑھیں، دنیا کا عیش ختم کر دیا اس عمل کے طفیل تجھے بخشا تو میرا دل خوش ہو جاتا۔ میں نے کس قدر محنت کی ساری دنیا کو میں نے ترک کیا اور اب بھی بخشا تو اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ گویا میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ وسوسہ ذرا سی دیر میں اس کے دل میں گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے کھٹک کو جانتے ہیں "وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُور"۔ "اللہ سینوں کے خیالات کو جانتا ہے"۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا کہ اس بندے کو جنت کے بجائے جہنم کے راستے پر لے جاؤ۔ لیکن جہنم میں ڈالنا نہیں ہے جہنم سے پانچ سو میل کی مسافت پر لے جا کر اس کو کھڑا کر دو۔ اس کو وہاں پہنچایا گیا۔ وہاں جو جہنم کی لو اور لپٹ آئی سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہو گیا۔ اس کو کانٹے چبھنے لگے اور پیاس پیاس چلانے لگا۔ جہنم کا ایک جھونکا لگا تو اس کی ساری روح خشک ہو گی۔ حدیث میں ہے "ایک ہاتھ غیب سے نمایاں ہوا جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑتا ہوا گیا کہ اے اللہ کے بندے یہ پانی مجھے دے دے"۔ یہ آگے گیا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا اور آگے گیا ہاتھ اور پیچھے ہٹتا گیا۔ اس نے التجا کی "خدا کے لئے یہ پانی مجھے دے دو"۔ جواب ملا "اس پانی کی قیمت ہے"۔ اس عابد نے فوراً پوچھا کہ "اس کی کیا قیمت ہے؟" جواب آیا "پانچ سو برس کی خالصتاً کی گئی عبادت"۔ اس نے کہا "میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے یہ لے لو"۔ اس کے ساتھ ہی اس ہاتھ سے کٹورا لیا اور جلدی جلدی پیا کچھ دم میں دم آیا۔ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا "اس عابد کو لوٹا کر ادھر لے آؤ اور پھر ہمارے سامنے پیش کرو"۔ پھر پیشی ہوئی حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا "اے بندے تیری پانچ سو برس کی عبادت سے تو ہم چھوٹ گئے۔ اس کی قیمت ایک کٹورا پانی تجھے مل گیا

اور وہ قیمت کی ادائیگی تو نے خود تجویز کی"۔تو نے خود کہا" میں اپنی پانچ سو برس کی عبادت دیتا ہوں۔اب ان لاکھوں کٹوروں کا حساب دے جو دنیا میں تو نے پیئے۔ان کے بدلے میں کیا کیا عمل لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو تو نے دنیا میں لاتعداد اناروں کے دانے کھائے ہیں ایک ایک دانے کا حساب دے۔ان کے بدلے میں کتنے سجدے کئے، کتنے رکوع کئے؟ کتنی عبادات کیں؟ اور اس کے بعد وہ جو تیری آنکھوں میں روشنی تھی جس سے تو صورتیں دیکھ پاتا تھا اس ایک ایک تار نگاہ کا حساب دے۔اور جو تو سانس لیتا تھا جس کے ذریعے تیری زندگی قائم تھی اس سانس کا اس ہوا کا حساب دے کہ ان کے بدلے کتنی عبادات کیں ہیں اور وہ جو چشمہ اور انار کا درخت تیرے لئے رکھا تھا؟ اور جو ہماری دنیا کے ذرے ذرے سے تو نے فائدہ اٹھایا ہے اس کا حساب دے"۔عابد بیچارا تھرا گیا۔اس کی عقل ٹھکانے آ گئی۔اس نے فوراً کہا''اے اللہ بے شک نجات صرف اور صرف تیرے فضل ہی سے ہے۔عمل کی قیمت تو ایک کٹورا پانی کا تھا۔اور وہ بھی آپ نے اپنے فضل ہی سے دے دیا اگر آپ فرما دیتے کہ اس پانی کے کٹورے کی قیمت ایک لاکھ برس کی عبادت ہے تو میں اس سے بھی محروم رہ جاتا۔یہ تیرا فضل تھا کہ تو نے اتنی قیمت رکھی جو میں ادا کر سکتا تھا۔باری تعالیٰ نجات فضل ہی سے ہے عمل سے نہیں ہے''۔ اَب حکم ہوا" لے جاؤ میرے اِس بندے کو میرے فضل و کرم کے طفیل جنت میں "۔تو متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہوتے ہیں-اللہ کو عاجزی اور انکساری ہی پسند ہے-

تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے

بہر حال قلب وہ ہے جس کے اندر بزرگی ہو۔لباس کیسا بھی ہو۔بزرگی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اپنے نفس کی حقارت دل میں جمی ہوئی ہو اور دوسرے کی بزرگی جمی ہوئی ہو۔اگر ایک شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اور وہ مدعی ہے کہ میں بہت زیادہ بڑا ہوں یہ دعویٰ ہی علامت ہے کہ بزرگی نشان کو بھی اس میں موجود نہیں ہے۔بزرگی میں نہ دعویٰ ہوتا ہے نہ شیخی ہوتی ہے۔ترک دعویٰ اور ترک شیخی کا نام بزرگی ہے جب یہ پیدا ہو، کہا جائے گا بزرگی ہے۔

تواضع آدمیت کی علامت ہے

انسان کے اندر جب تک کہ تواضع، خدمت اور خدمت گزاری نہ ہو اس وقت تک صحیح معنوں میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی مخلوق کی تذلیل و تحقیر سے آدمی خود اپنی ذلت کے راستے ہموار کرتا ہے تو ایک طرف تو عظمت خداوندی دل میں ہو اور ایک طرف خدمت خلق ہو۔اور خادم خلق نہیں بن سکتا جب تک کہ متواضع منکسر المزاج نہ ہو جب تک یہ نہ سمجھے کہ میں ان سے کم رتبہ ہوں۔میرا فرض یہ ہے کہ میں ان کی خدمت کروں اب راستے میں کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک متکبر کانٹے کو اٹھانے کیلئے کبھی نہیں جھکے گا سمجھے گا میری شان کے خلاف ہے، میری حیثیت بہت بلند ہے، لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر متواضع ہے، تو وہ جھک کر کانچ کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے اٹھا پھینکے گا تا کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔یہ خدمت وہ سرانجام دے گا جس کے قلب کے اندر تواضع اور انکساری موجود ہوگی۔کبر اور ریاکاری جس کے اندر ہوگی وہ کبھی یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکے گا۔

بہر حال خدمت خلق کا جذبہ تب موجود ہوگا جب دل میں تواضع کا جذبہ موجود ہو۔منکسر المزاج ہو۔دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے آدم علیہ السلام کا بیٹا ہو تو ضرور تواضع کرے گا اور اگر اپنا نسب نامہ شیطان سے ملا لے گا تو کبھی تواضع نہیں کرے گا۔اس واسطے کہ دونوں سے لغزشیں ہوئیں۔آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی ہوئی۔آدم علیہ السلام نیت کے پاک تھے مگر بھول کر ایک لغزش ہوگئی حکم دیا گیا تھا کہ پھل مت کھاؤ، بھول کر کھا لیا حالانکہ وہ نافرمانی نہیں تھی، نافرمانی کہتے ہیں جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی کرنا یہ نہیں ہوا تھا، جانتے تھے کہ اللہ نے روکا ہے، مگر مشکل کیا پیش آئی؟ ایک تو کم بخت شیطان نے آ کے قسم کھائی: (سورۃ الاعراف، آیت 21)

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ

ترجمہ:''قسم کھا کے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہوں'' آدمؑ کا سچا قلب آپ کسی فریب سے واقف نہیں، مقام جنت میں ہے، جو کریم مقام ہے یہ شبہ بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے، جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو حسن ظن دل میں ہوتا ہے، دوسرے کو بھی آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی اچھا ہے۔یہ خدا کا نام لے کر قسم کھا رہا ہے، بھلا خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی جرات کیسے ہو سکتی ہے؟ آدمؑ نے نافرمانی کی حقیقت میں آدم جلیل القدر پیغمبر بھی ہیں، مگر ہیں تو اللہ کی بارگاہ کے بندے ہی اور مقرب بندے، مقربین سے اگر ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو ان پر شدت تعلق کی بناء پر زیادہ سختی کی جاتی ہے، اگر کوئی دشمن آپ کو گالی دے، آپ برا نہیں مانیں گے کہ دشمن کا کام یہی ہے لیکن اگر آپ کا بیٹا ذرا ترچھی نگاہ سے بھی دیکھ لے فوراً مارنے کو تیار ہو جائیں گے کہ اپنا ہو کر یہ کام کرتا ہے۔تو شدت تعلق کی بناء پر تھوڑی سی بات بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔آدم علیہ السلام مقربان بارگاہ حق میں سے ہیں، پیغمبر ہیں انہوں نے لغزش کر کے درخت کا پھل کھا لیا تو سختی سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم نافرمانی

کر رہے ہو یعنی اتنے مقرب ہو کر کیوں تم سے لغزش سرزد ہوئی؟ تمہارے حق میں یہ لغزش بھی عصیان کا نام پائے گی۔ مگر حقیقتاً وہ عصیان نہیں تھا، خطاء فکری اور خطاء اجتہادی تھی۔ تو ایک طرف ابلیس سے خطاء سرزد ہوئی فرمایا گیا تھا کہ تو آدم علیہ السلام کو سجدہ کر اس نے نہیں کیا اور آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی، مگر فرق کیا تھا؟ آدم علیہ السلام نے خطا کے بعد کہا سورۃ الاعراف آیت 23 میں کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا "اے اللہ! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا" وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ "اگر آپ میری مغفرت نہیں کریں گے اور مجھ پر رحم نہیں کریں گے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ تو اعتراف خطا کیا تو خلافت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا۔ ابدالآباد کیلئے مقبول بنائے گئے۔ ان کی اولاد میں لاکھوں کروڑوں بندگان مقبول الٰہی ہوئے اور ان سے جنت آباد ہو گئی۔

شیطان نے گناہ کر کے یہ نہیں کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی بلکہ اللہ کے حکم میں اور نکتہ چینی کی۔ سورہ الاعراف، آیت نمبر 12 میں ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ: "فرمایا کس چیز نے تجھے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا"۔

ابلیس نے نہ صرف نافرمانی کی بلکہ نافرمانی کی مزید مہلت مانگی۔ سورہ الاعراف، آیت نمبر 18-13 میں مزید فرمایا:

ترجمہ: "فرمایا تو یہاں سے اُتر جا تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے نکل تو ہے ذلت والوں میں۔ بولا مجھے فرصت دے اس دن تک کہ لوگ اٹھائے جائیں، فرمایا تجھے مہلت ہے۔ بولا تو قسم اس کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں ضرور تیرے سیدھے راستہ پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا۔ پھر ضرور میں ان کے پاس آؤں گا ان کے آگے اور ان کے پیچھے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا یہاں سے نکل جا رد کیا گیا راندہ ہوا، ضرور جو اُن میں سے تیرے کہے پر چلا میں تم سب سے جہنم بھر دوں گا"۔

گویا پورا مقابلہ ٹھانا تو ابدالآباد کیلئے ملعون بنا دیا گیا۔ تو آدم علیہ السلام نے غلطی کا اعتراف کیا، تواضع و انکساری سے پیش آئے تو خلافت مل گئی، شیطان کبر و ریاء سے پیش آیا۔ ابدالآباد کیلئے ملعون بن گیا۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بندہ حق تواضع کی حقیقت اسی وقت معلوم کر سکتا ہے جب مشاہدہ حق کے نور کا جلوہ اس کے دل میں نظر آئے۔ اس موقع پر اس کا نفس پگھل کر کبر و خود پسندی کی کھوٹ سے صاف ہو جاتا ہے اور نرم ہو کر حق تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق کی خدمت کرتا ہے کیونکہ اس وقت اس کے نفس کے آثار محو ہو جاتے ہیں اور اس کی شورش اور غبار ختم ہو جاتے ہیں۔ پس تواضع اختیار کرنے والے انسان میں چار خوبیوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

(1) اللہ سے قربت (2) نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت (3) اولیاء اللہ سے تربیت (4) مخلوق کی خدمت۔

****

اخلاص

اخلاص بہت بڑی دولت ہے۔ کیونکہ جس نے اخلاص حاصل کرلیا۔ اس نے نفس پر قابو پالیا اور جس نے نفس پر غلبہ پالیا گویا اس نے اللہ کو راضی کرلیا تو جس سے اللہ راضی ہوگیا تو اس نے دنیا کی ہر چیز کو پالیا۔ یعنی اخلاص اللہ کی قربت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

قرآنی آیات

اخلاص کے بارے میں ارشادات باری تعالیٰ حسب ذیل ہیں۔

1- ترجمہ: ''اور انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں ایک طرف ہوکر اور اس کے دین میں اخلاص کریں اور نماز قائم رکھیں اور زکوۃ ادا کریں چونکہ یہی قائم رہنے والا دین ہے"۔ (سورہ البینہ، آیت نمبر 5)

2- ترجمہ: ''البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور اللہ کی رسی کو تھام لیں اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لیے کرلیں۔ تو ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور عنقریب اللہ بہت بڑا اجر دے گا"۔ (سورۃ انساء، آیت نمبر 146)

منافق کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کے اعمال اور عبادت میں اخلاص نہیں ہوتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں دعوت دی کہ وہ اپنے طرز عمل کو ترک کر کے خالص اللہ کے لیے اپنے اعمال سرانجام دیں اور اپنی ہر قسم کی وفاداری اسلام کے ساتھ وابستہ کریں تو جب ان کا اخلاص اسلام کے مطابق ہوجائے گا تو پھر وہ مسلمانوں میں شمار کئے جائیں گے۔

3- ترجمہ: ''تم فرماؤ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے عمل تمہارے لیے ہیں اور ہم اس کے لیے مخلص ہیں"۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر 139)

4- ترجمہ: ''ان کی اکثر سرگوشیوں میں کچھ بھلائی نہیں مگر جو حکم دے خیرات یا اچھی بات یا لوگوں میں صلح کرنے کا اور جو رضائے الٰہی کی خاطر ایسا کرے۔ اسے عنقریب ہم عظیم اجر دیں گے"۔ (سورۃ النساء، آیت نمبر 114)

5- ترجمہ: ''کہ مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں خالص خدا ہی کی فرماں برداری کروں اسی کی عبادت کروں"۔ (سورۃ الزمر، آیت نمبر 11)

6- ترجمہ: ''فرمایئے کہ میں تو خدا ہی کا فرماں بردار ہوکر اسی کی عبادت کرتا ہوں"۔ (سورۃ الزمر 14)

7- ترجمہ: ''ہم تمہیں خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں ہمیں تم سے کچھ بدلہ درکار نہیں اور نہ شکر گزاری کے خواستگار ہیں"۔ (سورۃ الدھر، آیت نمبر 9)

8- ترجمہ: ''خدا تک نہ تو ان کے گوشت ہی پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے "۔ (سورۃ الحج، آیت نمبر 37)

9- ترجمہ: ''کہہ دیجیئے کہ بیشک میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جو سارے جہاں کا پروردگار ہے"۔ (سورۃ الانعام، آیت نمبر 162)

احادیث اخلاص

رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کے ارشادات میں اخلاص پر بہت زور دیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں ہر کام کرتے ہوئے اخلاص بیدار رہے۔

1۔ اچھی نیت اخلاص ہے

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "تمام اعمال نیت کے ساتھ ہیں جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے تو اسے اسی کا ثواب ہے اور جس شخص کی ہجرت دنیا یا کسی عورت کی خاطر ہے تو اس کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی"۔ (بخاری شریف)

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا "اخلاص کیا چیز ہے"؟ انہوں نے جواب دیا "میں نے رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ سے دریافت کیا تھا "اخلاص کی کیا حقیقت ہے"؟ تو رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''میں نے جبرائیلؑ سے دریافت کیا تھا "اخلاص کیا ہے"؟ جبرائیلؑ نے کہا "میں

نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی "اخلاص سے کیا مراد ہے"؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" وہ میرے رازِ دل میں سے ایک راز ہے۔ میں اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتا ہوں اس کو امانت کے طور پر رکھتا ہوں"۔

روایت ہے کہ آنحضرت خاتم النبیین ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے پوچھا" کوئی کام ایسا تو نہیں جو حضور سرور عالم خاتم النبیین ﷺ کرتے ہوں اور میں نہ کرتا ہوں"؟ حضرت عائشہؓ نے کہا" حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ آٹھویں دن میٹھا حلوہ بنوا کر اس طرف جایا کرتے تھے"۔ آپؓ نے کہا" اچھا حلوا بنواؤ میں بھی جاؤں گا"۔ غرض اس طرف تشریف لے گئے تو غار میں ایک آدمی کو دیکھا" نہایت ضعیف ہے اور آنکھوں سے معذور ہے اور بدن پر کوڑھ ہے۔ جب کوڑھی نے پاؤں کی آہٹ سنی فوراً منہ پھیلا دیا۔ یہ دیکھ کر خلیفہ اول کا گمان درجہ یقین کو پہنچا۔ اسی وقت انگلی سے تھوڑا سا حلوہ نکال کر کوڑھی کے منہ میں رکھ دیا۔ حلوہ پاتے ہی وہ ایک مرتبہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ پھر منہ بنا کر مشکل سے کرخت آواز میں بولا" کیا محمد خاتم النبیین ﷺ وصال پا گئے"؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے سکوت کے بعد جواب دیا کہ ''ہاں اُس شفیقِ امت نے وفات پائی''۔ کوڑھی نے پوچھا ''تم کون ہو؟'' خلیفہ نے کہا" میرا نام ابوبکر (صدیقؓ) ہے۔ مجھ کو مسلمانوں نے اپنا امام اور خلیفہ بنایا ہے" اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کوڑھی سے پوچھا" میں سمجھتا تھا کہ رسول خاتم النبیین ﷺ آپ کیلئے حلوہ لاتے تھے اور اسی تقلید رسول کی بناء پر میں نے بھی ایسا ہی کیا اب متحیر ہوں کہ میرا خیال غلط تو نہ تھا"؟ کوڑھی نے کہا" تمہارا خیال بہت صحیح ہے لیکن واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کھلانے میں غلطی کی ہے۔ وہ طریقہ تم نے نہیں برتا۔ ہاں! اے محمد خاتم النبیین ﷺ کے جانشین میں جب منہ پھیلاتا تو تمہارا نبی اپنی زبان پر رکھ کر میرے منہ میں گرا دیتا تھا اور جسم سے جسم نہیں ملتا تھا تم نے جو انگلی سے چٹایا اور انگلی کے لگ جانے سے مجھ کو جو اذیت ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ محمد خاتم النبیین ﷺ کو اللہ نے دنیا سے اٹھا لیا ہے میں مسلمان نہیں ہوں اور نہ مجھ کو محمد خاتم النبیین ﷺ کی نبوت پر کچھ ایسا یقین تھا لیکن آج یہ دیکھ کر اس کے جانشین اور اصحابؓ کس استقلال اور خلوص کیساتھ اپنے رسول خاتم النبیین ﷺ کے قدم بہ قدم چلتے ہیں اور شریعت محمد یہ خاتم النبیین ﷺ کی اشاعت میں محبت کے ساتھ سرگرم ہیں ان کی نبوت کا پورا یقین آ گیا جس کے ساتھی اچھے ہوں وہ ضرور اچھا ہے وہ ضرور پیغمبر تھا''۔ یہ کہہ کر کوڑھی نے با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے اخلاص عمل کی بناء پر ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ کسی کافر کو زیر کر کے اس کے سینے پر بیٹھ کر چاہتے تھے کہ اسے موت کا شربت پلائیں کہ اچانک اس نے آپؓ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ اس کے سینے سے اتر آئے تو اس نے متعجب ہو کر کہا ''جب میں آپ کے قابو میں آ گیا پھر میرے قتل سے کیوں باز رہے"؟ فرمایا" پہلے خالصتاً اللہ کے لیے تجھے واصل جہنم کرنے کا قصد تھا۔ جب تو نے میرے چہرہ پر تھوک دیا اس سبب سے نفس کا معاملہ آ گیا۔ اخلاص نہ رہا اس وجہ سے میں نے تیرے قتل سے ہاتھ روک لیا"۔ یہ سن کر وہ مسلمان ہو گیا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر کام میں اخلاص شرط ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک لونڈی بدصورت کالی حبشن ہارون الرشید کی مصاحبہ تھی۔ ہارون اس سے محبت زیادہ رکھتا تھا۔ ایک دن ہارون الرشید کے بے تکلف مصاحبوں نے عرض کیا" حضور کو ایسی مکروہ صورت لونڈی سے کیوں محبت ہوئی"؟ ہارون الرشید یہ بات سن کر اس وقت خاموش رہا مگر موقعہ کا منتظر رہا۔ ایک دن اتفاق سے سارے مصاحب عورت مرد ہارون رشید کے محل سرائے میں جمع تھے۔ بے ساختہ ہارون رشید نے فرمایا" آج ہم نہایت خوش ہو کر کہتے ہیں کہ جو چیز میرے محل میں جس کو پسند ہو اس پر ہاتھ رکھ دے وہ چیز اسے دے دوں گا"۔ یہ سن کر ہر ایک نے اپنی اپنی پسند کی چیز پر ہاتھ رکھا۔ کسی نے یاقوت کے جام پر ہاتھ رکھا، کسی نے رومی لونڈی پر ہاتھ رکھا، کسی نے آرائشی شے کو لیا۔ غرض ہر ایک نے کچھ نہ کچھ پسند کیا۔ مگر وہ کالی حبشن ہارون رشید کی محبوبہ کھڑی رہی کسی شے پر ہاتھ نہ رکھا اور نہ کوئی شے پسند کی۔ ہارون رشید نے کہا" تم بھی اپنی طبیعت کے موافق پسند کر لو"۔ یہ سن کر اس لونڈی نے خلیفہ ہارون رشید کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا" مجھے تو جہان بھر میں آپ پسند ہیں اور کوئی چیز پسند نہیں مجھے یہ میری پسندیدہ شے حسب وعدہ ملنی چاہیے"۔ سب لوگ یہ بات دیکھ کر حیران ہوئے۔ ہارون رشید نے فرمایا" تم نے دیکھا کہ کالی لونڈی کا باطن کس قدر اجلا ہے۔ تم نے کیا پسند کیا اور اس نے کیا پسند کیا؟ یہی وجہ ہے کہ میں اس حبشن لونڈی کو اپنی ساری قلم رو میں پسند کرتا ہوں"۔

جس طرح دنیا کے بادشاہ کو کالی لونڈی اس لیے پسند آئی کہ وہ بادشاہ کی سچی طالب و عاشق تھی۔ اس کے مقابل بڑی بڑی حسین ناپسند تھیں۔ اس طرح حق تعالیٰ جل شانہ شہنشاہ دو جہان کو اپنے سچے طالب پسند آئے۔ بلال حبشیؓ کو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے پسند کیا تھا۔ نہایت حسین خوبصورت ابولہب کو پسند نہ کیا کیونکہ بلال حبشیؓ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے طالب تھے۔ ابولہب دنیا کا طالب جو اللہ تعالیٰ کا طالب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کا حامی ہو جائے گا۔

2۔ جہاد میں اخلاص کو پیش نظر رکھنے کی تاکید

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا گیا "ایک آدمی شجاعت دکھانے، دوسرا قومی غیرت اور تیسرا ریاکاری کی غرض سے لڑتا ہے۔ ان میں سے کون اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہے"؟ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جو صرف اس غرض سے لڑے کہ اللہ کا کلمہ ہی بلند ہو وہ اللہ کے راستے میں مجاہد ہے"۔ (بخاری شریف)

سرکار دو عالم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ایک شخص کو حساب کے لیے لایا جائے گا اس سے پوچھا جائے گا کہ ''تو نے کونسی عبادت کی'' وہ شخص عرض کرے گا ''میں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا میں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دی۔ میدان جنگ میں شہید ہوا'' اللہ کا ارشاد ہوگا ''تو نے جھوٹ بولا۔ یہ سب تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں۔ لوگوں نے تجھے بہادر کہہ دیا۔ پھر حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں ڈال دو'' پھر ایک دوسرے شخص کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا ''تو نے کونسی عبادت کی''؟ وہ عرض کرے گا '' یا اللہ میں نے تیری راہ میں اپنا مال خرچ کیا تھا۔ میں زکوٰۃ دیتا رہا۔ صدقہ خیرات کرتا رہا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا ''تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے مال اس لیے خرچ کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں اور تیری تعریف کریں تو لوگوں نے تجھے سخی کہا اور تعریف بھی کی'' پھر حکم ہوگا ''اسے جہنم میں ڈال دو'' تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر ایک شخص کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا ''تو نے دنیا میں کونسی نیکی کی؟'' وہ عرض کرے گا ''یا اللہ میں نے قرآن کا علم حاصل کیا اور بہت تکالیف برداشت کیں، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا رہا'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا ''تو جھوٹ کہتا ہے تو نے علم اس لیے سیکھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور تیری تعریف کریں۔ پس لوگوں نے تجھے عالم کہا اور تیری تعریف کر دی'' پھر حکم ہوگا کہ ''اسے جہنم میں ڈال دو''۔ (صحیح مسلم، سنن نسائی)

3۔ قیامت کے روز لوگ اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے

ام المومنین ام عبداللہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''ایک لشکر کعبۃ اللہ پر چڑھائی کرے گا۔ جب وہ چٹیل میدان میں پہنچے گا تو ان کے اگلوں پچھلوں کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا'' ام المومنین فرماتی ہیں میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ان تمام کو کیسے دھنسایا جائے گا جبکہ ان میں سے بعض دوکاندار ہونگے اور کچھ ان میں سے نہیں ہوں گے'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "ان کے اول و آخر کو دھنسایا جائے گا۔ پھر وہ اپنی اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے"۔ (بخاری شریف)

اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے نزدیک ایک لشکر کعبۃ اللہ پر حملہ کرنے کی غرض سے آئے گا اور جب وہ ہموار جگہ میں پہنچے گا تو اللہ اس لشکر کے آگے اور پیچھے والوں کو زمین میں دھنسا دے گا۔ آخر کار جب قیامت کا وقت آجائے گا تو قیامت بپا ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد جب تمام انسانوں کو زندہ کیا جائے گا تو انہیں بھی ان کی نیتوں کے مطابق دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ یعنی جیسی ان کی نیت تھی ویسی ہی سزا پائیں گے۔ (یعنی جو بے قصور ہوں گے وہ جزا اور قصوروار سزا پائیں گے)

4۔ اچھی نیت والوں کے لیے فرشتے دعا مانگتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "نماز باجماعت کا ثواب، بازار یا گھر میں پڑھی جانے والی نماز کے ثواب سے 25 اور کچھ درجے زائد ہے اور یہ اس لیے کہ تم میں سے جب کوئی ایک اچھی طرح وضو کر کے صرف نماز کی نیت سے مسجد میں جاتا ہے، کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہیں ہوتا تو وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کے بدلے میں اس کا درجہ بلند ہوتا ہے اور اس سے ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد جب تک نماز کا انتظار کرتا ہے نماز میں شمار ہوتا ہے اور جب تم میں سے کوئی نماز کی جگہ پر ہی بیٹھا رہتا ہے تو فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا مانگتے ہیں جب تک کہ وہ کسی کو ایذا نہ دے یا بے وضو نہ ہو جائے۔ فرشتے کہتے ہیں ''یا اللہ اسے بخش دے'' یا اللہ اس کی توبہ قبول کر'' (صحیح بخاری شریف)

فرشتے اللہ کی نیک مخلوق ہیں جو برائی سے بالکل مبرا ہیں اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص نماز قائم کرتے وقت بالکل صحیح نیت رکھتا ہے اور اس کے پیش نظر رضائے الٰہی کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا تو اس کے لیے فرشتے بھی اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ یا الٰہی اس بندے کی اخلاص نیت کی بناء پر اسے بخشش عطا کر۔ یہ انسان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ فرشتے اللہ کے حضور اس کے لیے دعا گو ہوں۔

5۔ایمان اور اعمال کے لیے اخلاص ضروری ہے

ایمان کے لیے اخلاص بہت ضروری ہے کیونکہ اخلاص ہی سے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا ''اے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ ایمان کیا ہے''؟ تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' اخلاص''۔(بیہقی)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ ''جو دنیا سے اس حال میں رخصت ہوا کہ اللہ وحدہ لاشریک کے لیے اخلاص والا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور زکوٰۃ دیتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔''(ابن ماجہ)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ مجھے یمن کا گورنر بنا کر بھیجنے لگے تو میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ مجھے کچھ وصیت فرمائیے''۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''اپنے دین میں اخلاص رکھو،تھوڑا کام بھی تم کو کافی ہوگا''۔ (ترغیب)

6۔برکات اخلاص

اخلاص میں بہت برکت ہے اس کے بارے میں رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اس امت کو ان کے ضعیفوں کی دعاؤں اور ان کی نمازوں، اور ان کے اخلاص کی برکت سے امداد کرتا ہے''۔(نسائی شریف)

ایک اور حدیث میں رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ:

ترجمہ:''اخلاص والوں کے لیے خوشخبری اور مبارک ہو جو ہدایت کے چراغ ہیں انکے ذریعے تمام سیاہ فتنے دور ہو جاتے ہیں''(بیہقی)

خلوص نیت کے ساتھ کام کرنے سے دین و دنیا میں کامیابی حاصل ہوتی ہے،اہل اخلاص سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔

اخلاص کی برکت کا ایک واقعہ

رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' پہلے زمانے کے تین آدمی کہیں جا رہے تھے۔رات کا وقت ہوا تو،بارش ہونے لگی ان تینوں نے بارش سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ اختیار کی،اتفاقاً اوپر سے ایک چٹان پتھر کی گری،جس سے غار کا منہ بند ہو گیا تو ان لوگوں نے کہا''ہم اپنے نیک اور خالص عملوں کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کرتے ہیں''۔تو ان میں سے ایک نے کہا''خدایا!میرا گزارہ صرف بکریوں پر تھا،بکریاں چراتا تھا اور ان ہی کے دودھ سے تمام گھر والوں کی پرورش کرتا تھا،چونکہ میرے ماں باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے،اس لیے میں ان سے پہلے کسی گھر والے کو دودھ نہیں پلاتا تھا،بلکہ پہلے ان کو پلاتا پھر بال بچوں کو پلاتا،اتفاق سے ایک روز مجھے درختوں کے پتے لینے کے لیے دور جانا پڑا اور میں اتنی دیر میں واپس آیا کہ والدین سو چکے تھے میں نے حسب دستور دودھ دھویا،والدین کے حصہ کا دودھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا،تو وہ دونوں سو گئے تھے ادب کیوجہ سے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا،نتیجہ یہ ہوا کہ دودھ کا کٹورا میں ان کے سرہانے لے کر کھڑا ہو گیا کہ جب ان کی آنکھ خود بخود کھلے گی تو دودھ خدمت میں پیش کردوں گا۔اس انتظار میں صبح ہو گئی اور میرے بچے رات بھر بھوکے رہے۔جب میرے والدین صبح کو بیدار ہوئے تو دودھ پیا،اے اللہ!اگر میں نے اس کام کو تیری خوشنودی اور تیری رضا کے لیے کیا تو اس چٹان کو ہٹا دے''،چنانچہ اس اخلاص کیوجہ سے وہ چٹان صرف اتنی ہٹی کہ وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔اب دوسرے کی باری آئی اور دوسرے نے کہا''اے اللہ تو خوب جانتا ہے کہ مجھ کو اپنے چچا کی لڑکی سے محبت تھی اور میں اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا وہ بچتی رہی اور میرے قبضے میں نہیں آئی یہاں تک کہ ایک سال قحط سالی کے زمانے میں معاشی حالت خراب ہو گئی۔بہت مجبور ہو کر وہ میرے پاس آئی اور قرض کی درخواست کی۔میں نے اس کو ایک سو بیس دینار اس شرط پر دیئے کہ وہ پہلے اپنے آپ کو میرے حوالہ کردے اور میری مراد پوری کردے وہ اس کام پر رضامند ہو گئی جب میں ہر طرح اس پر قابو پا چکا اور اس برے کام کے لیے بالکل آمادہ ہو گیا تو اس نے کہا''اِتَّقِ اللہَ'' خدا سے ڈر۔اور ناحق اس مہر کو مت توڑ یہ تیرے لیے حلال نہیں۔میں اس سے ہٹ گیا حالانکہ مجھے اس سے محبت تھی اور ان اشرفیوں کو بھی بلا معاوضہ چھوڑ دیا۔الٰہی!اگر میں نے اس کام کو محض تیری رضامندی کے لیے کیا ہو تو اس چٹان کو ہم سے ہٹا دے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں''،چنانچہ وہ چٹان کچھ اور ہٹ گئی لیکن نکلنے کے قابل راستہ نہ ہو سکا اب تیسرے کی باری آئی۔اس نے کہا''اے اللہ میں نے ایک مرتبہ مزدوروں سے کچھ کام لیا سوائے ایک کے سب کی مزدوری دے دی وہ اپنی مزدوری کو چھوڑ کر چلا گیا میں نے اس کی مزدوری کو زراعت پر لگا دیا اور اس سے بہت ترقی ہوئی ایک زمانہ کے بعد وہ مزدور آیا اور اپنی مزوری طلب کی۔میں نے اس سے کہا کہ یہ سب کچھ اونٹ،گائے،بیل،بکریاں اور غلام وغیرہ سب تیرے ہیں سب لے جا

اس نے کہا" اے اللہ کے بندے مجھ سے مذاق نہ کر" میں نے کہا" میں مذاق نہیں کرتا جب اس کو یقین آ گیا تب وہ سب کچھ لے کر چلا گیا۔ اے اللہ اگر میں نے اس کام کو تیری رضامندی کے لیے کیا ہو تو اس چٹان کو ہٹا دے تا کہ ہم باہر نکل سکیں"۔ چنانچہ وہ چٹان ہٹ گئی اور سب باہر نکل آئے۔ (بخاری شریف)

حکایت

ایک بزرگ کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا" حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا"؟ بزرگ نے جواب دیا" جو جو کچھ میں نے خالص راہ خدا میں کیا تھا اسے نیکیوں کے پلڑے میں پایا اور جو عمل اخلاص سے خالی تھا اسے یا تو گناہوں کے پلڑے میں پایا یا کہیں نہ دیکھا۔ چنانچہ انار کا ایک دانہ میں نے ایک مرتبہ راہ میں پڑا دیکھ کر اٹھا لیا تھا، اس کو نیکیوں کے پلڑے میں پڑا ہوا دیکھا اور ایک بلی جو میرے گھر میں مر گئی تھی وہ بھی اسی پلڑے میں دھری تھی اور ایک ریشمی دھاگہ جو میں نے اپنی ٹوپی میں ٹانک لیا تھا گناہوں کے پلڑے میں رکھا ہوا پایا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ میرا گدھا جس کی قیمت سو دینار تھی اور وہ بھی (بلی کیطرح) میرے گھر ہی مرا تھا مجھے نیکیوں کے پلڑے میں دکھائی نہ دیا۔ آخر میں نے فرشتوں سے پوچھ لیا کہ۔۔۔" کیا وجہ ہے کہ بلی تو نیکیوں کے پلڑے میں ہو اور گدھا کہیں بھی نہ ہو"؟ ارشاد ہوا ''جہاں تو نے بھیجا تھا وہیں پہنچ گیا۔ یاد رہے کہ تو نے اس کے مرنے پر کہا تھا ''لعنت اللہ'' اگر تو اس کی جگہ فی سبیل اللہ کہہ دیتا تو آج اسے بھی نیکیوں کے پلڑے میں دیکھتا" اسی طرح ایک مرتبہ میں نے خدا کی راہ میں صدقہ دیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ ضائع ہو گیا۔ کیونکہ نیکیوں کے پلڑے میں وہ بھی موجود نہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ریاکاری میں ضائع ہو گیا۔ تب مجھے یاد آیا کہ ہاں ٹھیک ہے کیونکہ جب میں صدقہ دے رہا تھا تو لوگ دیکھ رہے تھے اور ان کا وہ دیکھنا مجھے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ریاکاری سے ضائع ہو گیا"۔ یہ باتیں جب سفیان ثوریؒ نے سنیں تو فرمایا" یہ تو دولت گراں نمایاں ہے جو اس کے ہاتھ آئی یعنی اسے نقصان زیادہ نہ پہنچا لیکن اخلاص ہے بڑی نادر و کمیاب جنس" اور کسی بزرگ کا قول ہے" علم تخم ہے عمل کھیتی ہے اور اخلاص اس کا پانی ہے"۔ (کیمیائے سعادت)

7۔ حالت مجبوری میں خلوص نیت کا اجر

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں" ایک جنگ میں ہم نبی اکرم خاتم النبیین ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" بے شک مدینہ طیبہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم جہاں بھی سفر کرتے ہو کسی وادی سے گزرتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں انہیں بیماری نے روک رکھا ہے"۔ ایک روایت میں ہے" مگر وہ ثواب میں تمہارے شریک ہیں"۔ (مسلم شریف)

بخاری نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں ہم نبی اکرام خاتم النبیین ﷺ کے ہمراہ غزوہ تبوک سے واپس لوٹے تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" ہمارے پیچھے مدینہ طیبہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ ہم جس گھاٹی اور وادی کو عبور کرتے وہ ہمارے ساتھ ہوتے انہیں مجبوری نے روک رکھا ہے"۔ (بخاری شریف)

ایک غزوہ میں کچھ صحابہ بیماری کے باعث شریک نہ ہو سکے لیکن ان کی نیت تھی کہ اگر وہ تندرست ہوتے تو وہ ضرور شامل ہوتے تو ان کے بارے میں رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" انہیں جہاد میں شامل ہونے کی نیت کا ثواب مل جائے گا"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" دنیا چار قسم کے لوگوں کے لیے ہے ایک وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم دیا ہو اور وہ اس میں اللہ سے ڈرتا ہو اور صلہ رحمی کرتا ہو اور جانتا ہو کہ اس مال و علم میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے (ان دونوں کے حق ادا کرتا رہے) تو یہ افضل المنازل بڑے مرتبے کے لوگوں میں سے ہے۔ دوسرا وہ ہے کہ جس کو اللہ نے علم تو دیا ہے لیکن مال سے محروم ہو مگر اس کی نیت سچی ہو کہتا ہوا گر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی اس طرح اللہ کے راستے میں خرچ کرتا جس طرح فلاں شخص خرچ کرتا ہے تو یہ اپنی خالص نیت کی وجہ سے اور پہلا شخص خرچ کرنے والا دونوں ثواب میں برابر ہیں۔ تیسرا وہ شخص ہے جس کو اللہ نے مال دیا ہو اور علم نہیں دیا تو وہ اپنا مال بے قاعدگی کے ساتھ بے سمجھے بوجھے خرچ کرتا ہو نہ اس میں خدا سے ڈرتا ہو اور نہ حق والوں کے حق ادا کر کے صلہ رحمی کرتا ہو اور نہ اس میں اللہ ہی کے حق کو جانتا ہو بلکہ نڈر ہو کر شراب و کباب، کھیل تماشا اور ناچ گانوں میں اڑاتا ہو تو یہ سب سے بُرے مرتبے والا ہے۔ چوتھا وہ شخص ہے جس کو خدا نے نہ تو مال دیا ہو نہ ہی علم وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں فلاں شخص (قسم سوم) کی طرح خرچ کرتا تو وہ اپنی بری نیت کی وجہ سے خود اور اس سے پہلا شخص دونوں گناہ میں برابر ہیں"۔ (ترمذی)

8۔ اخلاص کا تعلق دل سے ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نہ تو تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ ہی تمہاری صورتوں کی طرف بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے"۔ (مسلم شریف)

حکایت

حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک مرتبہ وعظ کے دوران فرمایا"لوگو میں نے اخلاص کی تعلیم ایک حجام سے حاصل کی ہے اس زمانے میں جبکہ میں مکہ معظّمہ میں مقیم تھا میں نے ایک حجام کو دیکھا کہ وہ ایک امیر آدمی کی حجامت بنا رہا تھا میں نے اس سے کہا" خدا کے لیے میری بھی حجامت بنا دے"۔اللہ کا واسطہ سن کر حجام کے حال میں ایک تغیر پیدا ہوا اور اس نے اسی وقت امیر کی حجامت چھوڑ کر میرے بال کاٹنے شروع کر دیئے۔امیر بیچارہ بیٹھا یہ ماجرا دیکھتا رہا میرے بال کاٹنے کے بعد حجام نے ایک کاغذ کی پڑیا میرے ہاتھ میں تھما دی اور امیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔میں نے پڑیا دیکھی تو اس میں ریزگاری تھی۔میں نے دریافت کیا" بندہ خدا یہ کیا ہے"؟ حجام نے کہا" یہ پڑیا رکھ لو اپنی ضرورت میں خرچ کر لینا"۔مسافرت میں میرے مالی حالات ٹھیک نہ تھے اور میں بے حد ضرورت مند تھا میں نے پڑیا تو رکھ لی لیکن دل میں نیت کر لی کہ اللہ تعالیٰ جوں ہی کوئی سبیل لگائے گا میں اس کو اس احسان کا بدلہ ضرور دوں گا - کیونکہ قرآن پاک سورہ رحمن، آیت نمبر 60 میں ارشاد ہے''احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے''۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند دنوں بعد بصرہ سے میرا ایک دوست آیا اور اس نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی مجھ کو پیش کی۔اشرفی کی تھیلی ہاتھ میں آتے ہی مجھے اپنا وعدہ یاد آ گیا اور وہ تھیلی لے کر اس حجام کی تلاش میں نکلا تھوڑی بہت تلاش کے بعد وہ حجام مل گیا میں نے وہ تھیلی اسے پیش کر دی۔تھیلی دیکھ کر حجام سخت برہم ہوا۔اس نے کہا" اے شخص میں نے تیری خدمت صرف اس نام کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے کی تھی۔جس کا تو نے واسطہ دیا تھا۔تو نے میرے سامنے اللہ رب العزت کا نام لیا میں نے امیر کی ناراضگی کی پرواہ نہ کی اور اس کی حجامت چھوڑ کر تیری خدمت میں لگ گیا اب تو مجھے اس خدمت کا معاوضہ دینے آیا ہے کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں کہ خدا کے واسطے کام کرنے والا کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔میں معاوضہ لے کر اپنی نیکی اور خدمت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔اشرفیوں کی یہ تھیلی اٹھا اور اپنی راہ لے"۔حضرت جنید بغدادیؒ کا بیان ہے"میں اس حجام کا اخلاص دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک معمولی حجام عبادت کی اس روح سے آشنا ہے جس سے بڑے بڑے بھی بے خبر ہیں"۔

9۔قتل میں نیت کا انجام

حضرت ابوبکر ثقفیؓ سے روایت ہے رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" جب دو مسلمان تلواریں لیے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں تو قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں "-(راوی فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا " یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ قاتل تو واقعی جہنم کا مستحق ہے۔مقتول کا کیا قصور ہے "؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" وہ بھی مقابل کو قتل کرنا چاہتا تھا"-(مسلم شریف)

اس حدیث میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اگر ضد بازی میں دو مسلمان آپس میں لڑ پڑیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کی نیت سے تلواریں نکال لیں تو اس طرح قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں جہنم میں جائیں گے کیونکہ دونوں کے ارادے میں قتل کا فعل داخل ہو گیا۔اس طرح دونوں جہنمی ہو گئے۔

حکایت

بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا لوگوں نے اس سے کہا" فلاں جگہ پر ایک درخت ہے اور لوگ اس کی پرستش کیا کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسے خدا تصور کر لیا ہے"۔عابد کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا۔فوراً تبرا اٹھایا اور اٹھ بیٹھا اور کہا" میں تو اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا" (جس کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے جا رہے ہیں) راستے میں ابلیس ایک بوڑھے کے بھیس میں اس سے ملا اور پوچھا" اے مرد عابد کہاں کے ارادے ہیں"؟ عابد نے کہا" اس درخت کو اکھاڑنے کے لیے جاتا ہوں"۔ابلیس نے کہا(یہ خوب کہی ارے بھائی)" تو عابد آدمی ہے جا اور حق تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہ۔تجھے وہی کام جچتا ہے اور اسی میں تیری بہتری بھی ہے"۔عابد نے کہا" خیر اس وقت تو میری عبادت یہی ہے کہ اس درخت کا نام و نشان مٹاؤں"۔ابلیس نے کہا" (اچھا یہ بات ہے) تو پھر میں دیکھتا ہوں کہ تو کیسے جاتا ہے"؟ یہ کہہ کر عابد سے گتھم گتھا ہو گیا۔ عابد نے اسے زمین پر دے مارا اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ابلیس نے کہا" اگر تو مجھے چھوڑ دے تو ایک پتے کی بات تجھے بتاؤں"۔عابد نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا" کہو کیا کہتے ہو"؟ ابلیس نے کہا" سنو اے مرد عابد! اگر اس درخت کو کٹوانا ایسا ہی ضروری ہوتا تو کیا پیغمبر وقت موجود نہیں؟ اور کیا حق تعالیٰ انہیں یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ اس درخت کو اکھاڑ دیا جائے؟ یہ حکم ہوتا تو وہ ضرور اکھاڑ بھی چکے ہوتے۔تجھے اس بات کا حکم ہی کب دیا گیا ہے۔(جو اس قدر بے قرار ہوا جاتا ہے) پس اس ارادے سے باز آ"۔عابد نے کہا" ہرگز نہیں میں ضرور یہ کام کروں گا"۔ابلیس نے کہا" اچھا تو جانے میں بھی نہیں دوں گا"-اور پھر لڑائی میں الجھ گئے۔عابد نے پھر اسے چاروں شانے چت گرا دیا (اور اوپر ہو بیٹھا) ابلیس نے کہا" اگر اب کی بار چھوڑ دے تو ایک اور بات تجھے سمجھاؤں۔اگر پسند نہ آئے تو جو تمہارے دل میں آئے کرتے رہنا"۔عابد نے چھوڑ دیا تو ابلیس نے کہا" اے عابد اگر تو ایک درویش آدمی ہے۔لوگ تیری خدمت کرتے رہتے ہیں، تیرے پاس اگر کچھ مال پڑا ہو تو دوسرے عابدوں کے حوالے کر

دے کہ ان کے کام آئے (اور تجھے مفت کا ثواب حاصل ہو) اس درخت کے کاٹنے میں کیا دھرا ہے؟ ان لوگوں کو تو درخت ہی کی پرستش کرنا ہے۔ تو کاٹ دے گا تو ان کا کچھ نہ بگڑے گا وہ اور درخت لگالیں گے۔ پس چھوڑ اس خیال کو اور میں تجھے قول دیتا ہوں کہ ہر روز تیرے سرہانے دو دینار رکھ جایا کروں گا"۔ عابد نے یہ سن کر دل میں سوچا کہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے "میں ایک دینار راہ خدا میں صدقہ کر دیا کروں گا اور دوسرا اپنے کام میں لاتا رہوں گا"۔ یہ بات اس درخت کے کاٹنے سے واقعی بہتر اور معقول ہے۔ اور پھر واقعی مجھے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر مامور بھی تو نہیں کیا گیا۔ میں پیغمبر تھوڑا ہوں کہ اس درخت کا اکھاڑنا میرے فرائض میں شامل ہو۔ سوچ بچار کے بعد عابد واپس گھر کی طرف چل دیا۔ اگلے روز صبح ہی صبح دو دینار سرہانے سے مل گئے دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا اب تو بہت ہی خوش ہوا کہ اچھا ہوا اس درخت کے کاٹنے سے باز رہا۔ لیکن (یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ) چوتھے دن اسے کچھ نہ ملا۔ اس پر وہ سخت طیش میں آیا، پھر کلہاڑا لے کر درخت کاٹنے چلا۔ ابلیس پھر راستے میں آ گیا اور پوچھا" آج پھر کدھر جاتے ہو"؟ عابد نے کہا" درخت کاٹنے جاتا ہوں" (اور کہاں جاؤنگا) ابلیس نے کہا" تو جھوٹا ہے اور خدا کی قسم اس درخت کو اکھاڑنا تیری طاقت سے باہر ہے"، پھر دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ لیکن اس مرتبہ شیطان نے فوراً ہی عابد کو پچھاڑ دیا اور اسے اس طرح مغلوب کر لیا کہ عابد بیچارہ اس کے ہاتھ میں ایک چڑیا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ تب ابلیس نے کہا" کہو اب واپس جاتے ہو یا ابھی بکری کی طرح تمہارا سر کاٹ کر پھینک دوں"؟ عابد نے کہا" مجھے چھوڑ دے میں واپس چلا جاتا ہوں۔ لیکن مجھے اتنا بتا دے کہ اس سے پہلے دو مرتبہ میں کیوں اتنی جلدی تجھے مغلوب کر لیتا تھا اور اس مرتبہ اتنی آسانی سے تو غالب آ گیا"؟ ابلیس نے کہا" بات یہ ہے کہ پہلے دونوں مرتبہ تیرا غصہ حق تعالیٰ کے لیے ہوتا تھا اس لیے حق تعالیٰ مجھے تیرے ہاتھوں مغلوب کر دیتا تھا کیونکہ ایسے کسی بھی شخص پر مجھے قابو حاصل نہیں ہوتا جو خالص اللہ کی راہ میں کوئی کام کر رہا ہو لیکن جو شخص اپنی خواہش کی متابعت میں کوئی کام کرے وہ مجھ سے کیا مقابلہ کرے گا؟ چنانچہ اس مرتبہ تیرا غصہ تیری اپنی ذات کے لیے تھا اور دینار کی خاطر تو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا، لہٰذا حق تعالیٰ نے تجھے میرا مسخر کر دیا"۔ (کیمیائے سعادت)

10۔ نیت کا ثواب

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے نقل کرتے ہیں" بے شک اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دیں پھر انہیں بیان کیا پس جو آدمی نیکی کا ارادہ کرے لیکن اس پر عمل پیرا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں ایک پوری نیکی (کا ثواب) لکھتا ہے۔ اور اگر ارادے کے ساتھ عمل بھی کرے تو دس سے سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اگر برائی کا ارادہ کرے لیکن عملی جامہ نہ پہنائے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اس کے لیے ایک کامل نیکی (کا ثواب) لکھتا ہے اور اگر ارادہ کے بعد عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ صرف ایک برائی تحریر فرماتا ہے"۔ (بخاری شریف)

حکایت

بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جو ہمیشہ چوری کیا کرتا تھا، آخر اس نے توبہ کی اور چوری سے برطرف ہوا۔ پھر سوچا یقین ہے کہ توبہ کی برکت سے یہ گناہ تو تیرا معاف ہوا اب بطور کفارہ کے کچھ کرنا چاہیے کہ زیادہ ثواب حاصل ہو تب اس نے یہ بات اختیار کی کہ تمام رات عبادت کرتا اور دن کو روزہ رکھتا چند روز کے بعد اس زمانہ کے پیغمبر کو وحی ہوئی "اس شخص سے کہہ دو کہ تیری عبادت میری درگاہ میں قبول نہیں ہے کیوں عبث تکلیف اٹھاتا ہے"۔ جب اس کو یہ حکم سنایا تب عبادت اور ریاضت زیادہ شروع کی۔ چنانچہ ہفتہ میں ایک مرتبہ کھاتا اور آٹھ پہر یاد الٰہی میں مصروف رہتا بعد چند روز کے پھر اس وقت کے پیغمبر کو حکم ہوا" اب اس میرے بندے کو کہہ دو کہ میں تجھ سے راضی اور خوش ہوا اور تیری عبادت میری درگاہ میں قبول ہوئی"۔ تب اس نبی نے اس کو یہ پیغام الٰہی پہنچایا اور پوچھا" اے عزیز اب تو نے کونسا عمل خیر کیا جس کے سبب سے تو مستحق رحمت الٰہی کا ہوا"۔ اس نے کہا" میں نے کمال عجز و زاری سے جناب الٰہی میں عرض کی خداوند تیرا ایک بندہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے "انا ربکم الاعلیٰ" کہتا ہے اور اس کو قطع نظر اور تکالیف کے کبھی درد تک نہیں ہوتا اور میں تیری درگاہ میں التجا و زاری اور عاجزی کرتا ہوں تیری بندہ نوازی اور غفاری سے کیا عجب ہے کہ مجھ کو محروم اور مردود نہ کرے یہ دعا میری قبول ہوگئی"۔ (کیمیائے سعادت)

11۔ اللہ کی رضا

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، فرماتے ہیں "حجۃ الوداع کے موقع پر رسول پاک خاتم النبیین ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے مجھے سخت درد تھا۔ میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ! میری بیماری (شدت اختیار کر چکی ہے) جیسا کہ آپ خاتم النبیین ﷺ ملاحظہ فرما رہے ہیں صاحب مال ہوں اور ایک لڑکی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں کیا میں دو تہائی مال صدقہ کر دوں"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "نہیں"، میں نے عرض کیا" یارسول اللہ

خاتم النبیین ﷺ نصف (کی اجازت ہے)"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''نہیں'' میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ایک تہائی"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" ایک تہائی ٹھیک ہے اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تمہارا اپنے ورثاء کو مال دار چھوڑنا ان کو نادار چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔ بلاشبہ تم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر خرچ کرو اس کا ثواب پاؤ گے۔ یہاں تک کہ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالو تو اس کا بھی اجر ہے فرماتے ہیں"- میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کیا میں اپنے دوستوں سے پیچھے رہ جاؤنگا"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اگر تم پیچھے رہو تو اس صورت میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے جو عمل کرو گے اس سے تمہارا درجہ بلند ہوگا۔ امید ہے کہ تم پیچھے رہو گے اور لوگ تمہاری زندگی سے فائدہ اٹھائیں گے اور کچھ لوگ تکلیف سے دو چار ہوں گے "-(پھر دعا مانگی)" یا اللہ میرے صحابہ کرام کی ہجرت کو پورا فرما اور شکست سے دو چار نہ کر البتہ سعد بن خولہ کی حالت قابل رحم ہے''۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا حضرت سعد بن خولہ کے لیے اظہار شفقت اس وجہ سے تھا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے۔ (بخاری شریف)

ایک اور روایت میں ہے " سرکار دو عالم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" ایک شخص اپنے دوست کی ملاقات کے لیے دوسرے گاؤں کو روانہ ہوا۔ راستے میں اسے ایک فرشتہ ملا۔ فرشتے نے پوچھا" کہاں جانے کا ارادہ ہے"؟ وہ شخص بولا'' فلاں بھائی کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں'' فرشتے نے پوچھا'' کیا تجھے اس سے کوئی حاجت ہے"؟ اس نے کہا" نہیں"۔ فرشتہ بولا'' آیا تیری اس سے کوئی قرابت (رشتہ داری) ہے"- اس نے کہا" نہیں"۔ فرشتے نے دریافت کیا'' پھر تیرے اس کے پاس جانے کی کیا وجہ ہے''؟ اس نے کہا'' مجھے اس کے ساتھ محض اللہ کی خاطر محبت ہے (کہ وہ اللہ کا نیک بندہ ہے) اور میں اللہ (کی رضا کے لیے) جا رہا ہوں''-فرشتے نے اسے بشارت دی'' مجھے اللہ نے تیرے پاس بھیجا ہے تا کہ میں تجھے خوشخبری سناؤں کہ اللہ نے تجھے اپنا دوست بنالیا اور تجھے جنت عطا کر دی''-(مسلم شریف)

حکایت

حضرت جنید بغدادی ؒ کا شمار اولیاء اللہ کے سرداروں میں ہوتا ہے۔ آپ علم شریعت وطریقت اور معرفت وحقیقت کے آداب واصول سے واقف تھے۔ ہزاروں گمراہوں نے آپ کے ذریعہ راہ ہدایت پائی اور اپنی زندگی کو احکام الٰہی کے مطابق بنایا۔ آپ کا دن دین کی تعلیم اور راتیں اللہ کی عبادت میں بسر ہوتیں۔ ایک رات تہجد کی نماز کے بعد اللہ سے دعا کی" یا الٰہی! مجھے بتادے کہ جنت میں میرا ساتھی اور مصاحب کون ہوگا"؟ جواب ملا" فلاں چرواہا"۔ حضرت جنید حیران رہ گئے۔ صبح ہونے کے بعد اس چرواہے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جب اس سے ملاقات ہوگئی تو دو تین دن اس کے ساتھ رہے اس کا حال دیکھنے کے بعد ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے اس چرواہے سے دریافت کیا" بھائی میں نے تو دیکھا ہے کہ سوائے پنج وقتہ نماز پڑھنے کے تم ایسا کوئی کام نہیں کرتے جو اس قدر قبولیت کا باعث ہو۔ شاید یہ بلند درجہ تمہیں تمہارے کسی باطنی معاملے کی وجہ سے ملا ہے"؟ چرواہا مسکرایا اور کہا'' خواجہ جنیدؒ میں ایک جاہل آدمی ہوں، میں نہیں جانتا کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں؟ اور باطن کیا ہوتا ہے؟، میں تو ایک سیدھا سادہ مسلمان ہوں البتہ میرے اندر دو خصلتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر اللہ ان سب پہاڑوں کو سونے کا کر دے اور انہیں میرے قبضے میں دے دے اور پھر یہ سب میرے ہاتھ سے جاتے رہیں تو مجھ کو ان کے چلے جانے کا کوئی رنج وغم نہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ کوئی میرے ساتھ وفا کرے یا جفا میں اس سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ بندہ بیچارہ تو صرف ایک ظاہری سبب ہے۔ خواجہ جنیدؒ میں نے اپنا کام اپنے محبوب رب کے حوالہ کر دیا ہے۔ خواہ وہ مجھے اب زندہ رکھے یا مار ڈالے۔ اس کی مرضی پر راضی ہوں''۔ چرواہے کا جواب سن کر جنیدؒ کی سمجھ میں آ گیا کہ اسے کیوں جنت میں جنیدؒ کا مصاحب بنایا گیا ہے۔ کیونکہ جس کی نیت میں خلوص ہو اس کے سامنے صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

ابو یعقوبؒ موسیٰ کا قول ہے "جب تک لوگ اپنے اخلاص میں اخلاص دیکھتے رہیں گے یعنی (اخلاص کا دعویٰ رہے گا) انکا وہ اخلاص سدا خلوص کا محتاج رہے گا"۔ حدیث مسلم ہے کہ'' بہت سارے نیک پاک لوگ جنت میں لے جائے جا رہے ہوں گے پروردگار کہے گا" ان تمام مہماتماؤں کو جہنم میں پھینک دو"۔ ملائکہ بڑی انکساری سے عرض کریں گے'' پروردگار ان کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھ لکھ کر ہم نے کاغذ ختم کر دیئے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا'' میرے اور بندے کا ایک معاملہ ہے جو صرف میں ہی جانتا ہوں اور وہ اخلاص ہے''۔ یاد رکھیں کہ:

اخلاص ہی وہ واحد قدر ہے کہ جو انسان کو یقین کے ساتھ ساتھ اللہ کی معرفت کی طرف آگے بڑھا سکتی ہے۔

****

قبلہ

قبلہ کے معنی ہیں وہ چیز جس کی طرف رُخ کیا جائے، چونکہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کرتے ہیں اس لئے بیت اللہ کو قبلہ کہتے ہیں۔ ہر قوم کا ایک قبلہ ہے جس کا قرآن پاک میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے، (سورۃ البقرہ، آیت نمبر 148)

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا

ترجمہ: "اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے (یعنی قبلہ) جس کی طرف منہ کرتا ہے"۔ (کسی خاص سمت رخ کرنا بے مقصد نہیں۔)

جہاں اور مقاصد ہیں وہاں ایک یہ بھی مقصد ہے کہ ملت میں وحدت اور یکجہتی قائم رہے۔ جب فرعون نے بنی اسرائیل کی زندگی کو اجیرن کر دیا اور مسجدوں میں نماز پڑھنا ممکن نہ رہا تو ان کو قبلہ رخ نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سمت کے تعین میں نفسیاتی، قومی، مذہبی، جغرافیائی اور تاریخی اہمیت ہے۔ سمت متعین کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ادھر ہی ہے دوسری طرف نہیں ہے، ایسا خیال کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا:

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر 115)

"وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" ؕ

ترجمہ: "مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے جدھر منہ کرو اللہ ہی ہے"۔

پھر انسان کو یہ خیال آتا ہے کہ خاص طرف رخ کرنے اور منہ پھیرنے میں شاید کوئی نیکی ہے۔ قرآن حکیم نے اس خیال کی بھی تردید کر دی ہے اور فرمایا:

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر 177)

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ"

ترجمہ: "نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف"۔

نیکی کا تعلق تو ایمان اور قلب کی خاص کیفیت سے ہے گویا نیکی کا تعلق تو باطن سے ہے۔ اس لئے اگر کوئی صحرا میں ہے اور سمت کا تعین نہیں کر سکتا تو جس طرف اس کا دل مطمئن ہو منہ کر کے نماز پڑھ لے۔ ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے۔

ظہور اسلام سے قبل یہود و نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ اعلان نبوت سے پہلے اہل مکہ کی عبادت گاہ بیت اللہ ہی تھا، اس کو بتوں اور مقدس ہستیوں کی تصاویر سے آلودہ کر دیا گیا تھا۔ اعلان نبوت کے بعد جب نماز کا حکم آیا تو مسلمانوں نے بیت اللہ شریف یعنی خانہ کعبہ میں نماز ادا کرنا شروع کر دی، نماز میں رخ بیت المقدس کی طرف رکھنے کا حکم ہوا کیونکہ اول قبلہ وہی تھا۔ تو نماز اس طرح ادا کی کہ منہ بیت المقدس کی طرف تھا اور بیت اللہ کی طرف بھی پیٹھ نہ ہوئی۔

622ھ میں جب آپ خاتم النبیین ﷺ نے مدینہ منورہ میں ہجرت کی تو تمام لوگ نماز پڑھتے وقت اپنا رخ بیت المقدس کی طرف ہی رکھتے تھے۔ تقریباً 17 ماہ تک سب لوگ بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی توجہ مبارک بیت اللہ کی طرف ہی تھی 2ھ 632 عیسوی میں ایک روز نماز میں یہ آرزو دل میں تھی اور بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے کاش بیت اللہ قبلہ ہو جائے، دلوں کا حال جاننے والے نے آن کی آن میں اپنے محبوب خاتم النبیین ﷺ کی یہ تمنا پوری کر دی۔ اچانک نماز ہی کی حالت میں وحی نازل ہوئی (وحی الہامی) (سورہ بقرہ، آیت نمبر 144)

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ

ترجمہ: بے "شک ہم تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم ضرور تم کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ جس میں تمہاری خوشی ہے ابھی مسجد حرام کی طرف اپنا منہ پھیر لو۔ (اے مسلمانوں) تم جہاں کہیں بھی ہو اسی کی طرف منہ پھیرا کرو"۔

اے زہے شان عبدیت تیری
تو جدھر ہے ادھر خدائی ہے

تحویل قبلہ نے ایک طرف حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی محبوبیت کو عالم آشکار کیا، دوسری طرف دلوں کے راز کھول دیئے، مومن اور منافق الگ الگ ہو گئے۔

انسان کی فطرت ہے کہ صدیوں کی عادت آن واحد میں نہیں چھوٹتی تحویل قبلہ نے یہود و نصاریٰ اور ان منافقین کو مضطرب کر دیا جو حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی محبت میں نہیں بلکہ عادتاً بیت المقدس کی طرف سجدہ کر رہے تھے، ان کے دل کے چور ظاہر ہو گئے اور اعتراضات کرنے لگے۔

قرآن پاک میں سورہ بقرہ آیت نمبر 142 اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: ''بے وقوف عنقریب کہیں گے کہ کس بات نے مسلمانوں کو اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر یہ پہلے تھے؟ آپ خاتم النبیین ﷺ کہہ دیں کہ مشرق اور مغرب تو اللہ ہی کا ہے''۔

پھر دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بات قبلہ کی نہیں بات تو ضد بحث کی ہے۔ (سورہ بقرہ آیت نمبر 146)

ترجمہ: "حالانکہ یہ آپ خاتم النبیین ﷺ کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو"۔

جبکہ تورات میں آپ خاتم النبیین ﷺ کی ایک نشانی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ دو قبلوں کی طرف یکے بعد دیگرے رخ کر کے نماز پڑھیں گے، گویا قبلہ کا بدلنا آپ خاتم النبیین ﷺ کی نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ مگر ضد کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آیت 145 میں فرمایا:

ترجمہ: "آپ (خاتم النبیین ﷺ) ان (اہل کتاب) کے پاس تمام نشانیاں لے کر جائیں تب بھی وہ آپ (خاتم النبیین ﷺ) کے قبلہ کو نہ مانیں گے"۔

تحویل قبلہ کی پہلی حکمت تو معلوم ہو گئی مگر دوسری حکمت نہایت اہم اور قابل توجہ ہے، انسان کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ جو چیز اس کی قومیت اور مذہب بلکہ اس کے وجود کی بنیاد، علامت اور نشانی ہو اس کو جُدا کر کے اس کی بنیادوں کو ہلا دیا جائے، سارے عالم میں فساد اسی قومیت کی وجہ سے ہے۔ اپنے قومی آثار میں سے ادنیٰ چیز بھی کوئی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ مگر جب کسی سے محبت کی جاتی ہے تو ساری بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ اگر کسی محبت کرنے والے نے محبوب کی خاطر اپنی کسی محبوب چیز کو نہ چھوڑا اس نے محبت کرنا نہ جانی اور محبوب کی قدر نہ پہچانی۔ اللہ تعالیٰ قبلہ کو تحویل کر کے عاشقوں کے دل کی اس کیفیت کو دکھانا چاہتا ہے، کہ کسی نے محبوب کی خاطر برسوں کے قبلہ کو چھوڑ کر اس کو قبلہ بنایا جس کو محبوب نے قبلہ بنایا۔ کسی کی نظر محبوب پر رہی؟ کسی کی نظر قبلہ پر رہی؟

جس کی نظر محبوب پر رہی بامُراد ہوا، اور اس بات کو اللہ تعالیٰ قرآن پاک سورہ بقرہ، آیت نمبر 143 میں صاف طور پر بیان کرتا ہے۔

ترجمہ: "اور جس قبلہ پر آپ خاتم النبیین ﷺ تھے وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا۔ کہ یہ دیکھیں کہ کون آپ خاتم النبیین ﷺ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟''۔

یعنی کون آپ خاتم النبیین ﷺ کی اطاعت میں بیت اللہ کی طرف سجدہ کرتا ہے اور کون آپ خاتم النبیین ﷺ کو چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف سجدہ کرتا ہے۔ اصل مقصد تو حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی اطاعت اور پیروی ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی یہ بات پسند نہیں کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ پر نظر نہ رکھی جائے۔

ہم اس فکر میں ہیں کہ جب سرکار دو عالم خاتم النبیین ﷺ سامنے ہوں تو رُخ آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرف کریں یا قبلہ کی طرف؟ دعا کے لئے ہاتھ آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرف منہ کر کے اٹھائیں یا قبلہ کی طرف؟ مگر جب مذکورہ آیت اور مشکوٰۃ شریف کی یہ حدیث سامنے آتی ہے تو سارے وسوسے اور اندیشے کافور ہو جاتے ہیں۔

حدیث: ابن خذیمہؓ بن ثابتؓ سے روایت ہے "ان کے چچا حضرت ابو خذیمہؓ نے خواب دیکھا کہ وہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی مبارک پیشانی پر سجدہ کر رہے ہیں، انہوں نے آپ خاتم النبیین ﷺ سے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا، آپ خاتم النبیین ﷺ لیٹ گئے اور فرمایا "اپنا خواب سچا کر لو"۔ چنانچہ انہوں نے آپ خاتم النبیین ﷺ کی مبارک پیشانی پر سجدہ کیا"۔ (مشکوۃ المصابیح)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نقش پا سجدہ بن سکتا ہے تو حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی مبارک پیشانی سجدہ گاہ کیوں نہیں بن سکتی؟ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ قبلہ محبت ہیں اللہ نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو قبلہ بنایا۔ (سورہ توبہ، آیت نمبر 24)

ترجمہ: "آپ خاتم النبیین ﷺ کہہ دیجئے کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز رشتے دار اور تمہاری جمع پونجی، تمہاری تجارت، جس کے نقصان کا تم کو کھٹکا لگا رہتا ہے، تمہارے من بھاتے مکانات اگر (یہ سب) تم کو اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین ﷺ سے اور ان کی راہ میں جہاد

کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو اللہ کے حکم کا انتظار کرو بے شک اللہ سرکشوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

آیت مذکورہ میں آپ خاتم النبیین ﷺ سے منہ پھیرنے والوں کو سرکش کہا گیا ہے، اور حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے کمال محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا تھا۔ (سورۃ ص آیت 73-72)

ترجمہ: ''پس جب میں اسے ٹھیک کرلوں اور اس میں اپنی خاص رُوح پھونک دوں تو تم سب اس کے لئے سجدے میں گر پڑنا، تو جتنے فرشتے تھے سب کے سب سجدے میں گر پڑے''۔

حضرت آدمؑ امین نور مصطفی خاتم النبیین ﷺ تھے۔ اس لئے حافظ ابن قیمؒ نے حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے دربار میں آنے والے زائرین کو مواجہ شریف میں عاجزی وانکساری اور سر جھکانے کی ہدایت کی ہے۔ کیونکہ جس نے آپ خاتم النبیین ﷺ کے آگے سر جھکا دیا حقیقت میں اس نے اللہ کے آگے سر جھکا دیا، فرشتوں نے سر جھکا دیا اور ابلیس یہ راز محبت نہ سمجھ سکا اور مردود ہو گیا۔ اس نے اللہ کے محبوب خاتم النبیین ﷺ کی تعظیم وتکریم سے انکار کیا تھا اس نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا سورہ احزاب آیت نمبر 56

''اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا''

ترجمہ: ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی (خاتم النبیین ﷺ) پر، اے ایمان والوں تم بھی نبی (خاتم النبیین ﷺ) پر درود بھیجو اور سلام بھی ادب کے ساتھ''۔

ہم نماز میں بیت اللہ کی طرف رخ اس لئے کرتے ہیں کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اس سمت رخ مبارک کیا تھا۔ اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی اس کے محبوب خاتم النبیین ﷺ سے رخ مبارک پھیر کر کھڑا ہو جائے۔ اس نے تو محبت کی ایک شرط رکھ دی ہے کہ تمہارا رخ میرے محبوب خاتم النبیین ﷺ کی طرف ہو۔

سورہ آل عمران آیت نمبر 31

ترجمہ: "آپ (خاتم النبیین ﷺ) کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، یعنی (میرے رخ پر چلو)"۔

کیونکہ اللہ کی طرف تو رخ کرنا میں نے سکھایا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جو عکس جمال مصطفی خاتم النبیین ﷺ تھے ان کو ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا اور عکس نبوت کے آگے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا بھی جرم ٹھہرے؟ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی شان تو یہ ہے کہ نماز میں بھی حضور پاک خاتم النبیین ﷺ یاد فرمائیں تو حاضر ہونا ہے۔ ایک صحابیؓ نماز پڑھ رہے تھے آپ خاتم النبیین ﷺ نے آواز دی نہ آئے، پھر آواز دی نہ آئے تھوڑی دیر کے بعد حاضر ہوئے پوچھا پہلے کیوں نہ آئے تو صحابیؓ نے عرض کیا نماز پڑھ رہا تھا۔ فوراً ہی سورہ انفال، آیت نمبر 24 میں حکم ہوتا ہے:

ترجمہ: "اے ایمان والوں! اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین ﷺ کا حکم بجالاؤ، جس وقت تم کو وہ کام کے لئے بلائیں اور اسی میں تمہاری زندگی ہے"۔

سبحان اللہ حکم ہو رہا ہے کہ اگر سرکار بلائیں تو نماز قبلہ سے منہ پھیر کر قبلہ محبت کے حضور میں حاضر ہو جاؤ۔ کام حضور خاتم النبیین ﷺ کا ہو رہا ہے اور ارشاد کی تکمیل ہو رہی ہے، اور نماز پڑھنے والا نماز میں ہے، جب کام کر چکو تو نماز وہیں سے شروع کرو جہاں سے چھوڑی تھی، اور کوئی سجدہ سہو نہیں یہ ہے مقام محبوبیت۔

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے ایام علالت میں ایک روز صحابہؓ مسجد نبوی خاتم النبیین ﷺ میں حضرت ابو بکرؓ کی امامت میں نماز پڑھ رہے تھے اچانک حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے کاشانہء اقدس کا پردہ اٹھایا اور صحابہ اکرامؓ کو دیکھ کر مسکرائے۔ خوشی کے مارے صحابہ اکرامؓ کی نظریں نماز میں ہی حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ کے چہرہ مبارک کی طرف لگ گئیں، قریب تھا کہ نماز توڑ دیتے، مگر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ نماز مکمل کرو، اور پردہ ڈال دیا۔ (بخاری)

راوی حضرت انسؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے ساتھ نماز میں مصروف تھے کاشانہء اقدس قبلہ سے بائیں جانب تھا۔ صحابہ کرامؓ نے نماز ہی میں رخ بائیں جانب پھیر کر سرکار دو عالم خاتم النبیین ﷺ کی زیارت کی مگر کسی کی نماز نہ ٹوٹی۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا اشارہ پا کر نماز مکمل کی گئی۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ جب آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرف رخ پھیرنے سے نماز میں خلل واقع نہ ہوا تو آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرف رخ کر کے دعا کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ جبکہ دعا کرتے وقت تو قبلہ رخ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ خاتم النبیین ﷺ خطبہ جمعہ میں قبلہ کی مخالف سمت بارش کے لئے دعا نہ فرماتے (بخاری شریف)

اصل میں یہ باتیں نورانی عقل سے سمجھنے کی ہیں اور یہ نورانی عقل صرف محبت رسول خاتم النبیین ﷺ سے پیدا ہوتی ہے۔

سرور کائنات خاتم النبیین ﷺ نے اپنے پیاروں سے فرمایا:

ترجمہ:"جس نے میری قبر کی زیارت نہ کی اس نے مجھ پر ظلم کیا"۔(دار قطنی، ابن عدی)

اس لئے مسجد نبوی خاتم النبیین ﷺ میں آپ خاتم النبیین ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری کے وقت محبت کا تقاضہ یہی ہے، کھڑا ہو یا بیٹھا ہو، دست بستہ ہو یا دعا مانگ رہا ہو رخ آپ خاتم النبیین ﷺ ہی کی طرف ہو۔ مذاہب اربعہ کے اکثر علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ روضہ رسول خاتم النبیین ﷺ پر حاضری کے وقت دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے وقت زائرین اپنا رخ روضہ مبارک کی طرف رکھیں۔

امام تقی الدین سبکیؒ نے ان مالکی، حنفی، شافعی، اور حنبلی علماء کے مفصل اقوال نقل کئے ہیں، جو دعا کے وقت قبر شریف کی طرف رخ کرنے کے قائل ہیں۔ سلف صالحین کا صدیوں سے یہی عمل رہا ہے۔ اور جنت البقیع شریف اور شہداء احد کے مزارات پر دعا کرنے والے اسی طرح ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ جالی شریف سے چار ہاتھ دور رہے، جالی شریف کو ہاتھ نہ لگائے، یہ سیاہ کار ہاتھ اس قابل کہاں اِن سیہ کاروں کو اپنے پاس بلا کر دعا کرنے کا موقع دے دیا یہ ہی کیا کم ہے؟، مگر ہاں ان کے پیاروں کی بات اور ہے۔

حضرت بلال ؓ کو ملک شام میں زیارت ہوئی فرما رہے ہیں''اے بلالؓ یہ کیسی جفا ہے کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہماری زیارت کے لئے آؤ''۔خواب کا دیکھنا تھا کہ زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔شاید زیارت رسول خاتم النبیین ﷺ کے لئے یہ پہلا سفر تھا جو کسی صحابیؓ نے کیا۔اور جب مدینہ منورہ پہنچے تو مسجد میں داخل ہو کر آپ خاتم النبیین ﷺ کو تلاش کرنا شروع کیا اور آخر آپ خاتم النبیین ﷺ کی قبر اطہر پر حاضر ہو کر رونا شروع کیا۔آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور اپنا چہرہ مبارک قبر انور سے مل رہے تھے۔حدیث پاک میں حضرت بلالؓ کی حاضری کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ دل دہلانے کے لئے کافی ہے۔

جو ناظرین روضہ انور کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا چاہتے ہیں، ان کے بارے میں مانعین کے نزدیک کئی وجوہات ہیں۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ وہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کو زندہ سمجھتے ہیں،

دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ آپ خاتم النبیین ﷺ کے وسیلے سے دعا مانگنا چاہتے ہیں،

تیسرا احتمال یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ کو (معاذ اللہ) معبود اور مسجود سمجھتے ہیں۔

1) پہلے احتمال کا جواب کہ آپ خاتم النبیین ﷺ زندہ نبی ہیں،

قرآن پاک میں سورہ بقرہ آیت نمبر 154 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:"جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں، مگر تم سمجھ نہیں رکھتے"۔

یہ شہید جن کی زندگی کی قرآن گواہی دے رہا ہے یہ جب مر جائیں تو ان کی بیویوں سے نکاح جائز ہے، مگر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے پردہ کر جانے کے بعد ان کی ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہے کیوں؟

جیسا کہ سورہ الاحزاب، آیت نمبر 53 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:"اور تم کو سزاوار نہیں کہ تم اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ کو تکلیف دو، اور نہ یہ لائق ہے کہ ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی بھی نکاح کرو، بے شک یہ اللہ کے نزدیک بڑی ہی سخت بات ہے''۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی زندگی شہیدوں سے بھی ارفع اور اعلیٰ ہے۔

قرآن پاک میں سورۃ الروم، آیت نمبر 50 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:"پس آپ (خاتم النبیین ﷺ) رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھیں کہ زمین کی موت کے بعد کسطرح اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دیتا ہے''۔

سورہ الانبیاء، آیت نمبر 107 میں فرمایا:

ترجمہ:"اور ہم نے آپ (خاتم النبیین ﷺ) کو دو عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔

یقیناً آپ خاتم النبیین ﷺ نے سارے عرب کو زندہ کیا، پھر زندہ ہونے والوں نے ساری دنیا کو زندہ کیا، زندگی رحمت کی نشانی ہے، پھر خود رحمت کی کیا شان ہوگی؟

2) دوسرا احتمال یہ ہے کہ زائرین حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کو اپنے گناہوں کی مغفرت کا وسیلہ بناتے ہیں، بے شک ایسا ہے اس لئے کہ ہمیں یہ ادب اللہ نے سکھایا ہے کسی اور نے نہیں سکھایا۔ جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں سے سجدہ کروایا، اور جنت میں ایک ہدایت کے ساتھ بھیجا، مگر لغزش ہونی تھی، ہوگئی۔ پھر زمین پر اتار دیا گیا، ندامت و شرمساری کی وجہ سے صدیوں آپؑ روتے رہے بالآخر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 37)

ترجمہ: "پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں بے شک وہ ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان"۔

اللہ تعالیٰ مختار کل ہے جس ذات کی چاہتا ہے توبہ قبول کرسکتا تھا۔ وہ کلمات تلقین کرنے اور اپنے حضور توبہ مانگنے کا سلیقہ سکھانے کا محتاج نہ تھا۔ مگر انہیں کلمات سکھائے گئے اور حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی محبوبیت کو روز اول ہی سے آشکار کردیا گیا۔ وہ کلمات کیا تھے؟

یَارَبِّ اَسۡئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لَمَا غَفَرۡتَ لِیۡ

ترجمہ: "اے میرے پروردگار تیری بارگاہ میں محمد (خاتم النبیین ﷺ) کا وسیلہ دیتا ہوں کہ مجھے معاف فرمادے"۔ (مستدرک)

تمام انبیاء اور ان کی امتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی اسی سنت پر عمل کیا اور قرآن پاک میں اس کا ذکر موجود ہے۔

سورہ بقرہ، آیت نمبر 89

ترجمہ: ''"اور وہ ان کے آنے سے پہلے اس کے وسیلے سے کافروں پر فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، پھر جب وہ جانا پہچانا آیا تو اس کو نہ مانا تو انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت''۔

خود سورہ فاتحہ میں صالحین کی راہ گزر کے وسیلے سے دعا مانگنے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا کہ اس کے بغیر صراط مستقیم کا ملنا ممکن نہیں۔

سورہ فاتحہ، آیت نمبر 5

ترجمہ "اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا ان لوگوں کے راستے جن پر تو نے اپنا انعام کیا"۔

اللہ کو معلوم ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ جب اس سے مانگ رہے ہیں تو وہ ضرور صراط مستقیم پر چلا سکتا ہے۔ صراط مستقیم کی تشریح اور تفصیل کی ضرورت نہ تھی، تشریح اور تفصیل اس لئے بیان کی گئی تاکہ کوئی مانگنے والا اللہ کے محبوبوں سے بے نیاز ہوکر ان سے پیٹھ پھیر کر نہ مانگے۔ انکا راستہ صراط مستقیم ہے اس راستے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا راستہ بتایا ہے۔

سورہ الانعام، آیت نمبر 153

ترجمہ: "اور یہ صراط مستقیم ہے (میری راہ) سو اس پر چلو۔ اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے جدا کردیں گے یہ تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو"۔

صحابہ اکرامؓ نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا۔ تمام مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ،

سورہ نسآء، آیت نمبر 64

ترجمہ: "اور وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں، اور رسول (خاتم النبیین ﷺ) یعنی آپ (خاتم النبیین ﷺ) بھی ان کی شفاعت فرمائیں تو بے شک وہ اللہ کو معاف کرنے والا پائیں گے"۔

بروایت عتبیؓ ایک اعرابی قبر انور خاتم النبیین ﷺ پر حاضر ہوا، مضطرب، بے قرار، اشکبار، عرض کیا یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ بے شک اللہ نے آپ خاتم النبیین ﷺ پر سچی کتاب نازل فرمائی، جس میں فرمایا کہ "اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں اور پھر تیرے پاس آجائیں اور تو ان کے لئے مجھ سے معافی چاہے تو وہ مجھ کو معاف کرنے والا غفور و رحیم پائیں گے"۔ میں اب اپنے رب سے معافی کا طلب گار ہوں اور اس کے لئے آپ خاتم النبیین ﷺ کی شفاعت کا امیدوار ہوں۔ پھر وہ زار و قطار رونے لگا، پھر راوی نے خواب میں حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی زیارت کی حضور پاک خاتم النبیین ﷺ راوی عتبیؓ سے فرمارہے ہیں،

ترجمہ "اے عتبیؓ اس اعرابی سے مل کر اسے خوشخبری سناؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کردیا ہے"۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں (سورہ بقرہ آیت نمبر 186)

ترجمہ: "اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں ان کے قریب ہوں، دعا مانگنے والا جب مجھ سے دعا کرے تو میں دعا قبول کرتا ہوں"۔ بندگی کا حق جب ہی ادا ہوگا کہ رخ آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرف ہو اور دعا اللہ تعالیٰ سے کی جائے۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: "میں مومنین کا ان کی جانوں سے زیادہ مالک ہوں، اگر کوئی مر گیا اور اس نے قرضہ چھوڑا تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے، اگر اس نے مال ترکہ میں چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کا ہے"۔ (بخاری)

اللہ اکبر وہ ایسے کریم ہیں کہ کچھ دینا ہو تو وہ دیں گے اور کچھ لینا ہو تو وہ ورثاء لیں گے، وہ تو بے نیاز ہیں اور بے نیاز کے محبوب ہیں۔ قرآن پاک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقربین الہیٰ کو وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 57

ترجمہ: "وہ (جن وفرشتے) جن کو یہ (اہل مکہ پکارتے ہیں) وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کونسا بندہ بہت نزدیک ہے۔ اور امید رکھتے ہیں اس کی مہربانی اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقربین کے وسیلے سے دعا مانگنی عین منشاء الٰہی ہے۔ پھر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے زیادہ مقرب الٰہی کون ہو سکتا ہے؟۔

3) تیسرا احتمال یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے والا (معاذ اللہ) آپ خاتم النبیین ﷺ کو معبود اور مسجود سمجھتا ہے۔ محض دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے سے یہ بدگمانی کرنا بہت بڑی بدگمانی ہے۔ بیت اللہ شریف اور محراب مسجد کی طرف بھی سجدہ کیا جا سکتا ہے، مگر کوئی ان کو معبود و مسجود نہیں سمجھتا۔ تو پھر محض دعا کرنے والے کی طرف سے یہ بدگمانی نہیں ہونی چاہئے۔ چاند کو دیکھنے کے بعد چاند کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت ہے۔ کھانا کھانے کے بعد کھانے کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت ہے۔ جنازے سے رہ جانے والے جنازے کی طرف منہ کر کے دعا کر سکتے ہیں۔ دل کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے، وہی عالم الغیب ہے، ہم کو کیا معلوم کسی کے دل میں کیا ہے؟ ہم دلوں کے احوال پر حکم نہیں لگا سکتے، ہمیں بدگمانی سے روکا گیا ہے۔ (سورہ الحجرات آیت نمبر 12)

ترجمہ: "اے ایمان والوں! تہمتیں لگانے سے بچتے رہو کہ بعض تہمتیں گناہ ہیں۔ اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو (یعنی تجسس نہ کرو) اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہو، بھلا یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو گھن آئے گی، اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے"۔

اب جو حضرات مواجہ شریف میں حاضر ہیں اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا رہے ہیں ان کے لئے یہ بدگمانی کرنا کہ وہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کو معبود اور مسجود سمجھ کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے مانگ رہے ہیں یہ بہت بڑی بدگمانی ہے۔ پھر نظر داروں کا پھر پھر کر ٹوہ لگانا اور زائرین کو بُرا بھلا کہنا، اس کی بھی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ آنے والوں کے احوال سے باخبر ہوتے ہیں، بخاری شریف میں ہے،

ترجمہ: ''کیا تم دیکھتے ہو میرا قبلہ کہاں ہے؟ خدا کی قسم تمہارا خشوع خضوع اور رکوع مجھ سے پوشیدہ نہیں بے شک میں اپنی پیٹھ پیچھے بھی دیکھتا ہوں''۔

خشوع کا تعلق باطن سے ہے اور رکوع کا تعلق ظاہر سے، حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ ہمارے ظاہری اور باطنی تمام افعال سے باخبر ہیں۔ ایسے باخبر سرکار کے حضور حاضر ہو کر پیٹھ پھیرنا کتنی بڑی جرأت ہے، اگر وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے ہمیں ان کی طرف ہی رخ کرنا چاہئے، ادب کا تقاضہ بھی یہی ہے اور محبت کی پکار بھی یہی ہے۔

1۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

ایوب سختیانیؒ تشریف لائے اور میں مدینہ منورہ میں تھا، میں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ تو انہوں نے حاضری کے وقت اپنی پیٹھ قبلہ کی سمت کی اور اپنا چہرہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کی طرف کیا اور دل کھول کر روئے۔

2۔ امام احمد بن حنبلؒ نے مواجہ شریف میں حاضری کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ چہرہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی طرف ہو اور دعائیں مانگیں۔

3۔ خلیفہ ابوجعفر منصور نے حضرت امام مالکؒ سے معلوم کیا ''اے اباعبداللہ جب میں روضہ رسول خاتم النبیین ﷺ پر جاؤں اور دعا کروں تو اپنا چہرہ قبلہ کی طرف کروں، یا رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کے سامنے، آپؒ نے جواب دیا "تو اپنا منہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے نہ پھیر، ارے وہ اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے

دن تیرااور تیرے باپ کا وسیلہ ہیں"۔

4۔امام نوویؒ نے بھی امام مالکؒ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''جب کوئی شخص نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی زیارت کے لئے آئے تو وہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی طرف منہ مبارک کر کے درود وسلام پیش کرے''۔

5۔امام ابن تیمؒ نے بھی حاضری کے وقت درود وسلام پیش کرتے وقت رخ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی طرف رکھنے کے لئے کہا ہے۔

ہاں حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا دربار بڑے ہی ادب کا دربار ہے۔ایمان کا دارومدار آپ خاتم النبیین ﷺ کی تعظیم وتکریم پر ہے۔صحابہ اکرامؓ نے کبھی آپ خاتم النبیین ﷺ کی موجودگی میں آپ خاتم النبیین ﷺ سے پیٹھ نہ پھیری۔ان کا رخ تو نماز میں بھی آپ خاتم النبیین ﷺ ہی کی طرف رہتا تھا۔کسی بادشاہ کے دربار میں بادشاہ سے پیٹھ پھیر کر کوئی نماز بھی پڑھنے لگے تو یقیناً اس کو آداب شاہی کے خلاف سمجھا جائے گا۔نماز پڑھنے والوں کو دربار سے ہٹا دیا جائے گا، ہرگز یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ کوئی بادشاہ کے سامنے پیٹھ پھیر کر نماز پڑھتا رہے۔جب دنیا کے بادشاہوں کے دربار کا یہ عالم ہے تو اس دربار کا کیا عالم ہوگا جہاں خود احکم الحاکمین متوجہ ہونے کا حکم دے رہے ہیں۔

صدیوں سے ہمارے اسلاف واکابر کا یہی عمل رہا ہے، ہمارے ائمہ اربعہ بھی اسی بات پر متفق ہیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سچوں کے ساتھ رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ (سورہ توبہ، آیت نمبر 119)

ترجمہ":اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو (کہ سچے گمراہ نہیں ہو سکتے)"۔

اسی میں سعادت ہے قرآن وحدیث کی پیروی کریں اور صالحین کے راستے پر چلتے رہیں۔ہاں جو شب و روز اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ کے دربار میں حاضر ہیں ان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔کہ کیسا کرم فرمایا کہ اس نبی آخر الزماں خاتم النبیین ﷺ کا قرب نصیب فرمایا۔کچھ لوگ ایسے ہیں بلکہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ہزار تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد شاید زندگی میں صرف ایک بار حاضر ہوتے ہیں۔ان کے دلوں میں محبت کی آگ سلگ رہی ہے۔ان کو صحابی رسول خاتم النبیین ﷺ حضرت بلالؓ کی سنت پر عمل کرنے دیجئے، ان کو عاشق دل نگار اعرابی کی سنت پر عمل کرنے دیجئے۔

تہذیب جدید نے ہمارے چہرے منکرات وفواحش کی طرف پھیر دیئے ہیں ہم مواجہ شریف سے رخ پھیر رہے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ جس نے اس طرف رخ کیا وہ اللہ کا ہوا۔اور جس نے اس دربار سے منہ پھیرا وہ کہیں کا نہ رہا، اور غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حبیب خاتم النبیین ﷺ کے دامن سے وابستہ رکھے، آپ خاتم النبیین ﷺ کی محبت میں ہمارا خاتمہ فرمائے، اور آپ خاتم النبیین ﷺ ہی کے زیر داماں ہمارا حشر فرمائے۔(آمین ثمہ آمین)

****

مُصَنِّفہ کی تمام کُتُب

خاتم النبیین مِحبُوبِ ربُّ العٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	خاتم النبیین مُحسِنِ اِنسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	مقصدِ حیات	عبدیّت کا سفر ابدیّت کے حصُول تک
تعلُّق مع اللہ	مُختصراً قُرآنِ پاک کے علُوم	راہِ نجات	فلاح
اہلِ بیت اور خاندانِ بنُو اُمَیّہ	ثواب و عتاب	تُو ہی مُجھے مِل جائے (جِلد۔۱)	تُو ہی مُجھے مِل جائے (جِلد۔۲)
مُختصرِتذکرۂ انبیاءکرامؑ، صحابہ کرامؓ و آئمہ کرامؒ	اولیاءکرامؒ	کتاب الصلوٰۃ وَ اوقاتُ الصّلوٰۃ	عشرہ مُبشرہؓ اور آئمہ اربعہؒ
حیاتِ طیّبہ	آگہی	اِسلام عالمگیر دِین	عقائد واِیمان
دِینِ اِسلام (بچّوں کےلئے)	کتابِ آگاہی (تصحیح العقائد)	تصَوُّف یا رُوحانیت (جِلد۔۱)	تصَوُّف یا رُوحانیت (جِلد۔۲)

www.jamaat-aysha.com